نجات



محمود احمد مودی

پیش لفظ

زندگی کے سفر میں گاہے بہ گاہے ایسے قارئین سے ملاقات ہوتی رہتی ہے جو مجھ عاجز، حقیر اور بے ہنر کے لئے ایسی عقیدت اور میری تحریروں کے لئے ایسے والہانہ پن اور وارفتگی کا اظہار کرتے ہیں کہ گردن ممنونیت اور تشکر کے بوجھ سے جھک جاتی ہے۔ یقین سا نہیں آتا کہ اس نفسا نفسی اور مارا ماری کے دور میں بھی لوگوں کو اتنی مہلت، اتنا وقت میسر ہے کہ وہ ایسی گہری اور تجزیاتی نظر سے مجھ بے کمال کی تحریریں پڑھ سکیں۔ کسر نفسی اور انکسار پسندی ہمیشہ سے میری ہمسفر رہی ہے اور مزاج میں رچ بس سی گئی ہے۔ اس عادت کی وجہ سے بہت سے لوگ مجھے Under Estimate بھی کرتے ہیں مگر میرے لئے اس سے کبھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس زمانے میں ویسے بھی اپنے سامنے کسی کو خاطر میں لانے اور اپنی ناک سے آگے دیکھنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ یہ کچھ ایسی زیادہ حیرت کی بات بھی نہیں۔ بڑبولا پن انسان کی کمزوری ہے، اپنے منہ سے اپنی تعریفوں کی توپیں چلانا بڑا خوشگوار عمل محسوس ہوتا ہے، اپنے بارے میں بڑے بڑے دعوے کرنے کی خواہش اکثر انسانوں کے دلوں کو گدگداتی ہے لیکن میں نے جب بھی کار گاہ حیات کے پیچیدہ کھیل تماشے پر نظر ڈالی مجھے کبھی اس کا کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔

اپنا تو یہی عالم رہا کہ ہر معاملے میں ایک تشنگی کا احساس رہا۔ ہم کہاں کے صاحب کمال ہیں، ہم کہاں کے اہل خیال ہیں۔ کرنے والوں نے تو دنیا میں نہ جانے کیا کیا کر دیا۔ دنیا تو بہت بڑی تھی، میدان حیات تو افق تا افق پھیلا ہوا تھا، ہم نے کون سے ایسے پہاڑ ڈھا دیئے، کون سے ماہ و انجم زمیں پر لے آئے، کون سی انہونی کو ہونی کر دیا--- بس ... اوپر والے کا یہی بڑا کرم ہے کہ اس نے زندگی کو بالکل ہی ایک رائیگاں سفر نہیں بنایا۔ یہ جو چار لفظ لکھنے آ گئے تھے انہی کو ہمارا ہنر بنا دیا اور دنیا میں نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے لوگوں کو ہم عیب داروں کا قدر دان اور چاہنے والا بنا دیا--- ورنہ زندگی کے سفر میں تو اور بہت کچھ کرنے کو تھا، جو ہم سے نہ ہو سکا ---- آگے بہت منزلیں تھیں جہاں تک ہم کمزوروں، ناتوانوں کے قدم نہ پہنچ سکے۔ بہت سی رفعتیں تھیں جن کے لئے ہم خود میں

قوت پرواز پیدا نہ کر سکے۔

بہرحال شکر کرنے کے لئے دامن دل میں بہت کچھ ہے۔ لفظوں کا یہ سرمایہ جو ان گنت رت جگوں اور پر اذیت لمحوں میں جمع ہوا' یہی دل کو سنبھالے رکھنے کے لئے بہت ہے اور آپ پڑھنے والوں نے جو محبتیں دیں' جو پذیرائی کی وہ سرمایہ تو ویسے ہی انمول ہے۔ مجھ پر حالات کی ایک نوازش یہ بھی رہی کہ میں نے زندگی کو بڑی حد تک قریب سے دیکھا۔ بہت سے پہلوؤں' بہت سے شعبوں کے بارے میں میرا مشاہدہ بہت قریبی ہے۔ محض سنی سنائی اور پڑھی پڑھائی باتوں تک محدود نہیں۔ فلم انڈسٹری کی بھی اگر بہت زیادہ گہرائی میں جانے کا موقع نہیں مل سکا تب بھی ایک حد تک دیکھنے' سمجھنے اور پرکھنے کا اتفاق ضرور ہوا۔ فلموں کے لئے کام کرنے اور لکھنے لکھانے کا اس زمانے میں مجھے خیال ہی نہ آیا لیکن دوستیاں' آشنائیاں اور میل ملاپ خاصا رہا۔ اسی دور میں اس کہانی کا تانا بانا تیار ہوا۔ جو آپ کے ہاتھوں میں اب پہنچ رہی ہے۔ اسے آپ کافی حد تک سچی داستان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کچھ افسانہ طرازی بہرحال ضروری تھی۔

فلمی دنیا کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ دور کے لوگوں کے لئے یہ ایک ونڈر لینڈ ہے۔ اس دنیا میں بسنے والے لوگوں کی ہر ادا' ہر جفا' ہر خطا لوگوں کے لئے ایک خبر ہوتی ہے مگر بہت کچھ ہے جو خبروں میں نہیں آپاتا۔ بہت سے کردار ہیں جن کی صحیح تصویر کشی نہیں ہوتی۔ ان گنت اجڑے خوابوں کی کہانیاں ہیں جو کوئی کسی کو نہیں سناتا۔ یہ انہی گونگے کرداروں کی کہانی ہے۔ جبر و مصلحت کوشی کے مقبروں میں ملا خون زندہ لاشوں کی داستان ہے۔ ان مزاروں کا قصہ ہے جن پر نہ چراغ جلتے ہیں' نہ گل پاشی ہوتی ہے' نہ پروانے منڈلاتے ہیں' نہ پتنگے اپنے پر جلاتے ہیں اور نہ ہی بلبلیں نغمہ سرا ہوتی ہیں۔ بطور خاص یہ داستان ان صاحب احساس قارئین کے لئے ہے جن کے دلوں میں گداز اور کسی کے دکھ کو محسوس کرنے کی نزاکت ہے۔

آپ کا اپنا

محمود احمد مودی

آج پھر اس کے سینے میں بلا کا درد اٹھا تھا مگر اب اس گھر میں کوئی نہیں تھا جسے وہ پکارتی۔ وہ گھر' جہاں اسے چند گھڑیاں آرام سے گزارنے کے لئے کونے کھدروں میں چھپنا پڑتا تھا۔ اپنے خاص بیڈ روم کے دروازے مقفل کرنا پڑتے تھے۔ صدر دروازے پر چوکیدار بٹھانا پڑتے تھے۔ آج اس گھر میں اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔

وہ وقت کے اس تغیر پر .... حالات کے اس تضاد پر' مسکرانا چاہتی تھی مگر درد اسے مسکرانے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ تکلیف بہرحال تکلیف ہی ہوتی ہے ..... اور یہ تو وہ تکلیف تھی جس کے تصور سے ہی لوگ ڈر جاتے تھے۔ ادھر سینے میں ذرا سی ٹیس اٹھتی تھی' ادھر لوگ دواؤں کے انبار لگا لیتے تھے۔ حسب توفیق اچھے سے اچھے ڈاکٹر کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ "درد دل" کی شاعرانہ تعلی دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔ لفظوں کی حد تک درد دل بڑی اچھی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اس میں ایک غمناک سی رومانیت تھی ..... مگر اصل درد دل بڑی ظالم چیز تھی۔

وہ چاہنے کے باوجود مسکرا نہ سکی۔ شدت کرب سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ نرم و گداز بیضوی بیڈ پر دوہری ہو گئی۔ تکلیف اتنی بڑھی کہ دانتوں تلے دبے ہوئے ہونٹ سے خون رسنے لگا اور اس کا جسم پسینے میں نہا گیا۔

فون اس کے قریب ہی تھا۔ ایک بار اس نے ہاتھ بڑھایا کہ کسی طرح ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کر لے اور اسے بلا لے مگر پھر اس کا لرزتا اور رینگتا ہوا ہاتھ راستے ہی میں رک

گیا اور پھر اسی طرح دھیرے دھیرے اس نے اسے واپس کھینچ لیا۔

اسے معلوم تھا کہ ایک بار پھر اسے وہی نصیحتیں سننا پڑیں گی جو ڈاکٹر پچھلے ایک سال سے کر رہا تھا اور جن سے اسے اب خوف آنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں کے پاس ہر نوعیت کے مریضوں کے لئے کچھ رٹے رٹائے سے الفاظ ہوتے تھے جنہیں وہ ہر ملاقات میں ٹیپ ریکارڈر کی طرح دوہرانا شروع کر دیتے تھے تاہم' اتنا ضرور تھا کہ کسی خاص مریض کے لئے وہ اپنے لہجے میں تھوڑا سا خلوص پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس کے پرانے ڈاکٹر کی نصیحت یہ ہوتی تھی "ندیا بی بی تفکرات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیجئے اور اپنے اندر جینے کی امنگ پیدا کیجئے۔ اپنی ذات کے ساتھ جو رویہ آپ نے اختیار کر رکھا ہے اس سے مسائل حل تو نہیں ہوتے ..... اور بھی بڑھ جاتے ہیں"۔

لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ ڈاکٹر ہر بار کم و بیش یہی بات کہتا تھا۔ ندیا نے کتابوں رسالوں میں بھی ایسی باتیں بہت پڑھی تھیں۔ موٹی موٹی کتابوں اور بڑے دل نشین مضامین میں ملکی اور غیر ملکی ماہرین نفسیات زندگی گزارنے اور سنوارنے کے بڑے گر بتاتے تھے۔

وہ سوچتی تھی' معلوم نہیں' ان کتابوں اور مضامین سے کسی کی زندگی سنوری ہو یا نہیں ..... لیکن شاید ان کتابوں کی رائلٹی سے کم از کم غیر ملکی مصنفوں کی زندگی خاصی سنور گئی ہو گی اور ان کی تحریروں سے استفادہ کرنے والے ملکی پبلشروں اور مضمون نگاروں کا بھی کچھ نہ کچھ بھلا ہو گیا ہو گا۔

"کتنا آسان ہے یہ سب کچھ کہنا اور لکھنا" ..... وہ تلخی سے سوچتی۔ "اگر تفکرات کو ذہن سے جھٹکنا ممکن ہوتا تو دنیا کا ہر انسان بے فکر نہ ہو جاتا؟ کپڑے پر ایک بار دھول لگ جائے تو وہ بھی آسانی سے نہیں جھٹکی جاتی ڈاکٹر صاحب ..... ! آپ کہتے ہیں تفکرات کو ذہن سے جھٹک دوں؟ گویا میرے آس پاس کوئی سوئچ لگا ہوا ہے جسے دبا

دوں تو کوئی مشین چل پڑے گی اور میرے دل و دماغ کو یوں صاف کر دے گی جیسے ویکیوم کلینر قالین کو صاف کرتا ہے"۔

اس کا دل چاہتا کہ وہ ڈاکٹر سے کہے۔ "کیا آپ کی لمبی چوڑی تعلیم کے دوران کسی نے آپ کو نہیں بتایا کہ دکھ اور تفکرات تو انسان کے خون میں زہر کی طرح سرایت کر جاتے ہیں۔ ایک بار یہ خون میں شامل ہو جائیں تو پھر انہیں جدا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے"۔

یہ سب باتیں وہ صرف سوچ کر رہ جاتی تھی۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ کچھ عرصے سے اس نے اپنے ہونٹ سی لئے تھے' اب اس کا کسی سے کچھ بھی کہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اچھی یا بری ..... کوئی بات منہ سے نکلتی ہی نہیں تھی!

ایک طویل عرصے تک اس نے کیمرے کے سامنے ڈائی لاگ بولے تھے اور دنیا کہتی تھی کہ جب اس کے حسین ہونٹ ہلتے تھے تو لفظوں کو نئی زندگی مل جاتی تھی۔ وہ ہنستی تھی تو اس کے ساتھ کائنات کی ہر شے ہنس اٹھتی تھی اور جب وہ روتی تھی تو اس کے آنسوؤں کے ساتھ تماشائیوں کے آنسو بھی شامل ہو جاتے تھے۔ اس کی انفرادیت یہ تھی کہ رونے کا سین عکس بند کرانے کے لئے اسے کبھی گلیسرین کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کے آنسو حقیقی ہوتے تھے۔

پندرہ برس اس نے فلمی دنیا پر راج کیا تھا۔ پندرہ برس ایک طویل عرصہ تھا۔ مصنوعی چکا چوند کی اس دنیا میں پندرہ برس اس جیسی شان سے گزار جانا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ اگر وہ زمانہ ساز ہوتی ..... اس میں کچھ اور طرح کی ہوشیاری ہوتی تو یہ عرصہ کچھ اور طول کھینچ سکتا تھا۔

عروج کے زمانے میں وہ جدھر نکل جاتی تھی' لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار تو انار کلی میں ایک دکان میں اس کی موجودگی کی خبر پھیلنے کی وجہ سے سڑک پر اتنا ہجوم ہو گیا تھا کہ پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا تھا۔ اس واقعے کے بعد اگر اسے کبھی خود بازار جا کر کچھ خریدنا بہت ضروری محسوس

ہوتا ..... یا اس کا باہر نکلنے کو بہت دل مچلتا تو وہ برقع میں نکلتی' ورنہ اسے اکثر دوسروں ہی کی لائی ہوئی چیزوں پر انحصار کرنا پڑتا۔ اس کی اپنی پسند کے مطابق کم ہی کوئی چیز آتی۔

اس زمانے میں فلم ساز اور ہدایت کار جس طرح اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے' وہ ایک عجیب اور قابل دید نظارہ ہوتا تھا۔ عکس بندی کے لئے اس سے من پسند تاریخیں حاصل کرنے کی غرض سے' اس کے قرابت داروں میں سے سفارشیں ڈھونڈی جاتی تھیں۔ مگراب .....؟

کیا وقت اتنا بھی ہرجائی ہو سکتا تھا؟

کیا لوگ اتنے بھی بے مہر ہو سکتے تھے؟

کیا سب کچھ اس طرح بھی بدل سکتا تھا؟

اسے یقین نہیں آتا تھا مگر اس نے اپنے کئی دوسرے ہم عصروں کی طرح کبھی شکایتوں کے دفتر نہیں کھولے تھے۔ کبھی دل کے پھپھولے نہیں پھوڑے تھے۔ وہ کبھی بے مہری وقت کا قصہ زبان پر نہیں لائی تھی۔

اس نے گویا بھلا ہی دیا تھا کہ اس پر کبھی کسی قسم کا کوئی عروج بھی آیا تھا۔ وہ تو جیسے بولنا بھی بھول گئی تھی۔ مہینوں میں کوئی بھولا بھٹکا مہمان ..... کوئی عمر رسیدہ صحافی یا کوئی وضع دار شناسا اس کے ماضی کے مزاروں کی مٹی کریدنے اس کے گھر آ جاتا' تو وہ اس کے سامنے بیٹھی دیر تک خوفزدہ سی نظروں سے ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہتی۔ اس کے ہونٹوں سے بصد کوشش کوئی لفظ نکلتا بھی' تو یوں نکلتا جیسے دور افتادہ کھنڈروں سے کوئی سسکی ابھری ہو۔

مہمانوں یا صحافیوں میں سے کوئی اس کے نجی حالات سے واقف ہوتا تو ارادی یا غیر ارادی طور پر ہمدردی کے سیلاب میں بہنے لگتا "میڈم ! آپ یوں کریں ..... یوں مت کریں' ایسا کریں ..... ویسا مت کریں ....." یا۔ "آپ کو فلاں موقع پر ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا ..... آپ نے فلاں موقع پر بڑی غلطی کی....."

وہ اپنی جگہ سکڑ سمٹ کر بیٹھی رہتی اور خاموشی سے یہ سب کچھ سنتی رہتی۔ کبھی کبھی ان سب لوگوں پر اس کا ہنسنے کو جی چاہتا۔ شاید وہ لوگ اسے بے وقوف سمجھتے تھے۔ جو مشورے وہ اسے دیتے تھے' وہ ان سے بھی بہت آگے تک سوچ سکتی تھی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے زندگی کرنے کا ہنر بالکل ہی نہیں آتا تھا .... مگر وہ اب کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

زندگی نے تو اس پر اپنے سارے دروازے بند کر ہی لئے تھے مگر اس نے خود ہی اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں قتل کر کے مایوسی و شکستگی کی قبر میں دفن کر دیا تھا۔ شاید یہ بھی اس کی نظر میں زندگی سے انتقام لینے کا ایک طریقہ تھا..... اور شاید اسی لئے ساحر کا یہ شعر اس کے پسندیدہ اشعار میں شامل ہو گیا تھا۔

تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

اپنی نظر میں وہ اب گویا کوئی زندہ سلامت عورت نہیں' مصر کے اہراموں میں مدفون کوئی ممی تھی۔ اب شاید کوئی نیا اور طلسمی فارمولا ہی اسے نئی زندگی دے سکتا تھا۔ وہ فارمولا کسی کے بھی پاس نہیں تھا۔ ڈاکٹر اپنی برسوں کی آزمودہ کار دوائیں اور صدیوں کے استعمال شدہ بوسیدہ الفاظ لے کر آ جاتا تھا۔

پچھلے وزٹ پر البتہ اس نے ایک نئی بات ضرور کی تھی ..... اور وہ یہ کہ ..... "میڈم میرا آپ کی طرف بل خاصا زیادہ ..... میرا مطلب ہے کہ کافی عرصے سے ....."

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ندیا کے لیے یہ ادھوری بات' پوری بات سے زیادہ موثر تھی۔ شاید ڈاکٹر میں کچھ وضع داری باقی تھی' اس لئے وہ دو ٹوک لہجے میں بات نہیں کر پا رہا تھا ورنہ وضع داری تو اب طب جیسے پیشے سے بھی رخصت ہو چکی تھی ..... وہ ..... جنہیں جراحت دل اور مسیحائی کے دعوے تھے' اب اپنا حساب کتاب پہلے پورا کرتے تھے' نبض پر ہاتھ بعد میں رکھتے تھے۔

"کل رقم آپ کے کلینک پہنچ جائے گی"۔ ندیا نے مضمحل لہجے میں کہا تھا۔ وہ

برسوں سے اس قسم کے جملے کہنے کی عادی تھی مگر پہلے اس کی بات پوری ہوا کرتی تھی اور اب اکثر اس کے الفاظ اپنا اعتبار کھونے لگے تھے۔ یہ بہت بڑا فرق تھا!

دوسری صبح اس نے بینک فون کر کے اپنا بیلنس پوچھا تو مینجر نے معلومات کرنے کے بعد جھجکتے ہوئے بتایا۔ "نو سو ساٹھ روپے"۔

پھر ایک ..... لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "آپ نے پچھلے دنوں پندرہ ہزار کا جو چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا تھا' وہ ڈس آنر ہو کر واپس آ گیا ہے۔ جس پارٹی نے چیک دیا تھا' اس کے اکاؤنٹ میں رقم نہیں ہے"۔

ڈس آنر.....؟

یہ لفظ اسے بڑا عجیب لگا تھا۔ مینجر اگر اس کی جگہ اردو کا لفظ استعمال کرتا تو شاید جملہ یوں ہوتا۔ "آپ کا چیک بے آبرو ہو کر واپس آ گیا ہے"۔

ایک عجیب افسردگی آمیز سی حسرت سے اس نے سوچا تھا کہ کیا واقعی اب اسے ایسے چیک بھی دیے جانے لگے تھے؟ ایک زمانہ تھا کہ جب اس کے ماتھے پر ایک شکن بھی ابھرتی تھی تو فلم سازوں کے دل ڈولنے لگتے تھے کہ کہیں وہ کسی معمولی سی شکایت کی بناء پر ..... یا بغیر کسی وجہ کے ہی ..... ان کی کسی فلم کا معاہدہ تو منسوخ نہیں کر دے گی؟

وہ چیک اسے ایک پروڈیوسر نے برسوں پرانی ایک ادائیگی کے سلسلے میں کئی بار کے تقاضے کے بعد بھیجا تھا حالانکہ تقاضا کرنا ندیا کی عادت نہیں تھی۔ بہت سے حساب اس نے بھلا دیئے تھے۔ بہت سے اندراجات اپنی ڈائری سے کاٹ دیئے تھے۔

اس ایک ڈوبی ہوئی رقم کے ملنے کی اسے کچھ امید نظر آتی تھی اور بہت مجبوری کے عالم میں اس نے کئی بار اس کے لئے فون کئے تھے۔ پھر کسی کو بھیجا تھا۔ تب جا کر وہ چیک ملا تھا..... اور وہ بے آبرو ہو کر واپس آ گیا تھا۔

فلمی دنیا اونچ نیچ کی دنیا تھی۔ وہاں بہت تیزی سے بازیاں پلٹتی تھیں۔ بہت سے کنگال آتے تھے اور راتوں رات لکھ پتی ہو جاتے تھے۔ بہت سے لکھ پتی آتے تھے اور

راتوں رات قلاش ہو جاتے تھے۔ ندیا شاید یہی سمجھ لیتی کہ واقعی اس پروڈیوسر کے اکاؤنٹ میں پیسے نہیں ہوں گے لیکن اب وہ ایسی بھی بے خبر نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا وہ فلم ساز اب بھی دھوم دھام سے فلمیں بنا رہا تھا..... نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس پر روپیہ لٹا رہا تھا۔ وہ کیسے مان سکتی تھی کہ اس کے اکاؤنٹ میں رقم نہیں ہو گی۔ اسے معلوم تھا جنہیں ٹرخانا مقصود ہوتا تھا' ان کے لیے فلم سازوں نے ایک آدھ ایسا اکاؤنٹ الگ رکھا ہوتا تھا جس میں کبھی رقم نہیں ہوتی تھی ..... لیکن ندیا کا خیال تھا کہ وہ اس قسم کا پروڈیوسر نہیں تھا..... یا کم از کم اس کے لئے ایسا ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر.....؟

اس نے صرف ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بینک مینجر سے کچھ بھی نہ کہا۔ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ اس کے اکاؤنٹ میں نو سو ساٹھ روپے تھے جبکہ ڈاکٹر کا بل دس ہزار سے اوپر کا تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے دوسرے بلوں کے پلندے کو خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

سوئی گیس کا بل ..... آٹھ ہزار چھ سو روپے .... اور ساتھ ہی یہ وارننگ کہ اب قسطوں کی رعایت نہیں دی جائے گی اور عدم ادائیگی پر کنکشن کاٹ دیا جائے گا۔

بجلی کا بل ..... نو ہزار آٹھ سو روپے اور اس کے ساتھ بھی وہی وارننگ .....

پانی کا بل' پراپرٹی ٹیکس کا نوٹس' کئی دوسرے بل' انکم ٹیکس کا سولھواں نوٹس' ویلتھ ٹیکس کا نوٹس ..... اور مختلف عدالتوں کے تین سمن۔ اب اس کے سرہانے اس قسم کے کاغذات کے پلندے پائے جاتے تھے۔

یہ سب بل اور نوٹس گدھوں کی طرح اس کی لاش پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے گویا اس کے گرد بے پناہ شور ہو رہا ہے۔ اس کا جسم ایک بار پھر پسینے میں بھیگنے لگا۔ اس نے ایئرکنڈیشنر چلانے کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہا مگر اسے یاد آیا کہ وہ خاصے دنوں سے خراب پڑا تھا۔

لیکن، یہ سب بھی اس کے دکھ نہیں تھے۔ اس کا اصل دکھ تو یہ تھا کہ اس میں دکھوں کا مداوا کرنے کی لگن نہیں رہی تھی۔ زندگی کی امنگ مٹ گئی تھی۔ کبھی اس کے جسم و جان میں جو ایک شعلہ سا فروزاں رہتا تھا، وہ اب بجھ چکا تھا اور دل کے ویرانے میں چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ یخ بستگی ہی یخ بستگی تھی!

دل میں درد اٹھنے کی شکایت اسے ایک سال سے لاحق ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے ابتدا ہی میں اسے بیسیوں ٹیسٹ لکھ دیئے تھے اور کسی نہ کسی طرح ندیا نے وہ ٹیسٹ کروا بھی لئے تھے۔ ڈاکٹر ان ٹیسٹوں کی رپورٹیں اور ماہرین کی تحریری آراء دیکھنے کے بعد حیران رہ گیا تھا۔

ان رپورٹوں وغیرہ کے مطابق اس کے دل سمیت تمام اعضاء بالکل ٹھیک طرح کام کر رہے تھے۔ اس کے باوجود دل میں درد کیوں اٹھتا تھا؟ ڈاکٹر یہ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن جو بات ڈاکٹر کو معلوم نہیں تھی، وہ ندیا خود جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ درد کیسا تھا..... وہ بیماری کیا تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ میڈیکل کی کتابوں میں اس بیماری کا کوئی ذکر نہیں تھا کیونکہ اس بیماری کا طب کی دنیا سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔

یہ بیماری درحقیقت بچپن ہی سے اس کے دل میں دبی ہوئی تھی۔ اب شاید اس لئے ابھر کر سامنے آ گئی تھی کہ دل اب ندیا کا ساتھ دیتے دیتے تھک چکا تھا۔ وہ اندر ہی اندر بچپن سے اس بیماری سے لڑتی آئی تھی اور بچپن سے ہی اسے ہر موڑ پر شکست دیتی آئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔

اس بیماری کا سرا تلاش کرتے کرتے وہ ان گنت دھندلے دھندلے سایوں اور کچھ عجیب مدھم سی پرچھائیوں کے درمیان بھٹکنے لگتی.....



ننھی رابعہ کو اپنا گھر بہت خوبصورت لگتا تھا۔ لکڑی کے تختوں کی چھت..... مٹی کی دیواروں اور کچے فرش والا وہ مکان اس کے لئے کسی محل سے کم نہیں تھا

کیونکہ اس نے محل دیکھے ہی نہیں تھے اور اس کے خواب بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ اس کی عمر چار سال تھی۔ اس کا مکان اور گرد و پیش کا کچھ حصہ اس کی کل کائنات تھا۔

وہ بہت تھوڑے سے مکانوں پر مشتمل ایک گاؤں تھا۔ رابعہ کا مکان گاؤں کے ایک سرے پر تھا۔ وہ کھیلتی کودتی گھر سے نکلتی تھی تو ایک ریتیلے میدان میں پہنچ جاتی تھی۔ اس میدان کے اختتام پر درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

اپنے ہم عمر تین چار بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ یہاں تک بھی آ جاتی تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کھیلتے کودتے انہیں بالکل خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ سارا علاقہ انہیں اپنے گھر کے آنگن کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ شاید ان کے ننھے ذہن ابھی خوف کے مفہوم سے صحیح طور پر آشنا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ناسمجھی ان کے لئے راحت تھی۔

وہاں چاروں طرف سکون اور خاموشی رہتی تھی۔ اگر کبھی آوازیں ابھرتی بھی تھیں تو وہ محض پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں ہوتی تھی۔ ان جھاڑیوں میں کبھی کبھی تتلیاں بھی اڑتی دکھائی دیتی تھیں جنہیں رابعہ اور اس کے ننھے ساتھی پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ تتلی جس کے ہاتھ لگ جاتی تھی وہ اسے یوں چھپائے پھرتا تھا جیسے کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔

رابعہ کو صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ باپ کسے کہتے ہیں کیونکہ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں تھا۔ ایک کمرے اور بڑے سے کچے صحن پر مشتمل اس مکان میں صرف وہ ماں بیٹی رہتی تھیں۔ منہ اندھیرے اس کی ماں اٹھتی اور اپنے ساتھ ہی اسے بھی جگا لیتی۔ ماں غریبانہ سا ناشتہ تیار کرتی اور رابعہ حسب مقدور اس کا ہاتھ بٹاتی۔ اس سے کچھ اور نہ ہو پاتا تو ادھر ادھر سے چیزیں ہی اٹھا کر ماں کو پکڑاتی رہتی۔

صبح کا اجالا پھیلنے تک ماں بیٹی، گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع ایک بڑے سے

احاطے میں پہنچتیں جہاں کپڑے بننے کی کئی کھڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ رابعہ کی ماں یہاں ایک کھڈی پر کام کرتی تھی۔ دوپہر تک وہ یہاں کھڈی چلاتی جو بڑی مشقت کا کام تھا۔ اس دوران رابعہ طویل و عریض احاطے میں کھیلتی رہتی۔ وہاں دوسری بھی کئی عورتیں کام کرنے آتی تھیں۔ ان میں سے بعض کے ساتھ بچے ہوتے تھے۔ ان سے رابعہ کی سنگت رہتی تھی۔

سہ پہر کے بعد رابعہ کی ماں اسے ساتھ لیئے گھر واپس آتی۔ جیسا تیسا کھانا تیار کر کے خود کھاتی' رابعہ کو کھلاتی اور کچھ دیر کے لئے بے سدھ ہو کر لیٹ جاتی۔ پھر اٹھتی اور کھڈیوں کے لئے نلکیوں پر سوت لپیٹنا شروع کر دیتی۔ یہی وہ وقت ہوتا تھا جب رابعہ کھیلنے کے لئے باہر نکل جاتی۔ ماں اسے روکنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ شاید وہ سوچتی تھی کہ ان کے گھر میں دلچسپی کی چیز بھی کیا تھی جس میں وہ بچی کا دھیان لگانے کی کوشش کرتی۔

دن ڈھلنے تک رابعہ دوسرے بچوں کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا بھی باہر کھیلتی رہتی۔ میدان میں ایک طرف چھوٹا سا ایک برساتی جوہڑ بھی تھا جو زیادہ گندا نہیں تھا۔ اس میں پانی کی گہرائی بھی عموماً" تین چار بالشت سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

اس جوہڑ میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور مینڈک بھی پائے جاتے تھے۔ ذرا بڑے بچے یہ ننھی ننھی مچھلیاں اور ننھے ننھے مینڈک پکڑنے کی بھی کوشش کرتے تھے اور اس کے لئے عجیب عجیب طریقے اختیار کرتے تھے۔ کوئی گھر سے ماں کا ململ کا دوپٹا لے آتا تھا اور کوئی آٹا چھاننے والی چھلنی۔

تاہم' رابعہ جوہڑ کے کنارے پر کھڑے کھڑے ہی اس قسم کی سرگرمیوں کا نظارہ کرتی تھی۔ اس نے کبھی جوہڑ میں قدم رکھنے اور "شکار" میں دوسرے بچوں کا ہاتھ بٹانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اسے مچھلیوں اور مینڈکوں سے ڈر لگتا تھا۔ بے شک وہ بہت چھوٹے ہوتے تھے .... لیکن وہ خود بھی تو چھوٹی تھی!

اس روز بھی رابعہ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ساتھ ریتیلے میدان کے پار

درختوں اور جھاڑیوں والے حصے میں کھیل رہی تھی۔ اس کے ساتھی بچے آپس میں بہن بھائی تھے۔ لڑکا ذرا بڑی عمر کا تھا جبکہ لڑکی رابعہ کی ہم عمر تھی۔ دونوں لڑکیوں نے مل کر لڑکے کو املی کے درخت پر چڑھایا تھا تاکہ وہ ان کے لیے املی توڑ کر پھینکے۔ لڑکے نے املی توڑ کر پھینکی تو ساری کی ساری اس کی بہن نے اٹھالی۔

"نوری! آدھی املی مجھے دو نا....." رابعہ نے لجاجت سے کہا۔

"کیوں دوں؟ یہ تو میرے بھائی نے توڑی ہے۔" نوری نے نہ جانے کیوں یکایک ہی بے مروتی اختیار کر لی۔

رابعہ نے اس سے املی چھیننے کی کوشش کی جس پر نوری نے شور مچا دیا اور پھر رونے لگی۔ اس کا بھائی بلندی کی پروا کیے بغیر درخت سے کود پڑا اور اپنی بہن کی حمایت میں اس نے رابعہ کو ایک طمانچا رسید کر دیا۔ اب رابعہ رونے لگی۔ اسے روتے دیکھ کر دونوں بہن بھائی بھاگ کھڑے ہوئے۔

رابعہ کچھ دیر تک وہیں تنہا کھڑی روتی رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہاں اسے چپ کرانے والا کوئی نہیں تھا' تو دھیرے دھیرے خود ہی خاموش ہو گئی۔ دفعتاً" اس کی نظر ایک نہایت خوبصورت اور خوش رنگ تتلی پر پڑی۔ ایسی تتلی اس نے آج تک اس جنگل میں نہیں دیکھی تھی۔ یہاں جو تتلیاں پائی جاتی تھیں وہ زیادہ تر بجھے بجھے سے رنگوں والی اور چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں۔ وہ تتلی شاید کسی اور ہی چمن کی تھی۔ شاید اس کی زندگی خوش رنگ پھولوں کے درمیان گزری تھی اور وہ راستہ بھول کر اس بے رنگ علاقے میں چلی آئی تھی۔

اس تتلی کو دیکھ کر رابعہ رونا دھونا بالکل ہی بھول گئی۔ تتلی ایک ایسی جھاڑی پر جا بیٹھی تھی جس میں ہلکے رنگ کے چھوٹے چھوٹے بے کشش سے پھول لگے ہوئے تھے۔ رابعہ سحر زدہ سے انداز میں تتلی کو پکڑنے کے لیے دبے قدموں بڑھنے لگی۔ تتلی اس کے جھاڑی تک پہنچنے سے پہلے ہی اڑ گئی اور ہوا میں گویا رقص کرتی ہوئی ایک دوسری جھاڑی کی طرف بڑھی۔ وہ دوسری جھاڑی پر بیٹھ چکی تو رابعہ ایک عزم نو کے

ساتھ اسے پکڑنے کے لیے بڑھی مگر وہ اس بار بھی اسے جل دے گئی۔

تتلی کا سفر جاری رہا اور رابعہ بھی خود فراموشی کے عالم میں اس کے تعاقب میں دوڑتی رہی۔ آخر ایک مقام پر تتلی اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو ایک کھلے میدان میں کھڑی پایا۔ اسے خود اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا اور وہ کیونکر جنگل عبور کر آئی تھی۔

اس مقام تک وہ پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ تمام بچے جنگل کے ایک محدود سے حصے میں کھیلتے تھے جو اچھی طرح ان کا دیکھا بھالا تھا۔ ان کے والدین کو بھی معلوم تھا کہ وہ زیادہ آگے جانے کی جرات نہیں کرتے تھے' اس لیے وہ ان کی طرف سے مطمئن رہتے تھے۔

رابعہ چند لمحے حیران پریشان سی وہاں کھڑی رہی۔ اس کا ننھا سا ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اسے کس طرف جانا چاہیے۔ سامنے تاحد نظری لق و دق میدان تھا۔ آخر اسے عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ واپس جنگل میں گھس کر گھر کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرے۔

وہ دوبارہ جنگل میں داخل ہوئی مگر اپنے اردگرد اسے ہر شجر اجنبی نظر آیا۔ وہ سہمی سہمی سی ایک طرف کو چلنے لگی۔ کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد اسے شبہ ہوا کہ شاید وہ گھر کی سمت نہیں بڑھ رہی تھی۔ تب اس نے رخ بدل لیا۔

درختوں کے درمیان بہت دیر تک گھومتی گھامتی آخر وہ ایک بار پھر کھلے میدان میں نکل آئی لیکن یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں وہ پہلے پہنچی تھی۔ یہ علاقہ نسبتاً ہموار اور کم ریتیلا تھا۔ یہاں سامنے کچھ فاصلے پر ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا چیز ہو سکتی تھی۔

پھر اسے یاد آیا کہ اس نے کبھی کبھار رات کے سناٹے میں گھر میں لیٹے لیٹے دور کہیں سے چیخ کی سی آواز سنی تھی اور اپنی ماں سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ ماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز تھی جس کے بعد رابعہ سوالات کی

بوچھاڑ کر دی تھی کہ ریل گاڑی کسے کہتے تھے .... وہ کیسی ہوتی تھی۔

جب ماں نے اسے ریل گاڑی کے بارے میں کئی معلومات فراہم کر دیں تو پھر اس نے یہ جاننا چاہا تھا کہ انہوں نے آج تک ریل گاڑی میں سفر کیوں نہیں کیا تھا؟

ماں نے بہلا پھسلا کر اسے چپ کرا دیا تھا تاہم اوروں کی بتائی ہوئی باتوں کی روشنی میں اسے اندازہ ہو گیا کہ سامنے لوہے کی جو دو پٹریاں دکھائی دے رہی تھیں وہ درحقیقت ریل کی پٹریاں تھیں۔

راستہ بھولنے کی تشویش اس کے ذہن سے محو ہو گئی اور وہ متجسس سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی مگر ریل گاڑی اسے کہیں نظر نہ آئی البتہ دور سے آتے ہوئے دو انسانوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

فوری طور پر تو اسے خوف محسوس ہوا اور اس کا جی چاہا کہ کسی طرف کو بھاگ لے مگر دوسرے ہی لمحے اس کی کیفیت بدل گئی۔ اس ویرانے میں دو انسانوں کو دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا۔ اس کا خوف شاید اس لئے بھی دور ہو گیا کہ ان دو انسانوں میں سے ایک عورت تھی۔

اس کا ساتھی مرد بھی کچھ ایسی شکل کا نہیں تھا کہ رابعہ اس سے ڈر جاتی۔ وہ دونوں صاف ستھرے' خوش شکل اور خوش لباس نظر آ رہے تھے۔ ایسے حلیے کے لوگ گاؤں میں کبھی کبھار ہی نظر آتے تھے اور وہ شہر سے آئے ہوتے تھے۔ رابعہ کو یقین ہو گیا کہ وہ دونوں بھی شہر کے رہنے والے تھے۔

مرد کے کندھے پر سفری بیگ لٹکا ہوا تھا اور عورت بازو پر بڑا سا پرس لٹکائے ہوئے تھی۔ وہ کچھ بیزاری کے سے عالم میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے آ رہے تھے۔ مرد بار بار رومال سے چہرہ پونچھ رہا تھا۔ دفعتاً" ان کی نظر رابعہ پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھی ٹھٹکے مگر پھر ان کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھر آئی۔ وہ ریل کی پٹڑی سے ذرا ہٹ کر رابعہ کی طرف آنے لگے۔

وہ قریب آئے تو رابعہ کو اور بھی اچھے دکھائی دیئے۔ عورت تقریباً" اس کی ماں

کی عمر کی تھی مگر اپنی ماں کو رابعہ نے کبھی اتنے صاف ستھرے نفیس لباس میں نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی ہونٹوں پر سرخی یا چہرے پر کریم پاؤڈر وغیرہ لگایا تھا ورنہ شاید وہ اس عورت سے زیادہ خوبصورت نظر آتی۔

مرد گورا چٹا اور بھاری بھر کم تھا۔ اس کی مونچھیں باریک سی تھیں اور لمبے بال اس وقت ذرا بے ترتیب دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کوٹ پتلون میں تھا اور پان چبا رہا تھا۔ رابعہ کے قریب پہنچنے سے پہلے اس نے ریلوے لائن کی طرف منہ کر کے پیک بھی تھوکی۔

رابعہ کے قریب پہنچ کر عورت شفقت سے مسکرائی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد شیریں لہجے میں بولی "لڑکی! تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے کیا؟"

اس کے لہجے سے رابعہ کو ڈھارس ہوئی مگر اکیلے پن کا احساس عود کر آیا جسے وہ ایک لمحے کے لیے بھول گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔

"تم اس سنسان جگہ پر اکیلی کیا کر رہی ہو؟" عورت نے ایک بار پھر پر تجسس انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔

"میں ..... جی ..... میں رستہ بھول گئی ہوں ..... میرا گھر نہیں مل رہا ....." رابعہ نے کمزور سی آواز میں کہا اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ کافی دیر سے اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا کھا کر گھر سے نکلی تھی اور اب سورج ڈھلنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر وہ مزید کچھ دیر تک گھر نہ پہنچی تو ماں سے بڑی ڈانٹ پڑے گی۔

"اوں .....!" عورت نے لمبی سانس لی اور معنی خیز نظروں سے مرد کی طرف دیکھا۔ مرد عجیب سے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ عورت نے اپنے پرس کا فیتہ انگلیوں میں دباتے ہوئے جھک کر رابعہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا رخسار چوما۔ رابعہ کو اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی خوشبو بہت بھلی لگی۔

"میری پیاری بیٹی گھر کا رستہ بھول گئی ہے ....." عورت کے لہجے میں حد سے زیادہ اپنائیت اور مٹھاس آ گئی۔ "آؤ ..... ہم تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔ کہاں ہے تمہارا گھر"؟ اس نے رابعہ کا ننھا ہاتھ اپنے گول مٹول ہاتھ میں تھام لیا۔ رابعہ نے دیکھا اس کی موٹی سی کلائی میں چمکتی ہوئی کئی پیلی پیلی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

"میرا گھر گاؤں میں ہے۔" رابعہ نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ اسے اپنے گاؤں کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ تاہم، اب اس کا خوف دور ہو گیا تھا۔ عورت کے لہجے نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ وہ اس کی ہمدرد تھی۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"گاؤں تو یہاں سے بہت دور ہے۔" مرد پہلی بار بولا۔ اس کے لہجے میں بھی بے پناہ شفقت اور ملائمت تھی: "یہاں تو کوئی سواری بھی نہیں ملتی۔ ہم خود کافی دور سے پیدل چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو ..... ہم تمہیں گاؤں پہنچا دیں گے لیکن اس کے لیے ہمیں ٹرین میں بیٹھنا پڑے گا۔ ٹرین سمجھتی ہونا؟ ریل گاڑی ..... وہ جو چھک چھک کر کے چلتی ہے ....." اس نے باقاعدہ اشارے سے سمجھایا۔

ایک لمحے کے لیے رابعہ کے دل میں خوشی کی لہر ابھری۔ گویا گھر کا راستہ بھولنا اس کے لیے اچھا ہی رہا تھا۔ اس بہانے آج اسے ریل گاڑی میں بیٹھنے کا موقع مل رہا تھا۔ مرد اور عورت دونوں نے اس کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا اور اسے پیار سے چمکارا۔ رابعہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر ان کے ساتھ چلنے لگی۔

"مجھے جلدی گھر جانا ہے ..... نہیں تو ماں ڈانٹے گی۔" اس نے گویا ان مہربان لوگوں کو اپنے مسئلے کی سنگینی کا احساس دلایا۔

"بھئی تمہارے گھر پہنچنے میں تو اب کافی دیر لگے گی کیونکہ تم رستہ بھول کر بہت دور نکل آئی ہو....." مرد پان چباتے ہوئے بڑی ملائمت سے بولا: "لیکن تم بے فکر رہو۔ تمہاری امی تمہیں نہیں ڈانٹیں گی۔ ہم انہیں سمجھا دیں گے کہ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔"

وہ، رابعہ کو ساتھ لیے ایک بار پھر پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ رابعہ اب

تھک چکی تھی۔ اسے ٹانگوں میں درد محسوس ہو رہا تھا مگر اب گویا اسے ایک نیا حوصلہ مل گیا تھا اور وہ ایک بے عنوان سے اشتیاق کے ساتھ اپنی ڈھیلی ڈھالی چپلیں گھسیٹتی، ان مہربانوں کے ہمراہ چل رہی تھی۔ جو نہ جانے کہاں سے اس کی مدد کو آن پہنچے تھے۔

کچھ دور تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد عورت اپنے ساتھی سے مخاطب ہوئی: ”ایک بات بہرحال طے ہے کہ اللہ اپنے نیک بندوں ہی کا نہیں .... بلکہ اپنے گناہ گار بندوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔“

”بے شک....“ مرد دھیرے سے ہنسا پھر میٹھی میٹھی سی آواز میں بولا ”اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔“

”ہاں .... اب دیکھو تو سہی ...... ہم تو آئے تھے اس نگوڑ ماری زمین کے بالشت بھر ٹکڑے کا جھگڑا نمٹانے .... ہم نے تو سوچا تک نہیں کہ اس ویرانے میں بھی راستے میں ایک ہیرا پڑا مل جائے گا۔“ عورت نے کنکھیوں سے رابعہ کی طرف دیکھا۔

”پڑا نہیں ... بلکہ کھڑا مل جائے گا۔“ مرد نے گویا تصحیح کی۔ دونوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد عورت بولی۔ ”ویسے چیز بہت پیاری ہے۔“

”ہاں ... گدڑی میں لعل والا معاملہ ہے۔“ مرد سر ہلاتے ہوئے بولا۔

رابعہ ان کی باتوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی وہ شاید اپنی ہی کچھ باتیں کر رہے تھے اور رابعہ کی ماں اکثر اس سے کہا کرتی تھی کہ بڑوں کی باتوں میں بچوں کو نہیں بولنا چاہئے چنانچہ وہ خاموش رہی۔

چند لمحے بعد مرد نے گھڑی دیکھی اور عورت سے مخاطب ہوا۔ ”ہمیں ذرا تیز چلنا چاہئے۔ ٹرین آنے ہی والی ہوگی۔ اب وہ راستے میں تو ہمارے لئے رکے گی نہیں۔“

عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور رابعہ کی طرف جھک کر بولی: ”بیٹا! ذرا تیز

چلو۔ اگر ٹرین چلی گئی تو ہم تمہارے گھر کس طرح جائیں گے؟“

رابعہ نے کچھ تیز چلنے کی کوشش کی لیکن چند قدم کے بعد مرد نے اسے گود میں اٹھا لیا ساتھ ہی وہ خود کلامی کے انداز میں ناگواری سے بڑبڑایا۔ ”اس منحوس علاقے میں سفر کے لیے کوئی سواری تک بھی دستیاب نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے دیہات وغیرہ میں بھی کم از کم تانگے تو ہوتے ہیں لیکن یہ علاقہ تو بالکل ہی گیا گزرا ہے۔“

عورت گویا اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ”انہوں نے ہمیں بیل گاڑی میں اسٹیشن تک پہنچانے کی پیشکش تو کی تھی، تم ہی نہیں مانے۔“

”ہونہہ ...“ مرد ناگواری اور حقارت سے بولا: ”بیل گاڑی بھی بھلا کوئی سواری ہے؟ کیسے مضحکہ خیز لگتے ہم اس پر بیٹھے ہوئے۔ اس سے تو آدمی پیدل ہی اچھا ہے۔“

”اس ویرانے میں بھلا کون ہمیں دیکھتا بیل گاڑی پر بیٹھے ہوئے؟“ عورت نرمی سے بولی۔ ”خیر... چھوڑو اس ذکر کو، اب تو اسٹیشن سامنے نظر آ رہا ہے۔“

”ہم پیدل زیادہ جلدی پہنچ گئے ہیں۔ بیل گاڑی میں شاید اب تک نہ پہنچ پاتے۔“ مرد بولا۔ ”یہ کمبخت بیل بھی بڑا ہی سست رفتار جانور ہے۔ بس یوں سمجھو بڑے سائز کا کچھوا ہے۔“

عورت موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”میں اصل میں یہ کہنے لگی تھی کہ اگر اسٹیشن پر کسی نے بچی کو پہچان لیا تو.....؟“

”میرا خیال ہے یہ جس گاؤں کی ہے، اس گاؤں کے لوگ سفر کے ارادے سے اسٹیشن کی طرف تو مشکل سے ہی آتے ہوں گے کیونکہ یہ انہیں کافی دور پڑتا ہے۔ سڑک ان کے گاؤں سے زیادہ قریب ہے۔ وہ لوگ اگر سفر کرتے بھی ہوں گے تو لاری وغیرہ سے ہی کرتے ہوں گے۔“

پھر ایک لمحے سوچ کر وہ بولا۔ ”بہرحال اس مسئلے کا حل بھی میرے ذہن میں ہے۔ دوا کی شیشی تو میرے پاس ہی ہے۔“

”بہت خوب۔“ عورت طمانیت سے بولی۔ ”یہ تم اچھا کرتے ہو کہ دوا کی شیشی

ہر وقت پاس ہی رکھتے ہو۔"

"ہاں بھئی .... قسمت کا کیا پتا ... کب اور کس موڑ پر اچانک انسان پر مہربان ہو جائے۔" مرد کا لہجہ خوشگوار ہو گیا۔

پھر چند لمحے بعد وہ بولا۔ "لو بھئی .... آخر کار اسٹیشن آ ہی گیا۔"

رابعہ نے دیکھا اب وہ اینٹوں کے ایک ایسے چبوترے پر چڑھ رہے تھے جس کا ایک سرا ڈھلواں تھا۔ چبوترا بہت لمبا تھا۔ اس پر ایک جگہ ٹین کا سائبان بھی نظر آ رہا تھا جس کے نیچے دو تین بنچیں بھی موجود تھیں۔ اکا دکا آدمی ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

دونوں رابعہ کو لیے بنچ پر جا بیٹھے۔ اب مرد نے رابعہ کو عورت کی گود میں بٹھا دیا اور شفقت سے بولا: "بیٹا! تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی .... میں دیکھتا ہوں ... شاید تمہارے لیے چائے والے سے دودھ اور بسکٹ مل جائیں۔"

اس نے بیگ کھول کر پلاسٹک کا ایک مگ نکالا اور رابعہ کے لیے دودھ لینے چل دیا' عورت نے رابعہ کا سر کندھے سے لگالیا اور یوں اسے تھپکیاں دینے لگی جیسے لوری سنا رہی ہو۔ پھر وہ بڑے شیریں لہجے میں بولی: "بس اب ریل گاڑی آتی ہی ہو گی میں تمہیں ریل گاڑی میں بیٹھا کر تمہارے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

"آپ کو پتا ہے میرا گھر کہاں ہے؟" رابعہ نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ بھوک پیاس کی وجہ سے اور بھی کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گویا بند ہوئی جا رہی تھیں۔

"ہاں مجھے تمہارے گھر کا پتا ہے۔ میں تمہاری امی کو بھی جانتی ہوں۔" عورت نے بڑے وثوق سے جواب دیا اور رابعہ نے مطمئن ہو کر اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد مرد اس کے لیے دودھ لے آیا۔ اس کے ہاتھ میں بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی تھا۔ رابعہ نے خاصی بے صبری سے بسکٹ دودھ میں ڈبو ڈبو کر کھانے

شروع کر دیئے۔ آخر میں وہ بچا ہوا دودھ بھی جلدی جلدی پی گئی۔

دودھ اور بسکٹ معدے میں اترنے کے کچھ دیر بعد ہی اس کا سر گھومنے لگا۔ اتنی تیزی سے اسے پہلے کبھی نیند نہیں آئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی کیونکہ اس کے دل میں ریل گاڑی دیکھنے اور اس میں سفر کرنے کا اشتیاق تھا مگر وہ آنکھیں کھلی رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

بوجھل آنکھیں پوری طرح بند ہونے سے پہلے اس نے صرف اتنا دیکھا کہ عورت اسے اپنی گود میں لٹا کر سر سے پاؤں تک چادر سے ڈھانپ رہی تھی۔ اس موسم میں رابعہ منہ ڈھانپ کر نہیں سوتی تھی لیکن اس وقت اس میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ چادر چہرے سے ہٹا سکتی یا کچھ بول ہی سکتی۔ وہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر آرام سے سو گئی۔

جب وہ بیدار ہوئی تو اس کا سر بھاری بھاری تھا۔ آنکھیں کھولنے کے کافی دیر بعد وہ گرد و پیش پر غور کر سکی۔ وہ ایک ایسے کمرے میں تھی جو اسے بہت کشادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کمرے میں وہ ایک اونچی مسہری پر' صاف ستھرے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی دوسری مسہری بھی موجود تھی' مگر وہ خالی تھی۔

یہ سب کچھ اس کے گھر سے بہت مختلف تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی جیسے بلااجازت کسی کے کمرے میں آ لیٹی ہو۔ آنکھیں ملتی ہوئی وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ مسہری اتنی اونچی تھی کہ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں فرش کو چھو نہیں پا رہے تھے۔ اپنے گھر میں وہ چھوٹے چھوٹے پایوں کی ایک ڈھیلی جھلنگا سی چارپائی پر سوتی تھی۔

وہ مسہری سے کودی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولنے کے لیے اس نے اپنی بساط کے مطابق بہت زور لگایا لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔

رابعہ نے بدحواس ہو کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

کسی نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے والی وہی عورت تھی جس کی گود میں رابعہ سوئی تھی۔ ریل گاڑی میں سفر کرنے کا اشتیاق دل میں لئے... ! اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ سوتی ہی رہ گئی تھی اور ریل گاڑی کا سفر ختم بھی ہو گیا تھا مگر وہ اپنے گھر کیوں نہیں پہنچی تھی ؟ یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔

"آپ نے مجھے میرے گھر کیوں نہیں پہنچایا ؟ میری ماں کہاں ہے؟" رابعہ نے پوچھا۔ اس کی پریشانی اس کے لہجے میں جھلک آئی تھی۔

عورت نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ خوب پیار کیا پھر اسے مسہری پر بٹھا کر محبت سے سمجھانے کے انداز میں بولی۔ "بیٹی ہم تمہارے گھر گئے تھے لیکن تمہاری امی وہاں نہیں تھیں۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ کسی ضروری کام سے دوسرے شہر گئی ہیں اور بہت دنوں میں واپس آئیں گی۔ اس لیے ہم تمہیں اپنے گھر لے آئے کہ اکیلی تو تم وہاں ڈرو گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

اس کا ننھا سا ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا اس کی ماں اسے چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتی تھی ؟ وہ تو کام پر جاتے وقت بھی اسے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ رات کو اسے سینے سے لگا کر سوتی تھی۔ اس کا معصوم ذہن حقیقت کا اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا۔

اسے تو ابھی یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بڑی عمروں کے لوگ جھوٹ بھی بولتے تھے۔ اسے اپنے شک کا اظہار کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

وہ کہے بھی تو کیا کہے ..... ! لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ خوش نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں سے، اپنے گھر سے دور نہیں رہ سکی تھی حالانکہ وہ کمرا اسے اپنے گھر سے لاکھ درجے بہتر دکھائی دے رہا تھا اور وہ عورت بھی مہربان معلوم ہوتی تھی۔ ماں کی طرح ہی محبت کرنے والی دکھائی دیتی تھی۔ مگر رابعہ کو اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ رونے لگی۔

عورت مختلف حیلے بہانوں سے اسے بہلانے لگی۔ بڑی محبت سے .... شفقت سے .... بالکل ماؤں کی طرح ! تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا سا شخص کمرے میں آیا۔ وہ رابعہ کے لیے بہت سے کھلونے اور مٹھائیاں لایا تھا۔ ساتھ ہی اس عورت کے ہونٹوں سے بھی پیار بھرے لفظوں کا شہد ٹپکتا رہا۔ آخر رابعہ کا دل بہلتے بہلتے بہل ہی گیا.... آتے آتے بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔

وہ دن کسی نہ کسی طرح گزر ہی گیا۔ رات آئی تو رابعہ کے دل میں ایک بار پھر ماں کے پاس جانے کی ہوک اٹھنے لگی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ عورت نے بہلا پھسلا کر اسے دودھ کا ایک گلاس پلایا اور سینے سے چمٹا کر مسہری پر لیٹ گئی۔ چند منٹ بعد ہی رابعہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر وہ بے سدھ سو گئی۔

شب و روز یونہی گزرنے لگے۔ رابعہ کی کیفیت بدلتی رہی۔ کبھی بے کلی تو کبھی قرار ....، کبھی اضطراب تو کبھی مدہوشی، کبھی تڑپنا تو کبھی بہل جانا۔ عورت کو وہ زیادہ تنگ کرتی تو اسے دودھ کا گلاس دے دیا جاتا جس کے بعد وہ بے سدھ ہو کر سو جاتی۔

رفتہ رفتہ وہ اس ماحول سے کچھ مانوس ہونے لگی۔ اس کے سینے میں ہر وقت جو ایک زخم سا ہرا رہتا تھا، وہ اب کچھ مندمل ہونے لگا تھا۔ ماں کی یاد اسے اب بھی تڑپاتی تھی مگر وہ عورت بڑی ہوشیاری سے اسے سنبھال لیتی تھی، بہلا لیتی تھی۔ اگر وہ غصہ دکھاتی، سختی کرتی اور رابعہ پر برہم ہوتی تو شاید رابعہ کبھی نہ بہلتی مگر وہ بڑی قوت برداشت کی مالک تھی۔ رابعہ کو پرانی باتیں بھلانے کے لئے اور بھی بہت سے حربے استعمال کیے جا رہے تھے۔

جب رابعہ اس عورت سے کافی مانوس ہو گئی تو اس نے دن میں کئی کئی بار رابعہ کو سمجھانا شروع کر دیا۔ "بیٹی! دیکھو... تمہاری ماں تو تمہیں چھوڑ کر چلی گئی نا.... اب میں ہی تمہاری ماں ہوں ..... اور اب تمہارا نام بھی رابعہ نہیں، رئیسہ ہے۔ رئیسہ زیادہ اچھا نام ہے۔ اب ہم تمہیں رئیسہ ہی کہہ کر بلایا کریں گے ٹھیک ہے نا؟؟"

پہلے پہل تو وہ نہیں مانتی تھی کہ اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ماں کہیں کھو گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ درحقیقت وہ خود کھو گئی تھی۔ وہ ان الم نصیب بچوں میں سے ایک تھی۔ جو تتلیوں کے تعاقب میں ماؤں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ وہ تتلیاں سچ مچ کی تتلیاں بھی ہو سکتی تھیں یا ان کے کچھ اور نام بھی ہو سکتے تھے۔

رابعہ کو نہیں معلوم تھا کہ کسی نے اسے اس پرسکون گوشے.... اس کی سادہ سی جنت سے اٹھا کر دنیا کے بازار میں گھسیٹ لیا تھا۔ شروع شروع میں وہ "رئیسہ" کے نام سے بلائے جانے پر متوجہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن تقریباً" ایک سال گزر جانے کے بعد اس میں دو تبدیلیاں آ ہی گئیں۔ اب وہ اس عورت کو امی کہتی تھی اور رئیسہ کے نام سے بلائے جانے پر متوجہ ہو جاتی تھی۔

اس کے بعد مزید تبدیلیوں کے لیے گویا راستہ ہموار ہو گیا!

اب وہ کچھ بڑی ہو چکی تھی اور اسے پورے گھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی حاصل ہو چکی تھی ورنہ پہلے تو طویل عرصے تک اسے ایک ہی کمرے میں محدود رکھا گیا تھا۔

وہ کسی خاصے بڑے مکان کی اوپر کی منزل تھی۔ ایک طرف قطار میں کئی کمرے تھے۔ سامنے کافی بڑا صحن نما حصہ تھا جس کے دوسرے سرے پر باورچی خانہ اور غسل خانے وغیرہ تھے۔ کمروں کے دروازے عموماً" بند رہتے تھے۔ جب دروازے کھلے ہوتے تو رئیسہ کھیلتی کودتی ان کمروں میں بھی چلی جاتی۔

ایک کمرے میں دو جوان لڑکیاں رہتی تھیں۔ دوسرے کمرے میں چوڑے

چہروں والے دو لحیم شحیم آدمی رہتے تھے۔ رئیسہ کو ان سے بڑا خوف آتا تھا۔ وہ پیار سے رئیسہ کو پاس بلاتے تب بھی رئیسہ ان کے کمرے میں نہیں جاتی تھی۔ اس سے اگلے کمرے میں ایک بڑے میاں اور دو نوجوان رہتے تھے۔ ان کے کمرے میں طبلے، سارنگیاں، ہارمونیم اور اسی قسم کے دوسرے ساز بھی رکھے رہتے تھے۔

دوپہر تک ان لوگوں کے کمروں کے دروازے بند ہی رہتے تھے اور وہ سوتے رہتے تھے۔ خود وہ عورت بھی جسے اب رئیسہ اسی کی ہدایت پر امی کہنے لگی تھی، دن چڑھے تک رئیسہ والے کمرے میں دوسری مسہری پر سوتی رہتی تھی۔ اس نے رئیسہ کو ہدایت کی تھی کہ جب گھر میں دوسرے لوگ سو رہے ہوں تو وہ بالکل خاموشی سے کھیلا کرے، شور شرابا نہ کرے اور نہ ہی جاکر کسی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ اس دوران رئیسہ کو ضرورت کی ہر چیز وہ بڑے میاں دیا کرتے تھے جو چوتھے کمرے میں رہتے تھے۔

سورج ڈھلنے لگتا تو دوسرے کمرے میں رہنے والی لڑکیاں گویا بڑی مشکل سے، کسل مندی سے پیچھا چھڑا کر اٹھتیں اور پیروں میں گھنگرو باندھ کر مشق کرنے کے سے انداز میں رقص کرنا شروع کر دیتیں۔ چوتھے کمرے میں رہنے والے سازندے بھی اپنے ساز اٹھا کر اسی کمرے میں آ جاتے۔

لڑکیاں قالین پر چھم چھم تھرکتیں اور سازندوں میں سے بڑی عمر کا ایک شخص بار بار انہیں ٹوکتا۔ "شمیم بی بی! یوں نہیں ..... یوں گائیے...." وہ حلق سے کھردری سے آواز نکال کر بتاتا۔

پھر دوسری سے مخاطب ہوتا: "نہ .... نہ رقیہ بی بی! دایاں نہیں، بایاں پاؤں پہلے اٹھانا ہے ...." وہ خود اٹھ کر رقص کا زاویہ بنا کر دکھاتا، گویا سبق یاد کرا رہا ہو۔ دیر تک یہی سلسلہ رہتا۔ رئیسہ یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے اکتا جاتی۔

شام کے سائے گہرے ہوتے تو لڑکیاں بناؤ سنگھار شروع کر دیتیں۔ خوب بن سنور کر، وہ بھڑکیلے کپڑے پہنتیں۔ خوشبوئیں لگاتیں "امی" بھی بڑے اہتمام سے تیار

ہوتیں۔ پھر سب لوگ سیڑھیاں اتر کر نیچے کہیں چلے جاتے۔ گھر میں صرف رئیسہ ا
بڑے میاں رہ جاتے۔

رئیسہ نے اب "امی" کے بغیر بھی تنہا اپنے کمرے میں سونا سیکھ لیا تھا۔ اب کمرے میں تنہا رہنے میں خوف محسوس نہیں کرتی تھی۔ بڑے میاں اس کی ہ ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ فارغ وقت میں وہ اسے لکھاتے پڑھاتے بھی تھے۔ رئی ان سے کافی مانوس ہو چکی تھی۔

سیڑھیوں پر لوہے کی سلاخوں والا دروازہ موجود تھا اور اس میں تالا لگا رہتا تھا۔ تالا اگر کھلا ہوتا تب بھی رئیسہ کو نیچے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ کبھی کبھی جب اسے رات کو دیر تک نیند نہیں آتی تھی تو وہ اپنے کمرے کی اس بالکونی میں جا کھڑ ہوتی تھی جہاں سے بازار نظر آتا تھا۔

وہ بڑا بارونق بازار تھا۔ ہوا کے جھونکے اپنے دامن میں طرح طرح کی خوشبوئ لیے آتے تھے۔ لوگوں کی ٹولیاں ادھر سے ادھر ٹہلتی نظر آئیں۔ سبھی گردنیں اٹھا ادھر ادھر گویا کچھ تلاش کر رہے ہوتے تھے۔ بیچ میں کہیں کہیں ہاروں اور گجروں وال بھی گھومتے پھرتے نظر آتے۔ کبھی کبھی ادھر ادھر سے طبلے کی تھاپ یا گھنگروؤں ک ڈوبتی ابھرتی جھنکار بھی سنائی دے جاتی۔

رئیسہ کو بلند و بالا مکانات' رونق اور گہماگہمی' بے ترتیب موسیقی کا اتار چڑھا خوشبوؤں کے جھونکے اور جھلملاتی روشنیاں بہت بھلی لگتیں لیکن کبھی کبھی اس ک تصور میں چھدرے چھدرے کچھ درخت' ہری بھری جھاڑیاں' ہوا میں غوطے لگا تتلیاں اور کچھ ننھے ساتھیوں کے چہرے' پرچھائیوں کی طرح در آتے۔ چند لمحو کے لیے وہ گویا ہوش اور مدہوشی کے درمیان کہیں ہلکورے لینے لگتی۔

اب تو اپنے ساتھیوں کے چہرے بھی اس کے ذہن سے محو ہونے لگے تھ صرف ماں کا چہرہ اب بھی یادوں کے افق پر روشن تھا مگر اب اس چہرے کو یاد کر اس کے سینے میں زخم کی سی اذیت تازہ نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک ہوک سی اٹھتی تھ

جو جلد ہی دب جاتی تھی۔



رئیسہ کو رقص سکھانے کے لیے سات سال کی عمر میں پہلی بار اس کے پیروں میں گھنگرو باندھے گئے۔ اس روز گھر میں جشن کا سماں تھا۔ مٹھائی کا ایک ٹوکرا آیا تھا۔ سازندوں نے یوں ہار پہن رکھے تھے جیسے وہ شادی بیاہ یا کسی اور خوشی کی تقریب کے خاص مہمان ہوں۔

سب بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ لیکن جب رئیسہ کے پیروں میں گھنگرو باندھنے کا مرحلہ آیا تو اس نے ٹانگ جھٹک کر گھنگرو دور پھینک دیئے۔ اس کے معصوم سے ذہن میں کہیں سے یہ احساس رینگ آیا تھا کہ گھنگرو باندھ کر لوگوں کے سامنے ناچنا ایک معیوب کام تھا اور یہ کوئی عزت کی بات نہیں تھی۔

اس کے ذہن میں یادوں کی کچھ دھندلی سی پرچھائیاں موجود تھیں۔ اسے کچھ کچھ یاد تھا... ایک بار گاؤں میں کسی کی شادی پر میدان میں شامیانے لگے تھے اور رات کو اس نے دور سے بچوں کے ہجوم کے ساتھ ایک کونے میں کھڑے ہو کر دیکھا تھا کہ بہت سے مردوں کے سامنے دائرے میں دو عورتیں ناچ رہی تھیں۔ وہ رنگ برنگے خوبصورت کپڑوں میں تھیں اور لہک لہک کر کچھ گا بھی رہی تھیں۔

لوگ ان پر نوٹ پھینک رہے تھے جنہیں ایک کالا سا شخص سمیٹتا جا رہا تھا۔ رئیسہ کو ان عورتوں کی ادائیں' ان کا تھرکنا' ان کا لباس اور ان کا لہک لہک کر گانا' سب کچھ اچھا لگا تھا۔

دوسرے روز جب اس کی ماں کھڈیوں پر کام پر جاتے وقت اسے ساتھ لے گئی تو حسب معمول کئی بچے کھیلنے کے لیے جمع ہوئے۔ اس نے بچوں سے کہا۔ "آج میں تمہیں ایک نیا کھیل دکھاتی ہوں ...."

اس نے سب بچوں کو دائرے میں بٹھایا اور ان کے سامنے اسی طرح ناچنے کی کوشش کرنے لگی جس طرح اس نے پچھلی رات ان دو عورتوں کو ناچتے دیکھا تھا۔ وہ

اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں کو ہوا میں لہرا رہی تھی اور اپنے کچے بدن کو لہریئے دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کی ماں نے دور سے یہ تماشا دیکھا تو کھڈی چھوڑ کر اٹھ کر آئی اور اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے بولی۔ "تجھے یہ کام کس نے سکھا دیا؟؟"

اس نے روہانسی ہو کر بتایا کہ پچھلی رات اس نے دو عورتوں کو ناچتے دیکھا تھا۔

ماں کچھ اور غصے میں آ کر بولی: "کمینی! اسی لیے تو کہتی ہوں زیادہ ادھر ادھر مت پھرا کر.... بالشت بھر کی ہے مگر ایسی باتیں کتنی جلدی سیکھ لیتی ہے...."

پھر اس نے گویا غصہ ضبط کرتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "بیٹا! اس طرح دوسروں کے سامنے ناچنا بڑی بری بات ہے.... بڑی شرم کی بات ہے .... یہ .... یہ عزت والوں کا کام نہیں ہے۔"

وہ جملے اس کے لاشعور میں کہیں پیوست تھے اور آج ابھر آئے تھے۔ شاید انہی کا اثر تھا کہ اس نے گھنگرو دور پھینک دیئے تھے۔ اس کی اس حرکت پر سب دم بخود رہ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی جھنکار اس کے لیے بہت جانی پہچانی سی آوازیں بن چکی ہوں گی اور اس کے بدن میں رقص کی پیاس پیدا ہو چکی ہوگی.... مگر وہ تو سازوں اور سازندوں کو نفرت کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

وہ عورت جسے وہ امی کہتی تھی، جلدی سے اس کے قریب آئی۔ اس کا نام فریدہ تھا۔ وہ بڑی شفقت سے بولی: "کیا ہوا میری جان! تم نے گھنگرو کیوں پھینک دیئے؟ استاد جی تمہیں ناچنا سکھائیں گے۔"

"میں نہیں سیکھوں گی ناچنا۔" اتنے دنوں میں پہلی بار اس کے لہجے میں ضد جھلکتی محسوس ہوئی: "ماں کہتی تھی ناچنا بڑی بری بات ہے .... یہ عزت والوں کا کام نہیں ہے۔"

"اف میرے خدا.... !" فریدہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر قالین پر بیٹھ گئی۔ "اس کے دماغ سے تو ابھی تک ماں اور ماں کی باتیں نہیں نکلیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی

کہ میں نے ماضی سے اس کا رشتہ کاٹ دیا ہے۔"

پھر اس نے استاد مکرم علی کی طرف دیکھا، جو ناچ گانے اور ساز بجانے میں ماہر تھے۔ وہ ایک عجیب سی بے چارگی سے بولی۔ "ایک تو ان غریب لوگوں کو عزت والے کہلانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ کتنی کم عمری سے ان کے دماغوں میں عزت کا خناس گھسا دیا جاتا ہے۔ جب یہ بچی میرے پاس آئی تو کتنی چھوٹی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ کسی فاقہ کش گھرانے کی ہے۔ مگر اس وقت بھی اسے عزت داری کا سبق مل چکا تھا اور یہ ابھی تک اسے بھولی نہیں۔ مجھے اپنی اب تک کی محنت اور ریاضت بے کار جاتی لگ رہی ہے۔ اب مجھے وہی کرنا پڑے گا جو میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

وہ آج تک رئیسہ کے ساتھ بڑی شفقت کا سلوک کرتی آئی تھی۔ لیکن اب وہ یکایک ہی آگ بگولا ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"شیر خان .... احسان علی!" اس نے غصے سے کانپتی آواز میں پکارا۔

فوراً ہی تیسرے کمرے سے تانبے کی سی رنگت اور چوڑے چکلے چہروں والے وہ دونوں آدمی لپک کر آئے جو اکثر وہیں پڑے نظر آتے تھے۔

"شیر خان! یہ اتنی سی عمر میں بھی سر اٹھا رہی ہے۔" فریدہ نے رئیسہ کی طرف اشارہ کیا۔ "ناچنے سے انکار کرتی ہے۔"

شیر خان نے نفرت و حقارت سے رئیسہ کی طرف دیکھا اور دانت پیس کر پوچھا۔

"نہیں سیکھے گی ناچنا؟"

"نہیں ...." اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

پہلی بار اس کے لہجے میں اتنی سرکشی آئی تھی حالانکہ اسے شیر خان اور احسان علی سے بہت خوف آتا تھا۔ ایک بار اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ دونوں کسی بات پر برہم ہو کر اسے ڈانٹ رہے تھے۔ اس رات سوتے میں بھی اس کی گھگی بندھ گئی تھی اور وہ بری طرح روتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

شیر خان نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس کا ہاتھ بیلچے کی

طرح بھاری تھا۔ رئیسہ کئی فٹ دور دیوار سے جا ٹکرائی اور بے ہوش ہو گئی۔

یہ اس کی پہلی اور آخری بغاوت تھی!

دوسرے روز اس نے بے چون و چرا پیروں میں گھنگرو باندھ لئے کیونکہ کل کے تھپڑ کی وجہ سے اس کا گال سوجا ہوا تھا اور کان کے اندر تک درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ معدے میں بھی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں کیونکہ کل سے اب تک اسے کھانے کے لیے کچھ نہیں ملا تھا۔ فریدہ جو اس کی زبان سے خود کو امی کہلواتی تھی اور ہر وقت بات بات پر اسے چومتی تھی' اب گویا اپنی ساری شفقت اور محبت بالائے طاق رکھ چکی تھی۔ کل سے اس کی نظریں ہی بدل گئی تھیں۔

جب اس نے گھنگرو باندھ لیے' اور استاد مکرم علی کی ہدایات کے مطابق پاؤں اٹھانے اور جسم کی کچی شاخ کو لہرانے کے علاوہ' دوزانو بیٹھ کر گلے سے سر نکالنا بھی سیکھنا شروع کر دیا تو فریدہ اس پر دوبارہ مہربان ہو گئی۔ اس کی تمام نوازشات بحال ہو گئیں۔

سب کچھ اسی طرح مرحلہ وار ہو رہا تھا جس طرح ایسی جگہوں پر ہوتا تھا۔ رئیسہ کو احساس نہیں تھا کہ وقت کسی برق رفتار پرندے کی طرح اڑ رہا تھا یا کچھوے کی طرح رینگ رہا تھا۔ اس کے محسوسات گویا کسی ایک جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ وہ بس اپنے آپ میں گم صم رہتی تھی۔ روز و شب گزارے جا رہی تھی۔

ایک سال اور بیت گیا!

اس ایک سال میں اس نے کچھ ناچنا گانا اور کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ایک سال میں اس کی طبیعت میں بڑی سعادت مندی آ گئی تھی۔ وہ چپ چپ رہتی اور جو کچھ اس سے کہا جاتا' اس پر خاموشی سے عمل کرتی۔

اسی دوران اس نے محسوس کیا کہ گھر کی فضا میں کچھ تبدیلی سی آ رہی تھی۔

سبھی لوگ اب اکثر متفکر نظر آتے تھے۔ شمیم اور رقیہ بھی اب کئی کئی دن بن سنور کر نیچے نہیں جاتی تھیں۔ جس دن جاتی بھی تھیں تو جلدی لوٹ آتی تھیں۔

رئیسہ بالکونی میں کھڑی ہوتی تو اسے بازار بھی کچھ اجڑا اجڑا سا لگتا۔ اب وہ پہلی سی چہل پہل نظر نہ آتی۔ عام لوگوں کی جگہ باوردی سپاہیوں کی ٹولیاں گشت کرتی نظر آتیں۔

رئیسہ کو نہیں معلوم تھا کہ بڑی سی عمارت کی اس منزل پر جو افراد رہ رہے تھے' وہ ایک دوسرے کے کیا لگتے تھے۔ ایک بار اس نے فریدہ سے پوچھا بھی تھا۔ "امی! یہ دوسرے لوگ ہمارے کیا لگتے ہیں؟"

"کچھ نہ کچھ لگتے ہیں بیٹی! ہم سب ایک خاندان ہیں۔" فریدہ نے مشفقانہ انداز میں جواب دیا تھا۔ "دوسرے لوگوں کے خاندان تو بکھر جاتے ہیں ... لیکن ہم لوگوں کے خاندان اتنی آسانی سے نہیں بکھرتے .... ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ بڑے مضبوط رشتے ہیں۔ جیسے میں تمہاری ماں ہوں ..... دوسرے بچوں کی مائیں انہیں چھوڑ سکتی ہیں لیکن میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

ایک روز رئیسہ نے اس "خاندان" کے سب لوگوں کو ایک کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھے دیکھا۔ فریدہ بڑے مردہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی: "یہ نیا گورنر تو ہمارے لیے تباہی کا پیغام بن کر آیا ہے۔ اس نے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اس بازار کو ختم کر کے دم لے گا.... اور وہ اپنی بات کا بہت پکا معلوم ہوتا ہے۔"

استاد مکرم علی بولے: "جو لوگ یہاں کرائے پر رہ رہے ہیں' انہیں تو ہر حال میں مکان اور بالا خانے خالی کرنے پڑیں گے۔ اب تو ان کے لئے آخری تاریخ کا بھی اعلان ہو چکا ہے۔ اس کے بعد صرف ذاتی جائیداد رکھنے والوں کو اپنے مکانوں میں رہنے کی اجازت ہوگی۔"

فریدہ گویا جل کر بولی۔ "وہ بھی یہاں رہ کر کیا کریں گے؟ دھندا تو وہ کر نہیں سکیں گے۔ خیر.... فی الحال تو ہمیں اپنی فکر کرنی چاہئے۔ ہم لوگوں نے یہاں سے منتقل ہونے کا فیصلہ تو کر ہی لیا ہے۔ اس وقت میں تم سب لوگوں سے یہ مشورہ کرنا چاہتی تھی کہ ہمیں کس علاقے میں منتقل ہونا چاہئے؟"

"فائدہ تو کسی اچھے علاقے میں منتقل ہونے میں ہے۔" استاد مکرم علی بولے۔

"لیکن اس کے لیے روپیہ بہت چاہئے۔ جب تک پاؤں اچھی طرح نہ جم جائیں ہم زیادہ رقم پھنسانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"بے شک ....." فریدہ نے تائید میں سر ہلایا۔ "اس کے علاوہ ہمارے پاس زیادہ روپیہ اب ہے بھی کہاں ؟ ہمارے کنگال ہونے میں کون سی کسر رہ گئی ہے ؟ پچھلے تین چار مہینوں میں ہم نے پولیس کو دل کھول کر جو روپیہ' کھلایا وہ سب ضائع ہی ہو گیا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہم یہیں ٹکے رہیں گے۔"

"اب تو یہ امید چھوڑ دینی چاہئے۔" استاد مکرم علی غم زدہ انداز میں سر ہلا کر بولے۔ "اوپر والوں نے بڑے سخت فیصلے کر لئے ہیں۔ تماش بینوں کو تو اب ادھر کا رخ ہی نہیں کرنے دیا جاتا۔ پولیس بے عزتی کرتی ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ بازار میں داخل ہی نہ ہونے پائیں۔"

"مقصد یہ کہ اب ہمیں یہاں سے کوچ کی تیاری کر لینی چاہئے؟" فریدہ نے گویا تائید چاہی۔

"بالکل ....." استاد مکرم علی نے سر ہلایا۔ "اور میرا مشورہ یہی ہے کہ ہمیں راوی روڈ کے اس حصے میں منتقل ہونا چاہئے جہاں کچھ پلاٹ اور ٹرسٹ کے کچھ مکانات حکومت نے ہم لوگوں کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ وہاں ہمیں رعایتی قیمت پر جائیداد دینے کی پیش کش کی گئی ہے۔ وہاں لوگ بھی اپنے جانے پہچانے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے..... تو پھر آپ لوگ تیاری شروع کریں۔" فریدہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہاں رہے تو کہیں فاقوں کی نوبت نہ آ جائے۔ پولیس کے ہاتھوں الگ ذلیل ہونا پڑتا ہے۔"

رئیسہ بظاہر ان معاملات سے بالکل لاتعلق تھی لیکن اس نے یہ گفتگو بڑی توجہ سے سنی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک رات گھر کا سامان ایک ٹرک میں لادا گیا اور نیم تاریکی میں چند منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک اور مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکان

زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن دو منزلہ تھا۔ وہ سب آسانی سے اس میں رہ سکتے تھے۔

تھوڑے دنوں تک وہ سب نئے مکان سے مانوس ہو گئے۔ رئیسہ کے لئے تو گویا کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔ اس کے دل میں جو ایک گمبھیر سناٹا پھیلا رہتا تھا' وہ یہاں آکر بھی برقرار رہا تاہم یہاں دوسرے لوگوں کے معمولات کچھ بدل گئے تھے۔ شمیم اور رقیہ شام ڈھلتے ہی اب بھی بنتی سنورتی تھیں لیکن اب وہ کہیں جاتی نہیں تھیں بلکہ اب آئے دن گھر میں نئے نئے لوگ آنے لگے تھے۔

رئیسہ کی رقص اور گانے کی تربیت اب بھی جاری تھی مگر اب اس میں پہلا سا جوش و خروش نہیں رہا تھا۔ اب اگر کسی دن وہ نہ سیکھنا چاہتی تو کوئی اس پر سختی نہیں کرتا تھا۔ کسی کسی دن سازندے یا خود استاد مکرم ہی غچہ دے جاتے۔

رئیسہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ فریدہ اب سازندوں پر بگڑتی بہت تھی۔ بات بات پر ان کی بے عزتی کرتی اور کبھی کبھی انہیں گھر سے نکل جانے کو بھی کہتی مگر وہ گویا ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے تھے۔ وہ آرام سے کمرے میں قالین پر لیٹے سگریٹ پیتے رہتے اور اگالدانوں میں راکھ جھاڑتے رہتے۔

ایک روز رئیسہ نے فریدہ کو وجاہت چچا سے باتیں کرتے سنا۔ "ہم آج کل زیادہ فائدے میں نہیں جا رہے۔ جو کماتے ہیں تقریباً سارا کا سارا خرچ ہو جاتا ہے۔ میں تو سوچتی ہوں اگر شمیم اور رقیہ نہ ہوتیں تو ہمارا کیا بنتا ؟ دونوں بے چاری بہت محنت کرتی ہیں۔ فلموں میں بھی انہیں ایکسٹرا کے طور پر چھوٹا موٹا کام مل جاتا ہے اور پرائیویٹ دھندا بھی اچھا کر لیتی ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں اب اس چھوٹی کو بھی کام سے لگانا چاہئے۔ فلموں میں چھوٹی لڑکیوں کی بھی تو آخر ضرورت پڑتی رہتی ہے۔"

"ہاں .... ہاں .... کیوں نہیں۔ تجویز تمہاری معقول ہے۔ تم شیخ صاحب سے بات کر کے دیکھو' وہ تمہارے جاننے والے ہیں۔" وجاہت چچا بولے۔

"جاننے والے تو وہ تمہارے بھی ہیں۔" فریدہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"بے شک ۔ مگر تمہاری بات ہی کچھ اور ہے۔" وجاہت چچا ٹھنڈی سانس لے

کر بولے۔ ”ہمارا تو جاننے والا بھی ضرورت پڑنے پر انجان بن جاتا ہے۔ تم سے تو انجانے لوگ بھی باچھیں پھیلا پھیلا کر بات کر سکتے ہیں۔“

”کسی زمانے میں ایسا ہوا کرتا تھا وجاہت حسین! اب وہ زمانے کہاں ....!“ فریدہ نے اپنے خضاب سے رنگے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ارے.... اب بھی تمہاری ابرو کا اشارہ ہماری بات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔“ وجاہت حسین نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہرحال‘ میں بھی بات کر کے دیکھوں گا۔“

یہ وجاہت حسین وہی شخص تھا جسے رئیسہ نے زندگی میں پہلی بار اپنے گاؤں کے قریب فریدہ نامی اس عورت کے ہمراہ آتے دیکھا تھا جسے اب وہ امی کہتی تھی۔ اسے اب جا کر معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی نہیں تھے۔ اس گھر میں رشتوں کا ایک عجیب گورکھ دھندا پھیلا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کا‘ کس سے‘ کیا رشتہ تھا۔ تاہم‘ اب رئیسہ سمجھ دار ہوتی جا رہی تھی۔ فریدہ کی یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی گہرے رشتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی ضرورت تھے۔ ایک ہی عمارت کے در و دیوار تھے۔

اس روز فریدہ اور وجاہت چچا بہت دیر تک بیٹھے اپنے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ رئیسہ اسی کمرے میں تھی۔ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ نہیں آ رہی تھیں۔ باتوں کے دوران وہ دونوں کبھی کبھی پر خیال نظروں سے اسکی جانب دیکھنے لگتے تھے۔ وہ گویا ہر زاویئے سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

اس کے بعد ایک روز صبح ہی صبح فریدہ نے رئیسہ کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ اسے خود کپڑوں پر استری کر کے دی اور اس کے بال بھی خود بنائے۔ بڑے اہتمام سے اسے تیار کرایا پھر اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا کر کہیں چل دی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں امی؟“ رئیسہ نے قدرے تجسس سے پوچھا۔ وہ جب بھی فریدہ کے ساتھ گھر سے نکلتی تھی‘ اسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ

کسی گھٹن زدہ مقبرے سے کھلی فضاؤں میں نکل آئی ہو۔

”ہم اسٹوڈیو جا رہے ہیں۔“ فریدہ نے بڑے پیار سے بتایا پھر بولی۔ ”میں نے پچھلے دنوں تمہیں کئی فلمیں دکھائی تھیں نا؟ جن میں بچوں نے بھی کام کیا تھا؟ میں چاہتی ہوں اس طرح تم بھی فلموں میں کام کیا کرو۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ ناچ گانا سیکھنے سے زیادہ آسان ہے.... دو چار روز میں ہی تم کیمرے کے سامنے ایکٹنگ کرنا سیکھ جاؤ گی۔“

رئیسہ خاموش رہی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد فریدہ بولی۔ ”تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟“

”جی؟ میں کیا جواب دوں؟ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”میرا مطلب ہے .... جس طرح ہم لوگ دن رات گھر میں باتیں کرتے ہیں اس طرح دو چار باتیں تو تم کر ہی سکتی ہو نا؟“ فریدہ نے گویا تصدیق چاہی۔

”معلوم نہیں .....“ اس نے کہا۔ اسے واقعی کچھ معلوم نہیں تھا کہ ایکٹنگ کس طرح ہوتی تھی‘ وہ کہاں جا رہی تھی اور اسے کیا بولنا تھا۔

”خیر.... کوئی بات نہیں۔ وہ لوگ بچوں سے کوئی زیادہ مشکل کام نہیں لیتے۔ شیخ صاحب تو ویسے بھی میرے جاننے والے ہیں۔ وہ تمہیں بڑی محبت سے سب کچھ سمجھا دیں گے۔“ فریدہ نے کچھ بے پروائی سے کہا۔

خاصے لمبے سفر کے بعد وہ ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے ٹیکسی سے اتریں۔ گیٹ پر موٹی موٹی مونچھوں والے ایک خان صاحب ملیشیا کی شلوار قمیض پہنے‘ بغل میں موٹا سا ڈنڈا دبائے ایک اسٹول پر بیٹھے تھے۔ گیٹ آدھا کھلا تھا۔

فریدہ نے خان صاحب کو سلام کیا۔ خان صاحب نے آنکھیں سکیڑ کر اس کا جائزہ لیا گویا یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ وہ کون تھی۔ پھر جیسے انہیں یاد آ گیا اور انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی جبکہ دوسرے بہت سے لوگوں کو انہوں نے روکا ہوا تھا۔

"یہ اسٹوڈیو ہے۔" فریدہ نے اندر پہنچ کر رئیسہ کو بتایا: "ہم لوگ سینما میں جو فلمیں دیکھنے جاتے ہیں نا..... وہ زیادہ تر یہیں بنتی ہیں۔"

رئیسہ نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔ فریدہ اسے جو کچھ بھی بتاتی تھی وہ گویا بڑی سمجھ داری سے اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

اسٹوڈیو کے احاطے میں کافی چہل پہل تھی۔ رئیسہ نے محسوس کیا کہ کئی آدمی اس کی "امی" کی طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائے تھے۔ وہ گویا اسے پہچانتے تھے۔ ایک نوجوان تو سلام کر کے رک ہی گیا اور رئیسہ کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"یہ کون ہے فریدہ بیگم؟ اتنی جلدی کیا تھی اسے اسٹوڈیو لانے کی؟"

"اپنی ہی بچی ہے۔ میں نے اسے ماؤں کی طرح پالا ہے۔" فریدہ نے رئیسہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "اسے شوق ہے فلموں میں کام کرنے کا.... اس لیے لے آئی ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے!" فریدہ کے لہجے میں تیکھا پن آگیا۔

"اپنی کیا مجال کہ اعتراض کریں۔" وہ نوجوان سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی ادا سے جھکتے ہوئے بولا: "ہم تو خادم ہیں۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو یاد کرنا۔"

"تم ہماری کیا خدمت کرو گے چندا!" فریدہ ٹھنڈی سانس لے کر طنزیہ ملائمت سے بولی: "لوگوں کی جو خدمت کر رہے ہو، وہی جاری رکھو پروڈیوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے سوا تم نے ابھی تک سیکھا ہی کیا ہے۔"

"کیا کریں فریدہ بیگم! ہمارے پاس تمہاری طرح سہارے جو نہیں ہیں۔" نوجوان نے بھی اسی کی طرح ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

رئیسہ کو باقی گفتگو سے تو کوئی غرض نہیں تھی لیکن اسے فریدہ کا اپنے بارے میں یہ کہنا بڑا عجیب لگا تھا کہ اسے فلموں میں کام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اس موقع پر بتانا چاہتی تھی کہ اسے فلموں میں کام کرنے کا بالکل شوق نہیں تھا اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ فلموں میں کام کیسے کیا جاتا تھا۔ وہ تو صرف اس لیے چلی آئی تھی کہ "امی" کا حکم تھا۔ اسے ہر کام "امی" کے حکم کے مطابق کرنے کی عادت پڑ چکی تھی مگر وہ

وضاحت نہ کر سکی۔ اسے "امی" کے سامنے بلا اجازت کسی دوسرے سے بات کرنے یا "امی" کی بات کی تردید کرنے کی قطعاً عادت نہیں تھی۔

رئیسہ کا ہاتھ تھامے فریدہ ایک اور چھوٹے گیٹ سے گزر کر اندر پہنچی۔ یہ حصہ ایک بہت بڑے مکان سے مشابہ تھا۔ ایک طرف برآمدہ تھا اور اس کے عقب میں کمروں کی قطاریں تھیں۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اندر کئی کیبن سے بنے ہوئے تھے۔ فریدہ نے ایک کیبن کے ہارڈ بورڈ کے دروازے پر رسمی سے انداز میں دستک دی اور جواب کا انتظار کئے بغیر اندر پہنچ گئی۔ رئیسہ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس میں فرنیچر خوب ٹھنسا ہوا تھا۔ صوفے، میز، کرسیاں، پیڈسٹل فین، ٹین کے گول گول ڈبے، رجسٹر اور نہ جانے کیا کچھ موجود تھا۔ ان چیزوں کے ساتھ کئی آدمی بھی کیبن میں ٹھسے ہوئے تھے۔ سگریٹوں کا کثیف دھواں ہوا میں چکرا رہا تھا۔

میز کے عقب میں ایک بھاری بھر کم سیاہ فام شخص گدے دار اور گھومنے والی کرسی پر نیم دراز تھا۔ وہ کسی بات پر قہقہہ لگا رہا تھا جس کی وجہ سے پان کی پیک اس کی باچھوں سے بہہ نکلی تھی۔ وہ درمیان ہی میں قہقہے کا گلا گھونٹ کر رومال سے منہ صاف کرنے لگا اور وہ شخص جس کی بات پر غالباً اس نے قہقہہ لگایا تھا، بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں جناب! چانس کی بات چھوڑیں۔ آپ اس کا اسکرین ٹسٹ تو لے کر دیکھیں۔ لڑکی کیا ہے.... قیامت ہے قیامت.... ہرنی سی آنکھیں.... مور جیسی چال.... ناگن جیسی زلفیں...."

"ابے کیا پورا چڑیا گھر اس ایک لڑکی میں ہی جمع ہے؟" کسی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

کیبن میں موجود تمام افراد نے قہقہہ لگایا۔ وہ شخص التجائیہ لہجے میں سیاہ فام شخص سے مخاطب ہوا۔ "آپ ایک بار اس کا اسکرین ٹسٹ ضرور لے لیں...."

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک اسے کیبن میں فریدہ اور رئیسہ کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دوسرے لوگ بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سیاہ فام اور بھاری بھرکم شخص ریوالونگ چیئر گھما کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "آؤ... آؤ..... فریدہ بائی ! کیا حال چال ہیں ؟ بڑی مدت بعد دیدار ہوئے ہیں تمہارے ....."

"بائی ...؟" رئیسہ کو اس لفظ کا مطلب و مفہوم معلوم نہیں تھا' اس کے باوجود اسے یہ لفظ عجیب سا لگا۔ گھر میں فریدہ کو دوسری لڑکیاں بھی امی کہہ کر پکارتی تھیں اور مرد "بی بی" یا "بیگم صاحبہ" کہہ کر۔ باہر کی دنیا میں فریدہ کو کس طرح پکارا جاتا تھا' یہ رئیسہ کو آج دھیرے دھیرے پتا چل رہا تھا۔ ایک شخص نے چھوٹے صوفے پر ان کے لئے جگہ خالی کی اور خود اٹھ کر کیبن سے باہر چلا گیا۔ دونوں پھنس پھنسا کر بیٹھ گئیں۔

فریدہ بالوں کا جوڑا ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ "شیخ صاحب ! اب تو آپ بائی جی کا دم چھلا ہمارے نام سے ہٹا دیں ..... اب تو وہ باتیں پرانی ہو گئیں ..... ہماری اس دنیا کے اجڑے زمانے گزر گئے"۔

"اب کچھ ایسے زمانے بھی نہیں بیتے ہیں فریدہ بائی ! " شیخ صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم تو یوں بات کر رہی ہو جیسے صدیاں بیت چکی ہیں اور خواہ صدیاں بھی بیت جائیں ..... ماضی انسان کا کب پیچھا چھوڑتا ہے"۔

کمرے میں موجود دوسرے لوگ کچھ اس طرح واہ واہ کرنے لگے گویا مشاعرے میں کسی اچھے شعر پر داد دے رہے ہوں۔ ان کے قریب بیٹھا ہوا ایک شخص تو تقریباً سر دھنتے ہوئے بولا : "واہ شیخ صاحب ..... واہ ..... ! کیا باریک قسم کی بات کی ہے"۔

ایک اور بولا۔ "شیخ صاحب ! یہ دانشوروں والی بات ہے"۔

شیخ صاحب نے متانت اور بردباری سے مسکرانے پر اکتفا کیا پھر فریدہ سے مخاطب ہوئے : "خیر..... اگر تم کہتی ہو تو ہم تمہیں فریدہ بیگم کہہ لیا کریں گے۔ ہمارا کیا جاتا ہے؟ ہمارا کام ہی لوگوں کا دل پرچانا ہے۔ اپنی زبان سے بھی ..... اور اپنی فلم سے بھی ....."

"زبان تو آپ کی بڑی میٹھی چھری ہے۔ ہم تو اس کے بڑے پرانے گھائل ہیں شیخ صاحب !" فریدہ مسکراتے ہوئے بولی پھر اس نے بڑی ادا سے ہاتھ ہلایا : "خیر..... چھوڑیئے ان باتوں کو میں اس بچی کو لے کر آئی تھی آپ کے پاس ..... دیکھ رہے ہیں؟ کیسی پیاری صورت ہے ..... اور ایکٹنگ کا بہت شوق بھی ہے اسے ....."

اس جھوٹ پر رئیسہ ایک بار پھر کسمسا کر رہ گئی۔ کیا سٹوڈیو کوئی ایسی ہی جگہ تھی جہاں مسلسل جھوٹ بولنا ضروری تھا؟ رئیسہ سوچے بغیر نہ رہ سکی۔

فریدہ بڑے مان سے کہہ رہی تھی۔ "آپ کو اس کے لئے بھی کسی فلم میں جگہ نکالنی پڑے گی"۔

رئیسہ ابھی پورے دس سال کی نہیں ہوئی تھی۔ نظروں کی چبھن کو محسوس کرنے کا دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود جس انداز سے سیاہ فام شیخ صاحب اور دوسرے دو آدمیوں نے اس کا جائزہ لینا شروع کیا' اس سے رئیسہ نے اپنے آپ کو خجل اور شرمندہ سا محسوس کیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور بے مقصد سے انداز میں جوتی فرش پر رگڑنے لگی۔

"یہ ہے کون؟" آخر شیخ صاحب نے اپنا پلپلا سا گال کھجاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"بہن کی بچی ہے۔ بہت چھوٹی عمر میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئی تھی۔ تب سے میں نے ہی ماں بن کر پالا ہے"۔ فریدہ نے بڑے لاڈ بھرے انداز میں رئیسہ کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔

شیخ صاب بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم نے بن ماں باپ کی جتنی بچیوں کو ماں بن کر پالا ہے اس کے صلے میں تو مرنے کے بعد تمہیں سیدھے جنت میں جانا چاہئے"۔

"مرنے کے بعد کون کہاں جاتا ہے ..... یہ تو مرنے کے بعد ہی دیکھا جائے گا شیخ صاحب !" فریدہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "فی الحال تو آپ اس دنیا کی بات کیجئے۔ اس

بچی کی بات کیجئے"۔

شیخ صاحب نے سنجیدہ ہوتے ہوئے ایک بار پھر گویا از سرنو رئیسہ کا جائزہ لیا اور سرسری سے لہجے میں بولے۔ "اس سے پہلے کبھی ذکر نہیں آیا اس کا"۔

"ذکر اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے"۔ فریدہ نے ایک ادائے خاص سے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ بڑی عمدگی سے انہیں ہیئر کلر سے رنگتی رہتی تھی لیکن اس وقت ان کی جڑوں سے سفیدی جھانک رہی تھی۔

"ہاں ..... یہ تو تم نے ٹھیک کہا"۔ شیخ صاحب گہری سانس لے کر کرسی کے پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے: "اس بار تم واقعی بڑے صحیح وقت پر آئی ہو۔ میں اس وقت تھوڑا سا پریشان تھا"۔

"اے ہے ..... خدا نہ کرے جو ہمارے شیخ صاحب پریشان ہوں"۔ فریدہ نے دور سے شیخ صاحب کی بلائیں لیں۔ "ہم کس لئے ہیں؟ حکم کریں۔ کس قسم کی پریشانی ہے؟ ہم زوال کے مارے لوگ ہیں لیکن بہت سے مسئلوں کا حل اب بھی ہمارے پاس ہوتا ہے شیخ صاحب! آپ کبھی آزما کر تو دیکھیں۔ ہم خاندانی لوگ ہیں"۔

"خاندانی ....." شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا لیکن شاید فریدہ کے تاثرات دیکھ کر فوراً" سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے: "نہیں ..... کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے"۔ انہوں نے کرسی کو تھوڑا سا گھمایا: "فلم پروڈکشن تو تمہیں پتا ہی ہے کتنا بڑا دردسر ہے۔ مسئلے مسائل تو اس میں قدم قدم پر سر اٹھاتے رہتے ہیں"۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ "میری دونوں نئی پروڈکشنز میں نگار ہیروئین ہے۔ ان میں سے ایک فلم میں اس کے بچپن کے بھی کچھ سین ہیں۔ ایک بچی میری نظر میں تھی جو نگار کے بچپن کا رول کر سکتی تھی۔ اس نے چند کمرشلز میں کام کیا ہے لیکن میں نے ابھی نہ تو اسے سائن کیا تھا اور نہ ہی باقاعدہ بات کی تھی۔ اب مجھے پتا چلا ہے کہ پچھلے ہفتے وہ ماں بیٹی لاہور سے کراچی چلی گئی ہیں اور وہاں فی الحال کسی کو ان کا اتا پتا معلوم نہیں ہے۔ میں اب نئے سرے سے کسی بچی کی تلاش

شروع کرنے والا تھا"۔

"تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے شیخ صاحب! بچی آپ کے سامنے بیٹھی ہے"۔ فریدہ دبے دبے سے جوش کے ساتھ بولی۔ اس نے ایک بار پھر رئیسہ کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ "پوری انڈسٹری میں نگار ہی ایک ایسی لڑکی ہے جو اسکرین پر ہی نہیں، اصل زندگی میں بھی حسین نظر آتی ہے۔ لڑکی کیا ہے ..... ہیرا ہے ہیرا ..... مجھے بڑی پسند ہے۔ جدن بائی کی بچی ہے۔ جدن بائی کے انتقال کے بعد امیرن بائی اس سے چمٹی ہوئی ہے"۔

"میں تم سے اس کا شجرۂ نسب تھوڑا ہی پوچھ رہا ہوں"۔ شیخ صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ "ہمیں بھلا کیا نہیں معلوم؟ لیکن ہم تو بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اس لئے کسی کے شجرے میں نہیں الجھتے۔ اس طرح کی باتیں زبان پر ہی نہیں لاتے ....."

"میں تو یہ کہنے لگی تھی"۔ فریدہ نے گویا ان کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر اسی جوش و خروش سے سلسلہ کلام جوڑا۔ "کہ نگار جیسی ہیرا لڑکی کے بچپن کا رول کرنے کے لئے آپ کو میری رئیسہ سے اچھی بچی نہیں مل سکتی۔ شاید قدرت ہماری اور آپ کی مدد کر رہی ہے کہ اس بچی کی شکل میں نگار کی شباہت بھی موجود ہے۔ فلم دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے کہ یہ تو سچ مچ نگار کا بچپن لگ رہا ہے"۔

شیخ صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ایک بار پھر شاید نئے زاویہ نگاہ سے رئیسہ کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ سکڑ سمٹ کر فریدہ کے کچھ اور قریب ہو گئی۔

شیخ صاحب ذرا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے: "لیکن ایک بات میں صاف بتا دوں فریدہ با..... میرا مطلب ہے فریدہ بیگم ..... کہ میں نے یہ جو ایمانداری سے تمہیں اپنی مجبوری اور ساری سچویشن بتا دی ہے ..... یہ سن کر کہیں تم پھیل نہ جانا۔ فلم انڈسٹری میں اس طرح ایمانداری سے کوئی اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتا۔ آرٹسٹ کی ضرورت ہوتی ہے تب بھی بے نیازی دکھاتے ہیں۔ سو نخرے دکھاتے ہیں۔ ایک میں

ہی گدھا ہوں جو سیدھی، صاف اور سچی بات کرتا ہے"۔

"آپ کی یہی ادا تو ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے شیخ صاحب! اس لئے سیدھے آپ کے پاس ہی آتے ہیں۔ ہم ہر روز کے چکر کاٹنے والے لوگ نہیں ہیں۔ ہم آپ کی سیدھی، سچی اور صاف باتوں کے قدر دان ہیں"۔ فریدہ بولی۔

"سیدھی، سچی اور صاف بات یہ ہے کہ اگر یہ لڑکی میرے پاس چل گئی تو پیسے میں وہی دیہاڑی کے حساب سے دوں گا جو ایکسٹرا لڑکیوں کو ملتے ہیں۔ مجھ سے کچھ زیادہ لمبی چوڑی امیدیں نہ رکھنا۔ نئی لڑکی ہے۔ اس پر مغز کھپائی بہت کرنی پڑے گی"۔

"آپ سے پیسوں کی بات کس کم بخت نے کی ہے شیخ صاحب! آپ سے ہمیں کچھ بھی نہ ملے ہم تب بھی خوش رہیں گے شیخ صاحب! لیکن ہمیں پتا ہے آپ کسی کا حق رکھ ہی نہیں سکتے۔ کسی کے ساتھ نا انصافی کر ہی نہیں سکتے۔ اس انڈسٹری میں جہاں ہر کوئی دوسرے کی بوٹیاں نوچ رہا ہے اور ہر شخص دوسرے کا حق دبانے کی فکر میں ہے، وہاں آپ جیسے انسانوں کا دم غنیمت ہے۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا نواز بھی رہا ہے۔ آپ پروڈیوسر بھی ہیں، ڈائریکٹر بھی ہیں، اسٹوری رائٹر بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، اسٹوڈیو اونر بھی ہیں۔ اللہ نے اتنا کچھ دیا ہے، اس کے باوجود کوئی نخرہ نہیں ..... کوئی ٹھاٹ باٹ نہیں ..... آج بھی آپ اسی دفتر میں بیٹھے ہیں جہاں سے آپ نے کام شروع کیا تھا۔ بڑے ظرف کی بات ہے"۔

"بندے کی دلداری میں تمہارا جواب نہیں فریدہ بیگم!" شیخ صاحب ہنسے۔ وہ بہت خوش مزاج آدمی معلوم ہوتے تھے۔ بات بات پر ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ اس عادت کی وجہ سے انہیں بار بار رومال سے منہ صاف کرنا پڑتا تھا کیونکہ پیک باچھوں سے رسنے لگتی تھی۔ یک دم ہی وہ سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ اس دوران وہ پر خیال انداز میں انگلیوں سے میز کو کھٹکھٹا رہے تھے۔ فریدہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن انہیں کسی سوچ میں گرفتار دیکھ کر بولنے کا ارادہ ملتوی کر دی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد شیخ صاحب گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولے۔ "فریدہ

بیگم! تم ایسا کرو کہ سترہ تاریخ کو دو بجے اس بچی کو ساتھ لے کر آ جاؤ ..... فلور نمبر پانچ پر میری شفٹ چلے گی۔ جس دوران سیٹ وغیرہ لگ رہا ہو گا، میں اس بچی سے ریہرسل وغیرہ کروا کر دیکھ لوں گا۔ اسے فٹ ورک بھی سمجھانا ہو گا۔ اگر اس نے حوصلے سے کام لیا اور اس میں کچھ "تیز" نظر آیا تو اس کا ایک سین تو شوٹ کر ہی لوں گا۔ میرا خیال ہے اس نے آج تک کیمرہ کا سامنا تو نہیں کیا؟"

"آپ کی مہربانی شامل حال ہو گی تو سب کر لے گی۔" فریدہ بڑی عاجزی سے مسکرائی: "ویسے مجھے آپ تھوڑا بہت سین سمجھا دیں۔ میں بھی اسے گھر پر تھوڑا بہت ذہن نشین کرانے کی کوشش کروں گی"۔

"کہانی پارٹیشن کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔" شیخ صاحب نے سگریٹ سلگا کر طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "بچی مار دھاڑ اور قتل و غارت کے دوران ریلوے اسٹیشن پر ماں سے بچھڑ جاتی ہے۔ باپ پہلے ہی مارا جا چکا ہے۔ دوسرے بہن بھائی بھی بچھڑ جاتے ہیں۔ سب کی کہانیوں کے الگ الگ ٹریک چلتے ہیں۔ آخر میں جاکر بڑے ڈرامائی انداز میں ان کا ملاپ ہوتا ہے۔ ابھی ریلوے اسٹیشن پر شوٹنگ کی تو مجھے تاریخ نہیں مل رہی۔ اسٹوڈیو کی کچھ شفٹیں خالی چل رہی ہیں۔ سوچ رہا ہوں، انہیں میں استعمال کر لوں۔ بچی کے گلیوں میں بھٹکنے کی جو شاٹس ہیں، وہ کہانی میں بعد میں آتے ہیں لیکن میں انہیں پہلے شوٹ کر لوں گا۔ پہلے والے سین بعد میں شوٹ ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سترہ تاریخ کو حاضر ہو جاؤں گی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔"
پھر وہ گویا کام کی بات ختم کرتے ہوئے گپ شپ کے انداز میں بولی: "بہت دن ہو گئے غریبوں کے ڈیرے پر آپ نے چکر نہیں لگایا۔ کبھی ہمیں بھی خدمت کا موقع دیا کریں ..."

"بہت عرصے سے شیڈول بڑا ٹائٹ جا رہا ہے۔ بڑی پریشانیاں ہیں ..... بڑے رپھڑ ہیں۔" شیخ صاحب نے نیا پان منہ میں رکھتے ہوئے اور ایک پان فریدہ کی طرف بڑھاتے

ہوئے کہا۔ ”میں تو آدمی ہی بڑا ڈھیٹ ہوں .... ہر بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہوں،
قسم سے، پاگل ہو جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں فلم لائن میں بس عیش ہی عیش ہیں۔ ایسی
بات نہیں ہے۔ چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں بندے کی .... قسم سے کبھی کبھی تو دل
ہے کہ کپڑے پھاڑ کر جنگلوں کی طرف نکل جائیں۔“

”ہمیں کیا بتا رہے ہیں شیخ صاحب!“ فریدہ لگاوٹ بھرے انداز میں مسکرائی۔
ہم سے بھلا کیا چھپا ہوا ہے۔ البتہ عام لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ اس لائن کے لوگوں
کی کمائی کیسی خون پسینے کی ہے۔“

”بے شک۔ قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے۔“ ایک اور شخص نے تائید میں سر
ہلایا۔ پکی عمر کا وہ ایک منحنی سا شخص تھا اور اب تک خاموشی سے سگریٹ پر سگریٹ
پیے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فریدہ نے اجازت طلب کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ رئیسہ کو ساتھ
لئے وہ اسٹوڈیو سے نکلی تو بہت خوش تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کی طرف جاتے ہوئے
وہ رئیسہ کو اپنے ساتھ لگا کر بھینچتے ہوئے بولی۔ ”آج تو میں گھر جا کر مٹھائی بانٹوں گی۔
تم قسمت کی دھنی معلوم ہوتی ہو۔ لوگ یہاں جوتیاں رگڑتے مر جاتے ہیں، ایک ڈائیلاگ،
ایک سین نہیں ملتا۔ اپنی شمیم اور رقیہ کو ہی دیکھ لو۔ اسٹوڈیو میں سب واقف
کار ہیں مگر ابھی تک، بیچاری ایکسٹرا کی ایکسٹرا ہیں۔ کب سے اسٹوڈیو کی خاک چھان
رہی ہیں۔ مہینے میں دو چار مرتبہ کام مل جاتا ہے تو دو چار سو روپے مل جاتے ہیں۔ ان
میں سے آدھی کمائی ایکسٹرا سپلائر لے جاتا ہے۔ تجھے اس عمر میں ہی کئی سین کا کام مل
رہا ہے۔ پیسے بھی جو ملیں گے، ڈائرکٹ ملیں گے۔ بیچ میں کسی کا حصہ نہیں ہوگا۔ گھر
میں بھی جو سنے گا، دنگ رہ جائے گا....“

رئیسہ بالکل چپ تھی۔ مٹی کے کسی کھلونے کی طرح وہ ساکت بیٹھی تھی۔ وہ
ابھی سے خوفزدہ تھی۔ سترہ تاریخ کو اسے نہ جانے کیا کرنا تھا؟ یہ لوگ اس سے کیا کام
لینا چاہتے تھے؟ یہ اسے اب بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھا۔

سترہ تاریخ کو ٹھیک دو بجے وہ دونوں ایک بار پھر اسٹوڈیو پہنچیں۔ شیخ صاحب خود
دفتر میں نہیں تھے۔ ان کا چیف اسسٹنٹ موجود تھا۔ اس نے ان کے لیے چائے وغیرہ
منگوائی۔ چائے کا دور چل چکا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”شیخ صاحب ذرا دیر سے آئیں
گے، تب تک آپ میرے ساتھ میک اپ روم میں آ جائیں۔ اس لڑکی کا گیٹ اپ
وغیرہ کرنا ہوگا۔ اسے کپڑے بھی اسی زمانے کے حساب سے پہنانے پڑیں گے جس
زمانے کا سین ہے۔“

وہ دونوں اس نوجوان کے ساتھ اس میک اپ روم میں آئیں جو ایکسٹرا لڑکیوں
اور چھوٹے اداکاروں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ کمرا نچلے درجے کی کسی باربر شاپ سے
مشابہ تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ لمبا سا کاؤنٹر لگا ہوا تھا اور دیوار پر تھوڑے تھوڑے
فاصلے سے متعدد آئینے لگے ہوئے تھے۔ ہر آئینے کے سامنے ایک اونچی اور بدوضع سی
کرسی رکھی ہوئی تھی۔

لمبے لمبے بالوں والے ایک سانولے اور لچکتے مٹکتے سے نوجوان نے رئیسہ کو
کرسی پر بٹھا کر اس کے صاف ستھرے چہرے کی لیپا پوتی شروع کر دی۔ دوسری
کرسیوں پر دو تین دوسری عورتوں کا میک اپ کیا جا رہا تھا اور میک اپ مین ان سے
مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔ رئیسہ کو اپنی تمام تر کم عمری کے باوجود ان کی باتیں کچھ
کچھ شرمناک سی لگ رہی تھیں۔ وہ آوازوں کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش
کرتے ہوئے بت بنی بیٹھی رہی۔

میک اپ مکمل ہونے کے بعد اسے خاصی میلی کچیلی سی ایک شلوار قمیض دی
گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ آخر اسے ایک کشادہ گودام نما
ہال میں لے جایا گیا جہاں چھت میں لوہے کی پٹیوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا اور اس جال
میں کہیں کہیں بڑی بڑی لائیٹیں لگی ہوئی تھیں۔

ہال کے ایک حصے میں بغیر گارے یا سیمنٹ کے اینٹیں چن کر دو دیواریں کھڑی
کی گئی تھیں جن کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ دیواروں میں سلاخ دار کھڑکیوں کے

چوکھٹے بھی پھنسائے گئے تھے۔ زیادہ اوپر دیکھے بغیر سرسری سی نظر ڈالنے پر وہ کوئی
معلوم ہوتی تھی۔ فرش پر کچھ کنکر پتھر بھی ڈالے گئے تھے۔

اس وقت تک شیخ صاحب بھی سیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ وہ بڑے پیار سے رئیسہ کو سمجھانے لگے کہ سین کیا تھا' اسے کیا کرنا تھا' کہاں سے چلنا تھا' کہاں کہاں قدم روکنے تھے۔ کس کس طرف دیکھنا تھا اور کیا بولنا تھا۔ سب کچھ انہوں نے خود کرکے دکھایا۔ ریہرسل کے طور پر انہوں نے رئیسہ کو بھی اسی طرح دونوں دیواروں کے درمیان چلنے کے لیے کہا۔ رئیسہ کو ظاہر کرنا تھا کہ وہ گرتی پڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔

شیخ صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کے دوران ایک مرتبہ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھ دیا تو شیخ صاحب چلائے۔ "بھئی دیوار پر زیادہ زور مت ڈالنا۔ کہیں یہ تمہارے اوپر ہی نہ گر پڑے۔"

پھر وہ ایک درخت کا سہارا لینے لگی تو شیخ صاحب نے ہدایت کی۔ "اسے بھی زیادہ زور سے دھکا مت دینا۔ یہ گر جائے گا۔ یہ فرش کے اوپر ہی کھڑا ہے۔"

تب اسے معلوم ہوا کہ کچھ درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں نہیں ہوتی ہیں اور کچھ دیواریں محض دھکا دینے سے گر جاتی ہیں لیکن شاید یہ صرف اسی دنیا کی باتیں تھیں۔ بڑی عجیب سی دنیا تھی یہ ....!

شیخ صاحب گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے فریدہ سے مخاطب ہوئے۔ "میرا خیال ہے میں کیمرا ریہرسل کر ہی لیتا ہوں۔ اگر یہ شاٹ ریہرسل ہی میں اوکے ہو گیا تو کیا کہنے۔ ورنہ مجھے امید ہے کہ دو تین ٹیک میں تو اوکے ہو ہی جائے گا۔"

انہوں نے سیٹ پر موجود دیگر لوگوں کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔ لائٹس آن ہو گئیں۔ مصنوعی گلی کی سیدھ میں چھوٹی سی ریلوے لائن جیسی پٹڑی ڈالی گئی اور کیمرا ٹرالی پر رکھا گیا۔ ایک سیاہ تختی پر فلم کا نام' سین نمبر اور شاٹ نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس کے ذریعے کیمرے کے سامنے کلیپ دی گئی۔

رئیسہ فریم میں آ چکی تھی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ اب اسے کیمرے کے

سامنے سب کچھ کرنا ہوگا تو اس کا گلا خشک ہو گیا۔ کیمرے کا عدسہ اسے کسی عفریت کی آنکھ سے مشابہ محسوس ہونے لگا جو ایک ٹک اسے گھور رہی تھی۔

"ایکشن ....!" شیخ صاحب کی کڑک دار آواز سکوت میں گونجی۔

سب لوگ پر تجسس اور متوقع سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میلے اور پرانے کپڑوں میں اسے اپنا جسم پسینے میں بھیگتا محسوس ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی لائٹس گویا اس پر آگ برسا رہی تھیں۔ سیٹ پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ رئیسہ بالکل خاموش تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی!

ایک لمحے کے لیے گویا اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں تھی اور اسے وہاں کس مقصد کے لیے لایا گیا تھا وہ گویا کوئی خواب دیکھ رہی تھی جس کا سر پیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یا پھر شاید وہ ایک بیکراں سناٹے کے سمندر میں تھی۔

"ایکشن .....!" دفعتاً" شیخ صاحب کی آواز اس سناٹے میں گونجی۔

رئیسہ چونکی اور ایک دم ہی گویا کسی اور دنیا سے اس دنیا میں واپس آ گئی جہاں وہ کھڑی تھی۔ شیخ صاحب نے اسے بہت اچھی طرح سمجھایا تھا کہ لفظ "ایکشن" سننے کے بعد اسے کیا کرنا تھا۔ کس طرف قدم بڑھانا تھا' کہاں تک پہنچ کر رکنا تھا اور پھر کون سا مکالمہ بولنا تھا۔

شیخ صاحب کی ہدایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ گرتی پڑتی آگے بڑھی۔ اسے غم زدہ اور نڈھال نظر آنے کی اداکاری کرنی تھی۔ پھر اس نے جوں ہی اپنی زندگی کا پہلا مکالمہ بولا' اس کے چاروں طرف چھایا ہوا سناٹا گویا کچھ اور گہرا ہو گیا۔ اسے خود بھی یوں لگا جیسے کائنات کی گردش تھم گئی تھی' جیسے کیمرے میں گھومتی ہوئی فلم کی چرخی کی مدھم سی سرسراہٹ بھی معدوم ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تھم گئی تھیں۔

اس کا پہلا مکالمہ تھا: "ماں ...... ماں ...... ! تم کہاں ہو؟"

یہ مکالمہ پہلی بار پڑھنے پر ہی گویا اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ یہ مکالمہ ادا

کرنے کے لئے درحقیقت اسے کسی ریہرسل' کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو ایک پکار تھی جو نہ جانے کب سے اس کے سینے میں مچل رہی تھی اور آج یوں لفظوں کے قالب میں ڈھل گئی تھی گویا پہاڑ کا سینہ چیر کر آبشار پھوٹ نکلا ہو۔

اسے کچھ احساس نہیں تھا کہ اس نے کتنی مرتبہ یہ الفاظ دہرائے .... کب اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں ہوا اور کب اس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ اپنی ماں کو تقریباً" بھول چکی تھی لیکن آج اس نے یہ الفاظ ادا کیے تو گویا کچھ دھندلی دھندلی پرچھائیاں اسے ماضی کے جنگل میں لے گئیں جہاں ایک عورت دیوانہ وار اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

وہ عورت کبھی ادھر بھاگتی تھی' کبھی ادھر۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور اس کا ادھر ادھر دوڑنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اس کے پیروں تلے صحرا کی جھلستی ریت ہو۔ چشم تصور سے رئیسہ اس کا چہرہ صاف طور پر نہیں دیکھ پا رہی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے احساس تھا کہ وہ اس کی اپنی ماں تھی۔

اپنی دانست میں رئیسہ نے ماں کو بلانے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ماں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ رئیسہ کی آواز گویا اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ یونہی دیوانوں کی طرح ادھر ادھر چکراتی آخرکار بہت دور نکل گئی تھی اور اندھیروں نے اسے نگل لیا تھا۔

تبھی رئیسہ پکارتی چلی گئی تھی: "ماں .... ماں .... ! تم کہاں ہو ؟"

وہ اپنے اس کرب ناک خواب سے اس وقت چونکی جب کسی نے اسے گود میں اٹھا کر چومنا شروع کر دیا۔ وہ شیخ صاحب تھے۔ وہ اسے گود ہی میں اٹھائے فریدہ کے پاس لائے اور نہایت مسرور لہجے میں بولے۔ "بھئی اس بچی نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس عمر کی کوئی بچی اتنی خوبصورتی سے یہ شاٹ دے سکتی ہے .... اور وہ بھی پہلی ہی ٹیک میں .... بھئی واہ .... کمال ہے۔! لطف کی بات یہ ہے کہ میں تو اپنے خیال میں کیمرا ریہرسل کر رہا تھا۔ میں نے تو بہت ڈرتے ڈرتے بچی کو کیمرے کے

سامنے کھڑا کیا تھا۔ میں نے تو یہی سوچا تھا کہ سو پچاس فٹ فیتہ ضائع کرنے والی بار ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ایسا خوبصورت شاٹ فلم میں شاید کوئی اور نہ آ سکے ....“ ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

فریدہ بیگم طمانیت سے مسکرائی۔ ”آپ قدر دان ہیں .... اچھی چیز کے ’اچھے ہو کے‘ منہ پر کھل کر تعریف کرتے ہیں۔ آپ کی یہی بات ہمیں پسند ہے۔ آپ دوسروں کی طرح نہیں ہیں کہ فن کارہ کا کام دیکھ کر دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوتے ہیں لیکن ظاہری طور پر سوکھا سا منہ بنا کر کہتے ہیں۔ ”ٹھیک ہے .... خیر میں چلانے کی کوشش کروں گا۔‘ آپ بھلے آدمی ہیں۔ اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتے۔“

ایک اسسٹنٹ آگے بڑھ کر خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ”تجربے کرنے میں شیخ صاحب کا جواب نہیں ..... اور شیخ صاحب کا کوئی تجربہ آج تک ناکام نہیں ہوا۔ یہ تو بچے سے بھی اداکاری کرا لیتے ہیں۔“

رئیسہ اب فریدہ کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں اور دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ شیخ صاحب ایک بار پھر جھک کر اس کا سر چومتے ہوئے بولے۔ ”بھئی یہ بچی تو پیدائشی اداکارہ ہے ... بارن ایکٹریس .... ! میری زندگی فلم لائن میں گزر گئی مگر صرف دوسری مرتبہ میں نے کوئی بارن ایکٹریس دیکھی ہے .... اس سے پہلے صرف انڈیا میں دیکھی تھی جب میں ایک بڑے ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ اس کے بعد آج دیکھی ہے۔“ انہوں نے ایک بار پھر رئیسہ کا کندھا تھپتھپایا اور اسے دوسرا شاٹ سمجھانے لگے۔ اب اسے اسی مصنوعی گلی میں دوسری طرف چلتے ہوئے کم و بیش ویسی ہی اداکاری کرنی تھی۔ سین کے مطابق وہ گویا کسی کو ڈھونڈتی ہوئی چل رہی تھی۔ شیخ صاحب نے اسے اداکاری کر کے بھی دکھائی۔

پھر وہ مشفقانہ لہجے میں بولے۔ ”بیٹا! ایکٹنگ تم کو ویسی ہی کرنی ہے جیسی اس شاٹ میں کی تھی۔“

رئیسہ حیران تھی کہ اس نے کون سی ایکٹنگ کی تھی جس پر اسے اتنی داد مل

رہی تھی اور شیخ صاحب اتنا خوش ہو رہے تھے؟ اپنی دانست میں تو اس نے کوئی اداکاری نہیں کی تھی۔ وہ سب کچھ تو اس سے خودبخود ہوتا چلا گیا تھا۔

دوسرا شاٹ بھی اس نے اسی طرح خواب کے سے عالم میں دے دیا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی مگر شیخ صاحب بہت خوش تھے۔ یہ دیکھ کر رئیسہ کے دل سے شیخ صاحب کا اور کیمرے کا خوف نکل گیا تھا۔ اس نے وہ پورا سین ہی بہت کم وقت میں عکس بند کرا دیا۔ اور بقول شیخ صاحب کے .... ”دس فٹ فیتہ (فلم) بھی ضائع نہیں ہوا۔“ ان کے خیال میں فلم کی تاریخ میں یہ ایک انوکھا واقعہ تھا۔ ایک ریکارڈ تھا۔ وہ فریدہ بیگم کو بتا رہے تھے کہ رئیسہ نے گویا فلمی دنیا کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا تھا۔

رئیسہ کو ان سب باتوں کا مطلب معلوم نہیں تھا لیکن لاشعوری سے انداز میں یہ احساس ضرور تھا کہ آج کا دن اس کے لیے ایک اہم دن تھا۔ آج کے دن اس کے لیے گویا کسی نئی دنیا کے دروازے کھل رہے تھے۔ اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ فلم نگری تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی کیا اہمیت تھی۔ اسے یہ بھی معلووم نہیں تھا کہ لوگوں کے لئے یہ خوابوں کی نگری تھی.... ایک حیرت کدہ تھا... ونڈر لینڈ تھی۔

وہ ابھی چھوٹی تھی۔ بڑی بڑی باتوں سے واقف نہیں تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ لوگ فلمی دنیا کے بارے میں کیا کیا تصورات رکھتے تھے۔ اسے تو بس یوں لگا تھا جیسے یہ بھی دوسری بہت سی جگہوں کی طرح کام کرنے کی کوئی جگہ تھی۔ کوئی بڑی سی ورکشاپ یا کارخانہ وغیرہ تھا‘ جہاں ہر ایک کو محنت و مشقت سے اپنا اپنا کام کرنا ہوتا تھا۔ اسے بھی ایک کام مل گیا تھا۔

وہ سعادت مندی اور لگن سے اپنا کام کرتی رہی۔ اسے یکے بعد دیگرے، کئی فلمیں ملیں۔ ایک چائلڈ اسٹار کے طور پر اس کا نام خاصا مستحکم ہو گیا۔ عام لوگوں میں وہ زیادہ مشہور نہیں تھی مگر کسی بھی کہانی میں اس کے عمر کے حساب سے کوئی کردار نکلتا تھا تو ڈائریکٹر سب سے پہلے اسی کے بارے سوچتے تھے۔

ہدایت کاروں کی نظر میں اس کا کچھ مقام بن چکا تھا۔ دو ایک ہدایت کاروں نے تو بطور خاص مصنفوں سے فرمائش کر کے بھی اس کے لئے کردار لکھوائے کیونکہ وہ اس عمر میں بھی اداکاری کے مشکل مرحلے طے کرنے لگی تھی۔ سچویشن کے مطابق وہ بھی ایسی جذباتی اور رلا دینے والی اداکاری کرتی تھی کہ ڈائریکٹر دنگ رہ جاتا تھا۔

بعض فلم سازوں نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ مظلوم قسم کا بچہ یا بچی فلم بینوں کی ہمدردیاں جیت لیتی تھی۔ ماضی میں چند ایسی مثالیں بھی موجود تھیں کہ کسی مظلوم بچی' بچے یا دو بہن بھائیوں کو بنیاد بنا کر کہانی لکھی گئی' انہیں مرکزی کردار دیئے گئے اور فلم ہٹ ہو گئی۔ چنانچہ فلمی دنیا کی بھیڑ چال والی روایت پر عمل کرتے ہوئے دھڑا دھڑ اسی طرح کی کئی فلمیں بنا ڈالی گئیں اور جب یہ فلمیں بری طرح فلاپ ہونا شروع ہوئیں تب کہیں جا کر اس رجحان کا پیچھا چھوڑا گیا۔

تاہم اب بھی کسی کسی فلم ساز کو اس فارمولے کی یاد ستانے لگتی تھی وہ مصنف سے فرمائش کرتا۔ "یار .... اپنے لطفی صاحب! بھئی اس فلم میں ایک مظلوم قسم کے روتے دھوتے بچے یا بچی کے دو چار سین ضرور ڈال دینا' پبلک بڑا پسند کرتی ہے .... تالیاں بجاتی ہے.... اور لیڈیز اپنے برقعے یا دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہیں .... لہٰذا فلم میں ایک آدھ بچہ ضرور ہونا چاہئے۔"

مصنف کہتا: "مگر.... ملک صاحب! اس کہانی میں تو بچے یا بچی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔"

"نہیں ہے۔ تو کیا ہوا لطفی صاحب! آپ مصنف ہیں' بادشاہ لوگ ہیں' قلم آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ جہاں چاہیں کہانی میں بچہ ڈال سکتے ہیں۔ بھئی ہیرو ہیروئن کا نہ سہی' کسی نوکر وغیرہ کا بچہ یا بچی ڈال سکتے ہیں۔ بچی ہو تو زیادہ اچھا ہے ..... وہ اپنی رئیسہ کو سائن کر لیں گے۔ وہ رونے دھونے کے سین اچھے کر لیتی ہے۔"

دوسرے دن ڈسٹری بیوٹر آ جاتے۔ فلم میں ابتدائی سرمایہ اگر فلم ساز کا لگ رہا ہوتا تھا تو اسے آگے بڑھانے کے لئے عموماً ڈسٹری بیوٹر قسطوں میں رقم فراہم کرنا

شروع کر دیتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی فرمائشیں بھی شروع ہو جاتی تھیں۔ فلم اگر چوتھائی یا آدھی بھی بن چکی ہوتی تھی تب بھی وہ فرمائش داغ سکتا تھا۔ "یار! اس میں صباحت کو ضرور ڈال دیں۔ اس کے نام پر فلم اٹھتی ہے .... پبلک سیٹیاں بجاتی ہے۔"

ہدایت کار کہتا: "مگر صباحت تو صرف رقاصہ ہے۔ ایکٹنگ اسے نہیں آتی۔ ہماری ہیروئن نے رقاصہ کی کمی پوری کر دی ہے۔ سارے ڈانس ہم اس سے کرا لیں گے۔ صباحت کو ہم کس سین میں ڈالیں؟"

"یہ کون سا مشکل کام ہے یار! رائٹر کو بلواؤ' دو لائنیں اور لکھوا کر کلب کا سین ڈال دو۔ آخر ہیرو ہیروئن یا ولن کلب تو جا سکتے ہیں نا؟ ایک گانا لکھوانا پڑے گا اور اپنی صباحت اس میں فٹ ہو جائے گی۔"

"مگر بجٹ بڑھ جائے گا۔" ڈائریکٹر احساس دلاتا۔

"کوئی بات نہیں۔ آخر ہم جو بیٹھے ہیں۔" ڈسٹری بیوٹر سینے پر ہاتھ مار کر فراخ دلی سے کہتا۔

یوں فلم کی تکمیل تک مختلف لوگوں کے مشورے شامل ہوتے ہوتے فلم کا حلیہ کچھ سے کچھ ہو جاتا۔ فلم کی کہانی نہ جانے کیا سے کیا بن جاتی مگر اتنا ضرور ہوتا کہ اس طرح رئیسہ یا رقاصہ .... کسی نہ کسی کے لیے فلموں میں گنجائش نکلتی رہتی۔

رونے دھونے کے مناظر کے سلسلے میں رئیسہ کی کچھ ایسی شہرت ہو گئی تھی کہ ایک اخبار میں تو کسی صحافی نے فلمی تبصرے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

"اندیشہ ہے کہ بے بی رئیسہ اگر اسی رفتار سے روتی دھوتی رہی تو اسے اس عمر میں ہی ملکہ جذبات کا خطاب نہ مل جائے۔"

تاہم یہ درست نہیں تھا کہ وہ صرف المیہ کردار ہی کرتی تھی۔ کئی فلموں میں اس نے ہنستی گاتی' اچھلتی کودتی بچی کے کردار بھی ادا کیے لیکن اس کے یہ کردار لوگوں کو کم ہی یاد رہتے تھے۔

فلموں سے اس کی آمدنی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ کئی کئی ماہ کے وقفے سے کام ملتا تھا اور چائلڈ اسٹار کی اہمیت کچھ ایسی زیادہ محسوس نہیں کی جاتی تھی اس لئے معاوضہ بھی کم ہی ملتا تھا لیکن یہی کیا کم تھا کہ اس نے کم عمری سے ہی کمانا شروع کر دیا تھا۔ فریدہ اس سے بہت خوش تھی' اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اسے اب بھی کیمرے کے سامنے جانے سے پہلے خوف محسوس ہوتا تھا۔ کیمرے کا عدسہ اب بھی اسے کسی عفریت کی آنکھ ہی محسوس ہوتا تھا۔ سیٹ پر جاتے وقت اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے تھے اور وہ بدحواس سی نظر آنے لگتی لیکن جب کیمرا اسٹارٹ ہو جاتا' کلیپ دے دی جاتی تو وہ گویا اپنے آپ کو بھول جاتی۔ وہ بولنا شروع کرتی تو جیسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتی۔ عام طور پر اس کے شاٹ پہلی ہی ٹیک میں اوکے ہو جاتے تھے لیکن اسے خود اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس نے کیسا کام کیا ہے اور کیونکر کیا ہے؟ وہ ایک تنویمی سی حالت میں سب کچھ کر گزرتی تھی۔

دوسری عجیب بات یہ تھی کہ فلموں میں کام تو وہ کیے جا رہی تھی مگر اس میں ابھی تک اس کی اپنی پسند شامل نہیں ہوتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ فریدہ اسے اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جانے کے لیے گھر سے نکلی' تو اس نے احتجاج کیا۔ "میں فلموں میں کام نہیں کروں گی .... مجھے اچھا نہیں لگتا' بہت مشکل بھی لگتا ہے۔"

حالانکہ' اگر اس سے پوچھا جاتا تو وہ وضاحت نہیں کر سکتی تھی کہ یہ کام اسے کیوں اچھا نہیں لگتا تھا اور اس میں اسے کیا مشکل پیش آتی تھی؟ ڈائریکٹر تو کہتے تھے کہ وہ اچھے بھلے مشکل سین بڑی ہیروئنوں سے زیادہ آسانی سے کر جاتی تھی۔

فریدہ نے کبھی اس سے اس بات کی وضاحت نہیں چاہی۔ اس قسم کی بات سنتے ہی اس کے تاثرات بدل جاتے تھے۔ وہ ساری محبت اور نرم خوئی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یک دم کرخت لہجے میں کہتی۔ "کام نہیں کرو گی تو کھانے کو بھی نہیں ملے گا۔ اچھے اچھے کھانے' کپڑا لتا' تعلیم و تربیت' علاج معالجہ .... ان سب کاموں کے لیے پیسہ

چاہیے ہوتا ہے۔ بے شمار ایسے خرچے بھی ہیں جن کا تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔ سب مل کر نہیں کمائیں گے تو یہ خرچے کیسے چلیں گے؟"

کم عمر ہونے کے باوجود یہ سب کے مل کر کمانے والی بات رئیسہ کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس نے آج تک شمیم' رقیہ اور اپنے سوا کسی کو کما کر لاتے نہیں دیکھا تھا۔ دو تین افراد دن رات پڑے صرف اینڈتے ہی تھے۔ رئیسہ کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ ان کا مصرف کیا تھا۔ فریدہ اور استاد مکرم وغیرہ کے بارے میں تو وہ کہہ سکتی تھی کہ وہ کمانے والیوں کی کسی حد تک مدد کرتے تھے' ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ مگر یہ سب بڑی بڑی باتیں تھیں' اور رئیسہ میں بڑی بڑی تو کیا' چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ ہتھیار ڈال دیتی' خاموش ہو جاتی۔

اس نے فریدہ کے ساتھ اسٹوڈیو کے پروجیکشن روم میں اپنی کئی فلمیں تیاری کے دوران دیکھیں۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ پردے پر جو لڑکی ہنستی گاتی' روتی سسکتی' اچھلتی کودتی یا پھر چھوٹے منہ سے بڑی بڑی باتیں کرتی نظر آتی تھی' وہ اس کا اپنا ہی عکس تھا۔ اپنے بارے میں تو اب بھی اس کا یہی خیال تھا کہ اسے یہ سب کچھ کرنا نہیں آتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیمرے کے سامنے کس طرح کر گزرتی تھی!

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ پھر اسے کام ملنا تقریباً" بند ہو گیا کیونکہ وہ لڑکپن اور آغاز شباب کے درمیان ایک عجیب مقام پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ چائلڈ اسٹار کے طور پر وہ جچتی نہیں تھی اور جوان لڑکیوں والے کرداروں میں اسے لیا نہیں جا سکتا تھا۔ مشکل سے ہی کسی فلم میں اس کی عمر کی مناسبت سے اس کے لیے کوئی کردار نکلتا تھا۔

اس کی ذات سے فریدہ کو جو مالی فائدہ حاصل ہوتا تھا وہ برائے نام رہ گیا تو فریدہ کے رویئے میں ایک بار پھر کھردرا پن سا آنے لگا۔ رئیسہ کو اب فریدہ عجیب سی عورت لگنے لگی تھی جس کے ہاتھ میں روپیہ آتا تھا تو اس کے دل سے محبتوں کے آبشار پھوٹنے لگتے تھے۔ ادھر [illegible] رکتی تھی' ادھر اس کے دل میں جذبوں کے سوتے خشک

ہو جاتے تھے اور حقارت و نفرت کا آتش فشاں دہکنے لگتا تھا۔ بچپن میں رئیسہ نے بعض کہانیوں میں کسی دیو یا چڑیل کے بارے میں پڑھا تھا کہ ان کی جان کسی طوطے مینا میں ہوتی تھی۔ فریدہ کی جان روپے پیسے میں تھی۔۔۔!

مزید چند سال رئیسہ نے اسی بے کیفی و بد دلی میں گزارے۔ کبھی محبت، کبھی نفرت، کبھی عزت، کبھی تحقیر، کبھی سرد مہری، کبھی پذیرائی۔ فریدہ کی طرف سے اسے متضاد جذبوں کا سامنا رہا۔ وہ گویا سمندر کی کسی آوارہ موج کے دوش پر تھی۔ کبھی ڈوبتی، کبھی ابھرتی۔

اس دوران اس نے اکا دکا فلموں میں کام کیا۔ پھر شہر شباب میں قدم رکھنے کے بعد بھی اس کے روز و شب کچھ گفتنی، کچھ ناگفتنی گزرے۔ وہ اپنے محسوسات کا پشتارہ کندھے پر لادے، زندگی کے ساحل پر خاموشی سے گھسٹتی رہی۔

رات کو بستر پر لیٹ کر وہ جاگتی آنکھوں سے عجیب عجیب خوابوں کے تانے بانے بنتی۔ کبھی کبھی اسے اس چار دیواری کی دنیا بڑی متعفن اور غلیظ محسوس ہوتی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ وہاں سے نکل بھاگنے کا سوچنے لگتی مگر پھر شیر خان اور احسان علی کے خوف ناک چہرے اس کے تصور میں ابھر آتے۔ بچپن سے ان کا خوف رئیسہ کے ذہن میں بیٹھا ہوا تھا اور بچپن کے نقوش مٹائے، نہیں مٹتے تھے۔

ان دونوں ہی کا کیا ذکر.... رئیسہ کو صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ فریدہ کے اشاروں پر ناچنے والوں کی تعداد کتنی تھی اور وہ کہاں کہاں پائے جاتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس گھر سے فرار تو ایک گناہ سے کم نہیں سمجھا جائے گا اور اس گھر کے قاعدے قانون میں یہ گناہ ناقابل معافی تھا۔

اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیسے کیسے خوف اس کے لاشعور میں پنجے گاڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ فریدہ کی سرپرستی میں آنے کے بعد اس نے جہاں اور بہت کچھ سیکھا تھا وہاں قدم قدم پر خوفزدہ رہنا بھی سیکھا تھا لیکن سچی بات یہ تھی کہ وہ قدم قدم پر فریدہ کی ضرورت بھی محسوس کرتی تھی۔ غیر محسوس سے انداز میں فریدہ نے مکمل طور پر

اسے اپنی محتاج بنا لیا تھا۔

اب تو فریدہ ہی اس کا سب کچھ تھی۔ باقی سب نقوش اس کے ذہن میں بہت دھندلا گئے تھے۔ اسے اب شاذ و نادر ہی یہ بات یاد آتی تھی کہ وہ فریدہ کی بیٹی نہیں تھی۔ ماں کا چہرہ، گاؤں کی گلیاں، درختوں کے جھنڈ اور تتلیوں کی اڑان.... سب کچھ اس کے ذہن میں بہت دھندلا گیا تھا۔ اگر کبھی یہ پرچھائیاں روشن بھی ہوتیں تو اس کے سینے میں جیسے کوئی ناسور رسنے لگتا۔ اس لئے وہ ان نہاں خانوں کے کواڑ کھولتی ہی نہیں تھی جن کے پیچھے اذیت کا ایک جہان آباد تھا۔

اسے یہ بھی خیال آتا کہ وہ جا بھی کہاں سکتی تھی؟ وہ سوچتی کہ شاید باہر کی دنیا اس سے بھی بری ہو۔ دنیا کے بارے میں اس کا مشاہدہ اور تجربہ بھی تو بہت محدود تھا۔ بلکہ اس کے خیال میں تو دنیا ہی بہت محدود تھی اس نے دنیا کو صرف وہیں تک دیکھا تھا جہاں تک فریدہ نے اجازت دی تھی۔!

وہ سوچتی کہ جسے راستے نہ آتے ہوں، وہ گڑھے سے نکل کر دلدل میں بھی تو گر سکتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچ کر وہ تکیے میں منہ چھپا کر سونے کی کوشش کرنے لگتی اور اسے صحیح طور پر احساس بھی نہ ہوتا کہ کب اس کا تکیہ آنسوؤں سے نم ہو گیا ہے۔



وہ عمر کے اٹھارہویں سال میں تھی، جب ایک روز اپنے کمرے کی سلاخ دار کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اس نے ایک لمبی سی خوبصورت کار کو مکان کے گیٹ پر رکتے دیکھا۔

وہ کبھی کبھی فریدہ سے چوری چوری، جاگتی آنکھوں سے ایک خواب بھی دیکھا کرتی تھی۔ چوری چوری اس لیے کہ اسے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ فریدہ اس سے یہ خواب چھین لے گی، چرا لے گی یا پھر اس پر خفا ہو گی۔ اس خواب میں ایک شہزادہ ہوتا تھا جو اس سے کہتا تھا کہ وہ اس کے لئے اپنے دامن میں ڈھیر ساری خوشیاں اور محبتیں لایا ہے، جو وہ اس کی جھولی میں ڈال دے گا اور اس کی ساری اداسی اور تنہائی اپنے

دامن میں سمیٹ لے گا.... مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس خواب میں رئیسہ کو اس شہزادے کا چہرہ کبھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی صورت ہمیشہ دھندلائی دھندلائی اور ہر بار کچھ مختلف سی دکھائی دیتی۔

اس کے گھر کے دروازے پر جب وہ لمبی سی کار آکر رکی تو نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے اسے گمان گزرا کہ شاید اس گاڑی سے اس کے خوابوں کا شہزادہ اترے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گاڑی سے ایک باوردی ڈرائیور اترا اور اس نے لپک کر پچھلا دروازہ کھولا۔

کار سے اترنے والا دوسرا شخص بھی اس کے خوابوں کا شہزادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں وہ ایک لمبا تڑنگا مگر عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کے بال برف کی طرح سفید اور اس کے سر کے چاروں طرف جھالر کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ درمیان سے اس کا سر گنجا اور چمک دار تھا۔ اس کے کندھے چوڑے لیکن کچھ جھکے جھکے سے تھے، تاہم اس کی حرکات و سکنات میں نوجوانوں سے زیادہ تیزی و مستعدی تھی۔

اس نے تنقیدی سی نظر سے مکان کا جائزہ لیا، نمبر وغیرہ دیکھا پھر سر ہلا کر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر کال بیل بجائی اور وہ شخص خود گاڑی سے ٹیک لگا کر پائپ کے کش لینے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ گلی میں کھلنے والی ایک چھوٹی سی کھڑکی کے ایک پٹ کی اوٹ سے ایک لڑکی اسے دیکھ رہی تھی۔

رئیسہ اپنے کمرے کے دروازے سے اپنے گھر کے صحن کا منظر بھی دیکھ سکتی تھی۔ اس نے استاد مکرم کو اندر سے آتے اور گیٹ کھولتے دیکھا۔ دراز قد اجنبی کو دیکھ کر استاد مکرم ایک لمحے کے لیے تو بھونچکا سے رہ گئے۔ پھر مسکراتے ہوئے نہایت عاجزانہ انداز میں آگے بڑھے اور جھک کر اس شخص کے ہاتھ چومتے ہوئے آنکھوں سے لگانے لگے۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ استاد مکرم اسے اچھی طرح جانتے تھے اور وہ کوئی خاص ہی آدمی تھا۔ کسی عام آدمی سے تو استاد مکرم اس طرح ہرگز نہیں مل سکتے تھے۔ مختلف

لوگوں سے ان کے ملنے کے انداز مختلف تھے۔

"آج تو ہمارے مقدر کھل گئے ہیں۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔" استاد مکرم نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ خود ہمارے گھر تشریف لائیں گے۔ ہم نے برسوں اسٹوڈیوز کی خاک چھانی، آپ کے اپنے اسٹوڈیو میں بھی کافی وقت برباد کیا مگر بس دور دور سے ہی آپ کے درشن ہوئے، کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔"

دراز قد اجنبی کی کشادہ پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئی اور وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے ڈرامائی انداز میں انگلی اٹھا کر استاد مکرم کے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے تم استاد مکرم ہو؟"

استاد مکرم کچھ اور بچھ گئے۔ عاجزی سے بولے: "حضور! یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ ہم جیسوں سے ملے بغیر آپ ہمارے نام سے واقف ہیں۔"

"بھئی میں جن لوگوں سے ملنے کے لیے روانہ ہوتا ہوں۔ ان کے بارے میں پوری معلومات کر کے چلتا ہوں۔" سفید بالوں والا اجنبی بولا۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" استاد مکرم بولے اور اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر اندر لانے لگے۔ "چلئے نا، یوں اس گلی میں کھڑے ہونا آپ کے شایان شان نہیں۔ غریب خانے کو رونق بخشئے، اس کی وقعت بڑھائیے۔"

دراز قد اجنبی گویا استاد مکرم کے انداز گفتگو سے محظوظ ہوتے ہوئے دھیرے سے ہنسا اور اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ رئیسہ اب دروازے کے پٹ کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ استاد مکرم، مہمان کو دوسری طرف ڈرائنگ روم میں لے جانے کے بجائے برآمدے ہی میں لیے کھڑے تھے اور مسرت بھرے انداز میں "تقریباً" چلا رہے تھے۔

"فریدہ بیگم! باہر آؤ.... ذرا دیکھو تو سہی ہمارے گھر کون آیا ہے۔ ارے بھئی، مٹھائی تقسیم کراؤ، آج تو ہمارے نصیب جاگ اٹھے ہیں۔ رازی صاحب آئے ہیں۔"

رازی صاحب کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ان کا ایک ہاتھ استاد مکرم کے ہاتھوں میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ نہایت پرسکون انداز میں پائپ کے کش لے رہے تھے۔ انہوں نے اب بھی دروازے کے عقب سے جھانکتی رئیسہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

فریدہ اپنے کمرے سے گرتی پڑتی باہر آئی۔ کچھ عرصے سے وہ کافی موٹی ہو گئی تھی اور کسی معاملے میں جلد بازی کی کوشش کرتی تھی تو اس سے اپنا تھل تھل کرتا جسم مشکل سے سنبھلتا تھا۔ رازی صاحب کو یقیناً وہ بھی پہچانتی تھی کیونکہ انہیں دیکھ کر اس کی باچھیں بھی مشینی انداز میں پھیل گئی تھیں اور اس نے بھی خوشامدانہ انداز میں رازی صاحب کو سلام کیا تھا۔

استاد مکرم بولے۔ ”میں رازی صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتا ہوں۔“

”استاد جی! ڈرائنگ روم میں تو مہمانوں کو بٹھایا جاتا ہے‘ جن سے کوئی تکلف ہوتا ہے۔ رازی صاحب سے بھلا کیا تکلف؟ یہ تو ہمارے اپنے ہیں۔ انہیں یہیں برآمدے میں کھلی ہوا میں بٹھاؤ نا۔“ فریدہ نے بڑی ادا سے کہا اور برآمدے میں پڑی میز کرسیوں کی طرف اشارہ کیا: ”انہیں گھر جیسے ماحول کا احساس ہونا چاہئے۔ ہمارے لئے تو رازی صاحب عزیزوں کی طرح ہیں۔“

حقیقت یہ تھی کہ استاد مکرم اور فریدہ دونوں کسی حد تک بدحواس تھے۔ وہ رازی صاحب کے قدموں میں بچھے جا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رازی صاحب کو کہاں بٹھائیں۔ تاہم وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی بدحواسی کو چھپا رہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ رازی صاحب واقعی ان کے ہاں آئے تھے۔

فریدہ کی بات سن کر رازی صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کا پرتو نظر آیا اور وہ شگفتہ لہجے میں بولے۔ ”بھئی مجھے اپنے عزیزوں میں شمار مت کرو۔ میں ایک معزز سید خاندان کا فرد ہوں۔ بے شک فلم لائن میں آگیا ہوں‘ لیکن عزت سادات ابھی برقرار ہے۔“

فریدہ کھسیانی ہوئے بغیر بولی۔ ”ہم بھی آپ کو فلم لائن ہی کے حوالے سے اپنا آدمی کہہ رہے ہیں۔ خاندان یا ذات برادری کے حوالے سے نہیں۔“

رازی صاحب برآمدے میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے اور اسی لمحے ان کی نظر رئیسہ پر پڑی جو اس وقت تک دروازے کی اوٹ سے نکل آئی تھی اور چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ رازی صاحب نے نہایت ہی گہری نظر سے رئیسہ کا سرتاپا جائزہ لیا۔ رئیسہ نے محسوس کیا کہ وہ اسے پہچانتے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے‘ فریدہ نے ان کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے رئیسہ کی طرف دیکھا اور مربیانہ لہجے میں بولی۔ ”اری پگلی! وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟ یہاں آ کر بیٹھ‘ رازی صاحب کو سلام کر.... یہ تو پارس ہیں‘ پارس.... پتھر سے چھو جائیں تو اسے سونا بنا دیتے ہیں۔“

بظاہر یہ بات بڑے میٹھے اور مشفقانہ لہجے میں کی جا رہی تھی لیکن رئیسہ کو معلوم تھا کہ اس کی تہ میں ایک کھردرا حکم پوشیدہ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی اور رازی صاحب کو سلام کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رازی صاحب اس کا جائزہ لیتے ہوئے گویا کہیں کھو گئے اور چند لمحے بعد خود کلامی کے سے انداز میں بولے: ”بالکل ویسی.... جیسی میں سوچ کر آیا تھا....“

پھر فریدہ سے مخاطب ہوئے۔ ”تمہاری یہ بچی بہت خوبصورت نکلی ہے۔ اس کی شخصیت مقناطیسی ہے..... اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی آنکھوں میں بڑا ایکسپریشن ہے جو ہمارے ہاں کی بڑی بڑی اداکاراؤں میں نہیں ملتا۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اس کا مقدر ابھی سو رہا ہے۔“ فریدہ نے نہ جانے کس سے شکوہ کیا۔ ”میں اسے لے کر کئی ڈائریکٹروں‘ پروڈیوسروں کے پاس گئی۔ سب بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں‘ تخلیئے میں بلاتے ہیں‘ بڑا رول دینے کی کوئی بات نہیں کرتا۔ سب وعدہ کرتے ہیں‘ ہیروئن بنا دیں گے مگر جھوٹ ان کی شکلوں پر لکھا ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے دو چار ڈائی لاگ سے زیادہ کا رول نہیں دیں گے۔ اس لیے

میں تو کچھ دنوں سے اس کو گھر میں چھپا کر بیٹھ گئی ہوں اور معاملہ میں نے قسمت پر چھوڑ دیا ہے۔"

"تو پھر سمجھ لو کہ قسمت خود چل کر تمہارے دروازے پر آ گئی ہے۔" رازی صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

"کیا مطلب ؟" فریدہ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں رئیسہ کو اپنی فلم میں ہیروئن کے طور پر سائن کرنے آیا ہوں۔" رازی صاحب قدرے ڈرامائی انداز میں بولے۔

ایک لمحے کے لئے ماحول پر گہرا سکوت چھا گیا۔ فریدہ ایک گھاگ عورت تھی۔ اس نے فوری طور پر خوشی یا جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا۔ پھر اس نے معنی خیز نظروں سے استاد مکرم کی طرف دیکھا۔ استاد مکرم پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رازی صاحب اس وقت اسٹیل کے چھوٹے سے پائپ کلینر سے اپنا پائپ صاف کرنے لگے تھے۔

آخر فریدہ مجروح سے لہجے میں بولی : "جب سے رئیسہ جوان ہوئی ہے' اسے ہیروئن بنانے کے وعدے تو کئی پروڈیوسروں نے کیے مگر......"

"کیا تم مجھے بھی جھوٹے وعدے کرنے والے پروڈیوسروں میں شمار کرتی ہو؟" رازی صاحب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بظاہر بڑی ملائمت سے پوچھا۔

فریدہ گڑبڑا گئی۔ "نہیں ..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ کہنے لگی تھی ...."

رازی صاحب نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی اور جارحانہ سے لہجے میں بولے :

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کوئی شوقیہ یا فصلی بٹیرا قسم کا پروڈیوسر نہیں ہوں' جو باپ کے انتقال کے بعد پانچ سات لاکھ روپے لے کر انڈسٹری میں آ گیا ہو

اور نئی لڑکیوں کو ہیروئن بنانے کے جھانسے دے کر اپنے روز و شب رنگین بنا رہا ہو۔ میرے بال اسی انڈسٹری میں سفید ہوئے ہیں۔ چالیس پچاس کامیاب فلمیں مارکیٹ کو دے چکا ہوں۔ دس فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کی ہے۔ اسٹوڈیو میرا اپنا ہے۔ میں نے اس انڈسٹری کو چھ نئے چہرے دیئے ہیں جو آج سپر اسٹارز ہیں۔"

"میں وہ نہیں کہنے لگی تھی جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" فریدہ جلدی سے بولی۔ شاید اسے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ رازی صاحب برا نہ مان جائیں۔ "آپ کی بات پر شک کرنے کی جرات بھلا کون بدبخت کر سکتا ہے۔ ہمیں آپ سے واسطہ نہیں رہا' مگر یہ تو معلوم ہے کہ آپ کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ ہمیں تو ابھی تک یہی یقین نہیں آ رہا کہ آپ اتنی بڑی خوشخبری لے کر ہمارے گھر تشریف لائے ہیں۔ میں تو اصل میں یہ پوچھنے لگی تھی کہ کیا یہ بچی آپ جیسے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی امیدوں پر پوری بھی اتر سکے گی ؟"

"ہاں ..... اس سلسلے میں مجھے ذرا شک ہے۔" رازی صاحب نے ذرا ٹھنڈا پڑتے ہوئے' گہری سانس لے کر کرسی کی پشتے سے ٹیک لگا لی۔ "مانا کہ اس کا بچپن کیمرے کے سامنے گزرا ہے لیکن میرے خیال میں یہ اب بھی ایک ناتراشیدہ ہیرا ہے جسے کسی ماہر جوہری کی ضرورت ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ میں وہ جوہری ثابت ہو سکوں۔"

"ہماری اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے ؟" فریدہ لجاجت سے بولی۔

پائپ کا ایک طویل کش لے کر وہ گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولے۔

"میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ لوگ فلمی دنیا کو جھوٹ کی منڈی کہتے ہیں لیکن میں اسی منڈی میں بیٹھ کر سچ بولتا ہوں۔ چاہے مجھے اس کی وجہ سے نقصان ہی اٹھانا پڑے۔ میں تمہیں یہ بھی سچ سچ بتادوں گا کہ میں رئیسہ کو سائن کرنے کیوں آیا ہوں۔ ویسے بھی یہ بات جلد یا بدیر تمہیں معلوم ہو ہی جانی ہے۔ اس لئے میں خود ہی کیوں نہ بتادوں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس فلم کے لئے نینا کو سائن کیا تھا۔"

نینا اس وقت فلمی دنیا کی سب سے کم عمر ہیروئن تھی اور سپرہٹ جا رہی تھی۔

اس کے پاس اتنی فلمیں تھیں کہ اسے سونے کے لیے بھی مشکل سے وقت میسر آتا تھا۔ اپنی ہر فلم کی کامیابی کے بعد وہ اپنا معاوضہ بڑھا دیتی تھی۔ اسے فلمی دنیا میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اس کی وجہ سے تین چار جمی ہوئی ہیروئنوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ ہر فلم ساز و ہدایت کار اسی کے پیچھے دوڑتا نظر آتا تھا۔

رازی صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "فریدہ بیگم! تمہیں تو معلوم ہی ہے .... چھوٹے بڑے تمام اداکار خواہ انہوں نے کبھی میری فلم میں کام کیا ہو یا نہ کیا ہو' میری عزت ضرور کرتے ہیں اور اگر میں ان کے پاس کسی کام کے سلسلے میں چلا جاؤں تو وہ مجھے دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ میری بات مانتے ہیں۔ میرے سامنے انکار نہیں کرتے۔"

"بے شک .... بے شک ...." استاد مکرم نے ٹکڑا لگایا: "فلم ٹریڈ میں آپ کا ایک الگ ہی مقام ہے۔"

رازی صاحب نے ایک کش لے کر سلسلہ کلام جوڑا۔ "مانا کہ نینا میری دریافت نہیں ہے لیکن انڈسٹری میں یہ بات سب مانتے ہیں کہ آج وہ جس مقام پر ہے' میری ہی وجہ سے ہے۔ اس کی پہلی دونوں فلمیں ڈبا تھیں۔ یہاں تو کسی نئے ایکٹر یا ایکٹریس کی پہلی ایک فلم بھی ناکام ہو جائے تو انڈسٹری والے اسے کچرے کی طرح اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں لیکن میں نے اس کی پہلی دو ناکام فلموں کے باوجود اسے اپنی فلم میں سائن کیا اور وہ فلم ہٹ ہوئی۔ وہیں سے اس کی کامیابی کا سفر شروع ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس کی اچھی شکل اور کم عمری کے باوجود کوئی اسے نہیں پوچھ رہا تھا۔"

استاد مکرم اور فریدہ بڑے تواتر سے رازی صاحب کی تائید میں سرہلا رہے تھے۔ وجاہت اس وقت گھر پر نہیں تھا' ورنہ شاید سرہلانے کے لئے وہ بھی موجود ہوتا!

رازی صاحب کے لہجے میں ذرا تندی آ چلی تھی۔ "میرے سامنے وہ کل کی بچی تھی اور اس میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی.... سوائے اس کے کہ وہ کم عمر تھی اور ایک فریش چہرے کی مالک تھی.... مگر میں نے اسے ہر طرح سے عزت دی۔ زیادہ ریٹ پر کاسٹ کیا۔ جب کہ دوسرے بڑے سے بڑے اداکار بھی میرے لئے کام کرنا ایک اعزاز سمجھتے ہیں اور دوسروں کی نسبت مجھ سے کم معاوضہ لیتے ہیں۔ غرضیکہ میں نے عادت نہ ہوتے ہوئے بھی نینا کے نخرے اٹھائے۔"

"اسے تو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے تھا۔" فریدہ سرہلاتے ہوئے بولی۔

"اس نے اپنی قسمت پر ناز نہیں کیا .... اس نے میری ناک میں دم کیا۔ اس وقت وہ واقعی اپنے آپ کو الزبتھ ٹیلر سے کم نہیں سمجھ رہی۔ میری نئی فلم کے سلسلے میں اس نے مجھے شروع سے ہی پریشان کیا۔ کبھی ڈیٹ دے کر شوٹنگ پر نہیں پہنچی۔ کبھی کسی اچھے قسم کے پروڈیوسر کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے مری چلی گئی۔ وہاں سے دو ہفتے تک واپس نہیں آئی۔ پھر بقول اس کے .... اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ غرض یہ کہ یہی چکر چلتا رہا۔ ایک مرتبہ تو میرا ساٹھ ہزار کی لاگت سے بنایا ہوا سیٹ اس کی وجہ سے ٹوٹا۔ وہ تو شکر ہے اسٹوڈیو اپنا تھا ورنہ پتا نہیں شفٹوں کا کرایہ کتنا پڑ چکا ہوتا۔ تین مرتبہ مجھے شوٹنگ کے بغیر تمام یونٹ والوں کو پیسے دینے پڑے کیونکہ ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کوفت الگ ہوئی۔ دوسرے اداکاروں کا وقت بھی خراب ہوا۔ انہوں نے بھی بڑبڑ کی۔"

رازی صاحب سانس لینے کے لیے رکے' پھر تیز لہجے میں بولے۔ "موصوفہ کو بہت ڈھونڈنے پر پتا چلا کہ وہ تو اس وقت چترال میں تشریف فرما ہیں۔ جب میں اس کے پیچھے وہاں پہنچا تو ظاہر ہے میری کھوپڑی گھومی ہوئی تھی۔ اس نے شرمندہ ہونے اور میری برہمی کو برداشت کرنے کے بجائے ساری وصول شدہ رقم واپس کر دی اور کانٹریکٹ کینسل کر دیا۔ اپنے وقت کی کسی بڑی سے بڑی اسٹار نے میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ تب سے میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی

ہے۔"

"آگ لگنے والی بات ہی ہے جی !" فریدہ متاسفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ کوئی آپ کے ساتھ بھی ایسا کر سکتا ہے۔"

"بس .... ہم فلم انڈسٹری میں یہی دن دیکھنے کے لیے تو زندہ تھے۔"

رازی صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "نئی نسل بہت جلدی میں ہے۔ کم وقت میں نہ جانے کیا سے کیا کر گزرنا چاہتی ہے۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ زیادہ تیز چلنے سے انسان منہ کے بل بھی گر سکتا ہے۔ ہمیں کسی کی ذاتی زندگی سے غرض نہیں ... ظاہر ہے کہ فلم انڈسٹری میں سب پارسا ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے لیکن بہرحال یہ کاروبار کی جگہ ہے۔ اس کے اپنے کچھ اصول' اپنی کچھ اخلاقیات ہیں۔ اس لڑکی نینا کو اس وقت اپنی فلمی مصروفیات سے ہی سر کھجانے کی فرصت نہیں .... اور صرف فلم کی کمائی کے انبار ہی کچھ کم نہیں ہیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں' اسے انڈسٹری میں آئے ہوئے .... لیکن بہترین کوٹھی میں رہ رہی ہے.... پندرہ لاکھ کی کار میں گھوم رہی ہے۔ اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ کوئی ڈائمنڈز کی جیولری کا سیٹ پیش کر دے تو اس کے ساتھ مری گھومنے چلی جاتی ہے۔ کسی کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام بن جائے تو دبئی چلی جاتی ہے اور وہ فلمیں .... جن کی وجہ سے اسے یہ مقام اور اہمیت حاصل ہے .... انہیں بیچ میں لٹکتا چھوڑ جاتی ہے۔"

فریدہ بھی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "بس رازی صاحب .... ! خاندانی لوگ آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ انڈسٹری پر فصلی بٹیروں کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔ لالچ نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے کسی معاملے میں کسی کو دید لحاظ اور شرم تو رہی نہیں۔ مگر ہمارا تو آپ کو پتا ہی ہے .....

اس سے پہلے کہ فریدہ اپنے خاندانی پس منظر کی تفصیل شروع کرتی' رازی صاحب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "نینا نے جس دن یک طرفہ طور پر کانٹریکٹ کینسل کیا' میں نے اسی دن عہد کر لیا تھا کہ اس فلم میں اب یا تو کوئی بالکل

ہی نیا چہرہ انٹروڈیوس کرواؤں گا..... یا پھر وہ فلمی دنیا کی کوئی ایسی لڑکی ہوگی جسے ہیروئن بنانے کا آج تک کسی کو خیال نہیں آیا ہوگا۔"

"بالکل صحیح فیصلہ کیا آپ نے رازی صاحب !" فریدہ پر زور انداز میں بولی۔ اس کے چہرے پر امید کی چمک گہری ہو گئی۔

رازی صاحب نے پائپ ایش ٹرے میں جھاڑ کر اس میں دوبارہ تمباکو بھرا۔ سکوت کے ان مختصر لمحات میں فریدہ اور استاد مکرم نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا۔ رازی صاحب نے پائپ کو ایک ایسے لائٹر سے شعلہ دکھایا۔ جو پائپ ہی سلگانے کے لیے مخصوص تھا۔ ایک طویل کش لے کر انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "میں نے اس سلسلے میں کئی لڑکیوں کو بلوایا' کئی سے خود جا کر ملا لیکن بات کچھ بنتی نظر نہیں آئی۔ کہانی میں لڑکی کی جو شخصیت بنتی ہے اس پر کوئی پوری نہیں اتری اس کے لئے ایک خالص مشرقی چہرے والی ٹین ایجر لڑکی چاہئے ... ٹین ایجر سمجھتی ہو نا ؟ بیس سال سے نیچے نیچے کی ....."

"اپنی رئیسہ تو ابھی اٹھارہویں سال میں ہے۔" فریدہ جلدی سے بولی۔

"مجھے اندازہ ہے۔" رازی صاحب نے سر ہلایا۔ "میں ابھی کل ہی پرانی فلموں کی کچھ اسٹلز دیکھ رہا تھا۔ ان میں رئیسہ کا ایک کلوز اپ نظر آیا۔ پرانا کلوز اپ تھا۔ میں نے اس فلم کی تاریخوں سے حساب لگایا کہ رئیسہ اب شاید عمر کے سترہویں یا اٹھارہویں سال میں ہوگی۔ چہرہ وہی تھا جس کی مجھے تلاش تھی .... اور پھر اچانک میرا دل تیز تیز دھڑکنا شروع ہو گیا.... اور تمہیں معلوم ہے' اس بڑھاپے میں جب میرا دل تیز تیز دھڑکتا ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں جی ۔" فریدہ عاجزی سے بولی۔

"اس کا مطلب ہوتا ہے کہ گمنامی کے اندھیروں سے ایک نئی ہیروئن طلوع ہونے والی ہے۔" رازی صاحب بولے۔

"واہ صاحب .... واہ .... ! کیا بات کی ہے !" فریدہ اور استاد مکرم تقریباً" ایک

ساتھ ہی بولے۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے مشاعرے میں کسی اچھے شعر پر داد دے رہے ہوں۔

رازی صاحب نے ایک بار پھر گہری نظروں سے رئیسہ کا گویا ازسرنو جائزہ لیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے۔ "یہ لڑکی نینا سے بڑی دریافت ثابت ہو سکتی ہے۔ میں اپنے اسکرپٹ پر کچھ اور کام کرواؤں گا... اسکرین پلے اور ڈائی لاگ پر بھی کچھ اور محنت کرواؤں گا۔ اس لڑکی پر بھی محنت کروں گا.... اب میرے دل میں ٹھنڈ تبھی پڑے گی جب یہ لڑکی نینا سے بڑی اسٹار ہوگی۔"

وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔ فریدہ بھی اپنی جگہ کوئی خواب ضرور دیکھ رہی تھی اور جس کے بارے میں خواب دیکھے جا رہے تھے، وہ سپاٹ چہرہ لئے بیٹھی تھی۔ وہ بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے بس ٹکر ٹکر رازی صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسی بے تاثر چہرے والی لڑکی کیمرے کے سامنے کیا جادو جگاتی تھی۔ اس کی عام زندگی میں اگر کوئی تاثر نظر آتا تھا تو صرف اس کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

رازی صاحب کے دل کی آگ گویا فریدہ کے دل کی ٹھنڈک بنتی نظر آ رہی تھی۔ اس دوران چائے اور اس کے لوازمات آ چکے تھے۔ استاد مکرم نے چائے بنا کر رازی صاحب کو پیش کی اور فریدہ نے بسکٹ وغیرہ کی پلیٹیں ان کی طرف بڑھائیں۔

رازی صاحب ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ "یہ چیزیں میں نہیں کھاتا۔ صرف چائے پیوں گا۔" پھر انہوں نے پہلی بار رئیسہ کو براہ راست مخاطب کیا۔

"ہاں .... تو پھر تم کیا کہتی ہو رئیسہ ؟"

رئیسہ نے تھکے تھکے سے انداز میں مسکرا کر فریدہ کی طرف دیکھا اور گویا بزبان خموشی کہا۔ "فیصلہ تو انہیں کرنا ہوتا ہے۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

فریدہ کو جیسے بہت دیر بعد پہلی مرتبہ وہاں رئیسہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ

سنبھل کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مشفقانہ سرزنش کے انداز میں بولی۔ "اری لڑکی! اپنا مردار سا چہرہ کیوں لئے بیٹھی ہے؟ تیری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اٹھ کر خوشی سے ناچنے لگتی۔"

رازی صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "بھئی یہ بھی ناچے گی .... گائے گی ..... مگر کیمرے کے سامنے ..... ! یہاں ناچ کر یہ کیا کرے گی؟ جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا ..... لیکن ہاں ..... اتنا ضرور کرو کہ ....." وہ براہ راست رئیسہ سے مخاطب ہوئے۔ "ذرا اٹھ کے مجھے دروازے تک چل کر دکھاؤ"۔

"جی ....؟" رئیسہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی حیران سی آنکھوں میں حیرانی کچھ اور بڑھ گئی۔

"بھئی میں نے تمہاری صرف اس وقت کی ایک آدھ فلم دیکھی ہے جب تم چھوٹی تھیں"۔ رازی صاحب بولے۔ "بچپن سے نوجوانی تک انسان میں بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ میں ذرا تمہاری چال ڈھال دیکھنا چاہتا ہوں"۔

رئیسہ ہچکچائی اور اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آ گئی۔ اسے بلاوجہ اٹھ کر دروازے تک جانا عجیب لگ رہا تھا جیسے کسی کے سامنے تماشا بن رہا ہو۔

فریدہ اپنے لہجے کی سختی کو مٹھاس میں چھپاتے ہوئے بولی۔ "لڑکی! بھئی کمال کرتی ہو۔ تم تو ایسے شرما رہی ہو جیسے رازی صاحب نے کوئی ناروا فرمائش کر دی ہو۔ بھلی مانس! وہ تم سے صرف دروازے تک چل کر جانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

آخر رئیسہ گویا بادل نخواستہ اٹھی اور دروازے تک گئی۔ اسے رازی صاحب کی نظروں کی چبھن اپنی پشت پر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پلٹی۔ رازی صاحب واقعی گہری نظر سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس عمر میں بھی ان کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے: "اتنے شکستہ اور مضمحل انداز میں چلنا بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے ذرا اس نوخیز لڑکی کی طرح ادا اور ترنگ سے چل کر دکھاؤ جس کا دل اچھوتی خوشیوں سے لبریز ہو"۔

"لیکن میرا دل تو اچھوتی خوشیوں سے لبریز نہیں ہے رازی صاحب! میں آپ کو ادا اور ترنگ سے کیسے چل کر دکھا سکتی ہوں؟" یہ بات اس نے کہنا چاہی مگر کہہ نہ سکی۔ شاید وہ کہہ دیتے کہ ایکٹرس وہی ہوتی ہے کہ اس کو جو تاثر دینے کے لئے کہا جائے وہ دے کر دکھائے۔ اس کی اداکاری کا اس کے محسوسات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس نے اپنی دانست میں نازو ادا اور ترنگ سے چل کر دکھایا۔ اس کے اپنے خیال میں اس کا انداز نہایت مایوس کن تھا لیکن رازی صاحب طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "اب ذرا ہنس کر دکھاؤ..... کھل کر ہنسو"۔

وہ زور سے ہنسی۔ اسے اپنی ہنسی ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی لیکن رازی صاحب ایک بار پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے: "بالکل ٹھیک..... ہنسی بھی اچھی ہے..... دانت بھی خوبصورت ہیں..... آواز بھی فوٹو جینک معلوم ہوتی ہے"۔ وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگے۔

فریدہ جلدی سے بولی۔ "میں صبح اسے کیمرہ ریہرسل یا اسکرین ٹیسٹ وغیرہ کے لئے اسٹوڈیو لے آتی ہوں"۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ یہ رسمی باتیں ہیں۔ اناڑیوں کے طور طریقے ہیں۔ ہماری آنکھ کیمرہ ہے"۔ رازی صاحب بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولے۔

ایک لمحے کے لئے رئیسہ کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بھیڑ بکری تھی جسے قربانی کے لیے خریدا جا رہا تھا اور اطمینان کیا جا رہا تھا کہ اس کے دانت پورے ہیں' کوئی عضو ٹوٹا ہوا نہیں۔

اچھی بات صرف یہ تھی کہ رازی صاحب بڑی عمر کے آدمی تھے' ان کا رویہ

مشفقانہ تھا اور وہ اس قبیل کے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے جن کے تذکرے سن کر ہی رئیسہ کو خوف آتا تھا گو کہ ابھی اسے ان سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ رازی صاحب بہت مختلف آدمی معلوم ہوتے تھے۔ اسی لئے رئیسہ کافی حد تک عمدگی سے ان کی فرمائشیں پوری کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی ورنہ شاید وہ اس کے بس کی بات نہ ہوتی۔

"بڑی مہربانی ہے رازی صاحب آپ کی"۔ فریدہ کے لہجے میں عاجزی اور تشکر تھا۔ "آپ کی نظر کرم سے شاید اس بچی کی زندگی سنور جائے۔ شاید یہ پتھر بھی ہیرا بن جائے"۔

"لیکن پیسے میں بہت کم دوں گا کیونکہ میں بہت بڑا رسک لے رہا ہوں"۔ رازی صاحب نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "میں دس ہزار دے سکتا ہوں"۔

"صرف دس ہزار...؟" فریدہ کو جیسے جھٹکا لگا۔ "ہیروئین کا معاوضہ دس ہزار؟"

"اسے معاوضہ نہیں..... صرف رئیسہ کا جیب خرچ سمجھو۔ مجھے کچھ ایسی لڑکیوں کی مائیں بھی ملی ہیں جو پلے سے لاکھ دو لاکھ دینے کو تیار ہیں کہ میں ان کی بیٹی کو ہیروئین کا چانس دے دوں"۔ رازی صاحب کے لہجے میں ہلکی سی رکھائی آ گئی " لیکن میں کچھ سوچ کر ہی تمہارے پاس آیا تھا۔"

"میں انکار تو نہیں کر رہی ہوں"۔ فریدہ جلدی سے بولی تاہم اس کے لہجے میں کچھ مردنی سی آ گئی تھی۔ "میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی کہ شاید ہمارے آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے آپ کچھ کرم فرماتے"۔

"میں دس ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دے سکتا۔ میں سبز باغ دکھانے والا آدمی نہیں ہوں۔ کھری بات کرتا ہوں"۔ رازی صاحب نے قطعیت سے کہا۔ "نینا کی وجہ سے میں پہلے ہی کافی نقصان اٹھا چکا ہوں۔ میں تو وہ فلم بنانے کا ارادہ ہی ترک کر چکا تھا۔ رئیسہ کا خیال آ جانے کی وجہ سے میں نے سوچا' چلو قسمت آزمائی کر کے دیکھ لیتے ہیں"۔

کاروبار کے معاملے میں رازی صاحب بامروت آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ موقعے سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے اور اب ان کی وہ عمر بھی نہیں تھی کہ کسی کی جنبشِ ابرو پر نفع نقصان سے بے نیاز ہو جاتے۔ انہوں نے مزید وضاحت کی۔

"کانٹریکٹ میں تقریباً" سبھی شرائط وہی ہیں جو عام فلموں کے معاہدوں میں ہوتی ہیں لیکن ایک اضافی شرط میری طرف سے یہ ہے کہ میری یہ فلم مکمل ہونے تک رئیسہ کوئی اور فلم سائن نہیں کرے گی"۔

پھر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "ایک زمانہ وہ بھی تھا جب بڑے بڑے اداکار ماہوار تنخواہ پر کمپنیوں میں ملازم ہوتے تھے اور اپنی کمپنی کے سوا کسی کی فلم میں کام ہی نہیں کر سکتے تھے۔ آج ایک نئے چہرے کو بھی صرف ایک فلم کی حد تک پابند رکھنے کے لئے بھی ہمیں باقاعدہ کانٹریکٹ میں وضاحت کرنی پڑ رہی ہے۔ بولو..... تمہیں یہ شرط منظور ہے؟"

فریدہ کو امید بھی نہیں تھی کہ پہلی فلم کے دوران رئیسہ کو کسی اور فلم کی پیش کش ہو گی۔ وہ ایک ادائے خاص سے مسکرا کر گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ کی تو ہمیں ہر شرط منظور ہے رازی صاحب! آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پھر سوچ سمجھ کے بات کرتے"۔ اس کی عمر اور سراپا کچھ ایسا ہو چکا تھا کہ وہ ادائیں دکھاتی اچھی نہیں لگتی تھی لیکن ادائیں دکھانے کی عادت شاید اس کے خون میں شامل ہو چکی تھی۔!

رازی صاحب شاید اب اس کام میں تاخیر کرنا بالکل نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے فوراً" اپنے بریف کیس سے ٹائپ شدہ کاغذات کا ایک پلندہ نکالا۔ انگریزی میں ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپرز پر مشتمل یہ کانٹریکٹ وہ رئیسہ کے سامنے تپائی پر رکھتے ہوئے ایک جگہ انگلی رکھ کر بولے: "یہاں سائن کر دو....."

اس سے پہلے کہ رئیسہ کچھ کہتی' فریدہ جلدی سے ..... رئیسہ سے مخاطب ہوئی۔ "بسم اللہ کر کے سائن کرو"۔

"بسم اللہ کر کے فلم کا کانٹریکٹ سائن کروں؟" رئیسہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"ہاں ..... ہاں ..... ہر کام بسم اللہ کر کے کرنا چاہئے"۔ فریدہ اس کے طنز کو سمجھے بغیر نہایت سنجیدگی سے بولی۔ رئیسہ نے پین اٹھا کر کانٹریکٹ کا ایک لفظ پڑھے بغیر سائن کر دیئے۔ تینوں افراد نے تالیاں بجائیں۔ پھر باقاعدہ دعا کی گئی۔ رئیسہ کو بھی ہاتھ اٹھانا پڑے۔ پھر فریدہ نے ایک ملازم کو بلا کر مٹھائی لانے کا حکم دیا۔

ملازم کے باہر جانے سے پہلے رازی صاحب نے ایک سو ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے مسکرا کر رئیسہ کو مخاطب کیا: "یہ رہا تمہارا سائن اماؤنٹ۔ معاوضے کی قسطیں تمہیں ہر شوٹنگ پر ملتی رہیں گی"۔

اس دوران ملازم دروازے سے باہر جا کر پلٹ آیا اور رازی صاحب سے مخاطب ہوا۔ "صاحب جی! باہر نینا بیگم آئی ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں"۔

"نینا بیگم ..... اور یہاں .....؟" رازی صاحب نے حیرت سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

باقی تینوں افراد کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔



فریدہ کے چہرے پر خوف چھلک آیا تھا۔ اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کے ہاتھ میں لالی پاپ دیا گیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے اسے اندیشہ محسوس ہوا ہو کہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا جائے گا۔ رئیسہ اب بھی لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ تو رہی تھی مگر اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔

رازی صاحب دروازے کی طرف بڑھنے لگے مگر پھر جیسے انہیں کچھ خیال آ گیا۔ وہ پلٹ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور تحکمانہ لہجے میں ملازم سے مخاطب ہوئے۔ "لے آؤ..... نینا کو اندر ہی لے آؤ"۔

ملازم باہر چلا گیا تو رازی صاحب فریدہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور ذرا حیرت سے بولے۔ "یہ تو آؤٹ ڈور شوٹنگ پر گئی ہوئی تھی۔ اچانک یہاں کیسے آن پہنچی!"

فریدہ تھوک نگل کر بولی۔ "مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا..... نینا..... اور ہمارے گھر! آج کا دن بڑا عجیب ہے"۔

ملازم واپس آیا تو اس کے پیچھے بوٹے سے قد والی ایک لڑکی تھی۔ وہ ڈینم کی جینز اور جیکٹ میں تھی۔ اس کے چمکیلے' بھورے' تراشیدہ بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ اونچی ایڑی کے سینڈلوں میں وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں جھولتے ہوئے بندوں کی جھلمل دور تک جا رہی تھی۔ وہ یقیناً ہیرے کے تھے۔ شاید وہ اس وقت پوری طرح سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں فطری سی شوخی اور شرارت تھی۔

میک اپ سے بے نیاز اس کا چہرہ اس وقت کسی ایکٹرس کا چہرہ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ایک عام سی لڑکی کا چہرہ تھا مگر اس لڑکی کے ستارے خاص تھے! اس کم عمری میں اس کی شہرت ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی تھی۔ بچہ بچہ اس کا صورت آشنا تھا۔ وہ جہاں جاتی تھی اخبار نویس اور دولت والے اس کے گرد منڈلانے لگتے تھے۔ عام آدمیوں کے ہجوم سے تو اسے بچانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے تھے۔ دولت اس کی طرف یوں کھنچی چلی آ رہی تھی جیسے وہ ایک چلتا پھرتا مقناطیس تھی!

یہ سب صرف فلمی دنیا کا کمال تھا ورنہ دیکھنے میں وہ ایک عام اور کھلنڈری سی لڑکی نظر آتی تھی۔ فلم نگری کی یہی معجزہ آرائی دنیا کو اپنا دیوانہ بناتی تھی۔ دوسرے عام سے لوگوں کو راتوں رات خاص بنتے دیکھ کر ہر عام آدم کی آنکھوں میں سپنے سجنے لگتے تھے' مگر ہما تو کسی کسی کے سر پر ہی بیٹھتا ہے۔ رئیسہ یہ سب کچھ سوچ رہی تھی اور گہری نظر سے نینا کا جائزہ لے رہی تھی۔ نینا کے پیچھے ایک لڑکا بیوٹی باکس اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ معمولی سے سوٹ میں پکی عمر کا ایک سانولا سا شخص تھا۔ وہ ایک ڈائری اٹھائے ہوئے تھا۔

سب سے پیچھے لمبی اور دبلی سی ایک لڑکی تھی۔ اس کی عمر تیس برس سے اوپر ہو گی وہ زرق برق ساڑھی میں ملبوس تھی اور گہرا میک اپ کیے ہوئے تھی لیکن اس کا چہرہ ستا ہوا سا تھا اور اس کے ستے ہوئے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ آنکھوں میں شاطرانہ سی چمک لیے وہ گویا ہر قدم پر ہر چیز کا بڑی توجہ سے مشاہدہ کرتی ہوئی چلتی تھی۔۔ رئیسہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ نینا کی بڑی بہن تھی۔ رئیسہ نے سنا تھا کہ نینا کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ سیاہ و سفید کی مالک وہی تھی۔ اس کا نام فائزہ تھا۔

ان لوگوں کے آنے سے گویا صحن بھر گیا۔ بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ رازی صاحب اپنی جگہ سے اٹھے بغیر' خوش خلقی سے بولے۔ "آؤ' آؤ نینا بیگم..... فائزہ بیگم! کیا حال چال ہیں؟ بھئی تم دونوں نے تو یہاں آ کر مجھے حیران کر دیا۔ تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟"

جواب بڑی بہن فائزہ نے دیا۔ وہ کھڑے ہی کھڑے بڑی نپی تلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "بڑے لوگوں کا کہیں بھی جانا ایک خبر ہوتی ہے رازی صاحب! ہر انسان کو کم از کم اپنی ٹریڈ کی خبروں کا تو پتا ہونا چاہیے"۔

فریدہ کچھ بوکھلا سی گئی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "آیئے' چل کر ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں"۔

"ارے گولی مارو ڈرائنگ روم کو ..... کبھی کبھی تو کھلی ہوا میں بیٹھنا نصیب ہوتا ہے۔ یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے ..... اور کرسیاں منگوا لو"۔ رازی صاحب بے فکری سے بولے۔

فریدہ نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے ملازم کو آواز دے کر مزید کرسیاں منگوائیں۔ سب بیٹھ چکے تو ایک لمحے کے لئے عجیب سا سکوت چھا گیا۔ فضا میں بے عنوان سا تناؤ تھا۔ فائزہ اور نینا دونوں ہی گہری نظر سے صرف رئیسہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رئیسہ نے محسوس کیا کہ ایسی گہری نظر سے تو آج تک کسی ڈائریکٹر نے بھی اس کا جائزہ نہیں لیا تھا۔

اس کی رگ و پے میں خفیف سے اضطراب کی لہر ابھری مگر بظاہر جھیل کی طرح پرسکون رہنے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ وہ اکثر ہی خاموش بیٹھی ٹکر ٹکر چاروں طرف دیکھتی رہتی تھی۔ کسی کے لئے اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے اندر اپنی ایک الگ ہی دنیا آباد تھی اور وہ اپنی اس دنیا میں کھوئی رہتی تھی۔

دونوں بہنیں رئیسہ کا اچھی طرح جائزہ لے چکیں تو انہوں نے گھر کا مختصر سا معائنہ کیا۔ گھر بہت زیادہ عسرت زدہ نہ سہی لیکن اس کے در و دیوار پر خوشحالی کے سائے بھی نہیں تھے۔ مکان کسی حد تک کشادہ ضرور تھا مگر اس کی بناوٹ' اس میں موجود ہر چیز نہایت عام' بلکہ کسی حد تک غریبانہ سی تھی۔ دونوں بہنوں کی نظریں مکان کا معائنہ کر کے رئیسہ کی طرف واپس آئیں تو ان میں ہلکی سی نخوت' ہلکی سی تحقیر کی

آمیزش ہو چکی تھی۔

رازی صاحب نے سب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ دونوں بہنوں کے ساتھ سستے سے سوٹ میں' سانولی رنگت اور پکی عمر کا جو شخص ڈائری اٹھائے آیا تھا' وہ ان کا ماموں تھا مگر مینجر اور سیکرٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ تاریخوں وغیرہ کا حساب وہی رکھتا تھا۔ روپیہ پیسا فائزہ وصول کرتی تھی۔

"اچھا ..... تو تم ہو رئیسہ .....!" فائزہ نے تعارف کے بعد ذرا چبھتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

"جی .... ! میں ہوں رئیسہ !" وہ نہایت دھیمے اور ٹھہرے لہجے میں بولی۔ وہ ایک ٹک فائزہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فائزہ کی آنکھوں میں لومڑی کی سی چمک تھی مگر جلد ہی اس نے رئیسہ سے نظر چرا لی اور رازی صاحب کی طرف متوجہ ہوئی جو نہایت مطمئن انداز میں پائپ کے کش لے رہے تھے۔

"اور سنایئے' آپ کیسے ہیں رازی صاحب ؟" وہ میٹھے لہجے میں بولی۔

"ہمارا کیا پوچھتی ہو فائزہ بیگم !" وہ طویل سانس لے کر بولے : "ہم تو پرانے برگد ہیں' نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے ... ہم تو ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ رت آتی ہے' رت جاتی ہے ہم اپنی جگہ جمے کھڑے رہتے ہیں ہم کوئی سمندر کی متلون مزاج موج تو ہیں نہیں' کہ ابھی یہاں' پل بھر میں وہاں' اور پھر ساحل سے سر ٹکرا کر غائب...!"

نینا نے مترنم سا قہقہہ لگایا اور فائزہ متانت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"واہ رازی صاحب ! آپ جب بھی بات کرتے ہیں' شاعرانہ کرتے ہیں۔ آپ کو شاعر ہونا چاہیے۔"

"شکر ہے میں شاعر نہیں ہوں۔" رازی صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہ شاعری کے حق میں بھی اچھا ہوا اور میرے حق میں بھی۔"

ایک ہلکا مگر مشترکہ سا قہقہہ بلند ہوا۔ اس قہقہے میں ایک عجیب سا اضطراب

پنہاں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بات کرنے والے کہنا کچھ اور چاہتے تھے مگر کہہ کچھ اور رہے تھے۔ دل میں کچھ اور تھا' زبان پر کچھ اور نیناؔ ابھی تک خاموش تھی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ رقصاں تھی مگر اس مسکراہٹ میں بھی ایک اضطراب تھا۔ فریدہ ان کے لئے چائے وغیرہ کا اہتمام کر رہی تھی لیکن وہ وہاں ہونے والی گفتگو سے غافل نہیں تھی۔

آخر رازی صاحب ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں بولے: "نینا بیگم! تم ستارہ' یہاں آنے کی زحمت کیسے کی؟"

نینا نے ایک نظر بڑی بہن کی طرف دیکھا پھر بڑی دل نشیں مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "رازی صاحب! میں شوٹنگ کر رہی تھی کہ ایک چھوٹی سی بات سے مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ شاید میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ شاید مجھ پر کوئی پھٹکار پڑ گئی تھی۔ بہرحال' جو ہوا سو ہوا۔ اب اسے بھولنے کی کوشش کیجئے۔ میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

وہ خاموش ہوئی تو فوراً ہی فائزہ بولی: "آپ کو پتا ہی ہے رازی صاحب' نینا کی عمر بھی کم ہے اور تجربہ بھی .... اسے انڈسٹری میں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ کامیابیاں ذرا زیادہ حاصل ہو گئی ہیں۔ کم عمری میں انسان کو ایسا عروج مل جائے تو دماغ تھوڑا سا خراب ہو ہی جاتا ہے لیکن ہم آپ جیسے لوگوں کو ناراض کر کے انڈسٹری میں رہنا نہیں چاہتے۔ آپ نینا کو معاف کر دیجئے۔"

رازی صاحب کچھ نہ بولے۔ خاموشی سے پائپ کے کش لیتے رہے' مسکراتے رہے۔ فریدہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

فائزہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس نے جب بھی میرے مشورے کے بغیر قدم اٹھایا' غلط ہی اٹھایا۔ آپ سے بات بگڑنے کے بارے میں اس نے مجھے نہیں بتایا ورنہ میں ایسا ہرگز نہ ہونے دیتی۔"

رازی صاحب نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا جیسے انہوں نے کوئی لطیفہ سن لیا ہو'

گونجیلی سی آواز میں بولے۔ "فائزہ بیگم! میں بوڑھا ضرور ہو گیا ہوں لیکن میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے جتنی تم سمجھ رہی ہو اور نہ ہی یہ کوئی برسوں پرانی بات ہے۔ ٹھیک ہے' انڈسٹری میں بہت جھوٹ بولا جاتا ہے لیکن اتنی دیدہ دلیری سے نہیں بولا جاتا جتنی دیدہ دلیری سے اس وقت تم بول رہی ہو۔ نینا نے جس وقت کانٹریکٹ کینسل کیا اور رقم واپس کی' اس وقت تم اس کے ساتھ ہی موجود تھیں۔"

"میں موجود تو تھی ... " فائزہ نے گویا جلدی سے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ "لیکن مجھے نینا نے ساری بات نہیں بتائی تھی۔ اس لئے میں سمجھی شاید قصور آپ ہی کا ہوگا۔ یہی سوچ کر میں خاموش رہی لیکن آج شوٹنگ کے دوران نینا نے ساری بات بتائی تو میں نے فوراً" اس سے کہا' قصور تو تمہارا ہے تمہیں چل کر رازی صاحب سے معافی مانگنا ہوگی۔ میں تو یہاں تک سوچ کر آئی ہوں کہ آپ کا' شفٹوں کا' سیٹ ٹوٹنے کا جتنا نقصان ہوا ہو گا' ہم وہ بھی بھر دیں گے۔ ہم اپنی غلطی کی پوری تلافی کرنا چاہتے ہیں رازی صاحب۔"

"تمہارے اور نینا کے خیالات میں اس انقلاب کی خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی فائزہ بیگم!" رازی صاحب پائپ کا کش لے کر بولے۔ "لیکن افسوس کہ تم تھوڑا سا لیٹ ہو گئیں۔"

"لیٹ؟" فائزہ نے بھنویں اچکائیں۔ "وہ کس طرح ....؟"

"وہ اس طرح کہ میں نے اپنی فلم "وفا" کے لیے چند منٹ پہلے رئیسہ کو سائن کر لیا ہے۔" رازی صاحب نے جواب دیا۔

سب کی نظریں ایک بار پھر رئیسہ پر تھیں۔ وہ اپنے وجود میں سکڑ سمٹ سی گئی لیکن بظاہر اسی طرح بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کے لیے گہرا سکوت چھا گیا۔

آخر فائزہ بظاہر محبت اور شفقت آمیز انداز میں رئیسہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آپ کیا کر رہے ہیں رازی صاحب .... ! یہ ہیروئن کے طور پر کیا چلے گی..... یہ تو بے چاری بڑی مسکین سی لڑکی ہے۔"

"نینا جب انڈسٹری میں آئی تو یہ بھی بڑی مسکین سی لڑکی تھی!" رازی صاحب نے مسکراتے ہوئے بڑے ملائم لہجے میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"لیکن بات تو اب کی ہو رہی ہے رازی صاحب! اب نینا کے پاس تجربہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ نینا کا اب ایک نام ہے۔ یہ اسٹار بن چکی ہے ڈسٹری بیوٹر اس کے نام پر فلم اٹھاتا ہے۔ آپ سے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہے کہ انڈسٹری میں نام بکتا ہے آپ کو فلم بیچنی ہے۔ ڈبوں میں بند کر کے گھر تو نہیں سجانی۔" فائزہ اب بھی مسکراتے ہوئے بڑے رسان سے باتیں کر رہی تھی۔

رازی صاحب نے ایک بار پھر اپنے مخصوص گونجیلے انداز میں قہقہہ لگایا۔ "یہ بات آج تک صحیح طور پر طے نہیں ہو سکی کہ انڈسٹری میں نام بکتا ہے، مقدر بکتا ہے یا صلاحیت بکتی ہے۔ یہ ایک معما ہے کہ انڈسٹری میں کیا بکتا ہے .... اور شاید یہ ہمیشہ معما ہی رہے۔ اس پر بحث شاید قیامت تک جاری رہے، اور میں بحث میں وقت ضائع کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

"پھر بھی کچھ باتیں تو ہوتی ہیں رازی صاحب!" فائزہ نے انہیں قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ "اب میں آپ جیسے آدمی کو سبق تو نہیں پڑھا سکتی۔ میں تو آپ کے سامنے طفلِ مکتب ہوں، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ بچپن میں کسی لڑکی کا چند روتے دھوتے سین کر لینا اور بات ہے، ہیروئن کے طور پر پوری فلم کو سنبھالنا اور بات .... ڈسٹری بیوٹر اکیلے ہیرو کے نام پر تو فلم نہیں اٹھاتا۔"

"مجھے بار بار ڈسٹری بیوٹر سے مت ڈرائے جاؤ۔" رازی صاحب نرمی سے بولے۔ "شاید تم بھول رہی ہو کہ میں ڈسٹری بیوٹر کا محتاج نہیں ہوں۔ میں نہ تو کسی فائنانسر کا محتاج ہوں اور نہ ہی مجھے یہ فکر ہوتی ہے کہ ڈسٹری بیوٹر سے قسطیں ملیں گی تو میری فلم کی شوٹنگ آگے چلے گی۔ اگر مجھے پوری فلم بھی فائنانس کرنی پڑی تو کر لوں گا۔"

"اور اگر نئے نام کی وجہ سے فلم خدانخواستہ ڈوب گئی؟" فائزہ نے گویا انہیں ڈرایا۔

"کوئی بات نہیں۔ تجربہ سہی ... تمہیں معلوم ہے میں نے زندگی میں بہت سے تجربے کیے ہیں جن میں سراسر نقصان نظر آ رہا تھا۔ میں تجربے کرنا افورڈ کر سکتا ہوں۔"

"فلم کی تین ریلیں بھی تو بن چکی ہیں۔" فائزہ نے یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں۔ جہاں جہاں نینا کا کام ہے وہ حصے دوبارہ شوٹ کر لیں گے، بلکہ اب میرے ذہن میں کچھ بہتر آئیڈیاز آئے ہیں۔ مجھے امید ہے اب میں ان تین ریلوں کو بھی کچھ اور بہتر بنا لوں گا۔" رازی صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

"جہاں اتنا نقصان ہوا ہے وہاں تھوڑا بہت نقصان اور سہی۔"

"نقصان کے بارے میں تو میں کہہ رہی ہوں کہ جتنا آپ کہیں، میں اتنا ہرجانہ بھرنے کو تیار ہوں۔" فائزہ بولی۔

رئیسہ دیکھ رہی تھی کہ جس طرح اس کی طرف سے ہر بات فریدہ کرتی تھی۔ ہر ذمے داری، ہر وعدہ اپنے سر لیتی تھی گو کہ اس کا تعلق رئیسہ کی ذات سے ہوتا تھا۔ بالکل اسی طرح نینا کی طرف سے ہر بات فائزہ کر رہی تھی، نینا تو بس ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ لئے ٹکر ٹکر کبھی رازی صاحب کی طرف اور کبھی فائزہ کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

رازی صاحب پائپ کا کش لے کر تحمل سے بولے۔ "میں نے کہا نا، کہ اب ان باتوں کا وقت گزر گیا۔ رئیسہ کے ساتھ میرا کانٹریکٹ سائن ہو چکا ہے"۔

"کانٹریکٹ کا کیا ہے، کانٹریکٹ کینسل بھی ہو سکتا ہے"۔ فائزہ بولی۔ "میں اس لڑکی کو بھی ہرجانے کے طور پر دو چار ہزار روپے دے دوں گی"۔

فریدہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن رازی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے سے باز رکھا اور کرسی پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولے۔ "کانٹریکٹ کینسل ہونے کے لئے نہیں ہوتا فائزہ بیگم! دوسرے، مجھ میں

اور نینا میں کچھ تو فرق رکھو۔ میں تو یہ نہیں کر سکتا کہ جب خود کو ضرورت ہوئی تو کانٹریکٹ کر لیا اور جونہی کہیں اور چار پیسے کا فائدہ نظر آیا کینسل کر دیا۔ انڈسٹری میں کچھ لوگوں کو تو اصولوں پر چلنے کی روایت بھی قائم رکھنی چاہئے۔"

فائزہ خاموش تھی مگر اس کے چہرے پر خفیف سی ناگواری تھی۔

رازی صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "کانٹریکٹ تو ویسے بھی کوئی اہم چیز نہیں ہوتا۔ اہم چیز تو انسان کی زبان اور دل ہوتا ہے۔ جب کسی کا دل ہی آپ کے ساتھ نہ ہو تو آپ اسے کانٹریکٹ کی زنجیر سے باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے تو میں نینا کے کانٹریکٹ کینسل کرنے کے بعد عدالت میں نہیں گیا۔ میں چاہتا تو جا سکتا تھا۔ نینا کو یک طرفہ طور پر کانٹریکٹ کینسل کرنے کا حق حاصل نہیں تھا لیکن مجھے معلوم تھا میرے وکیلوں نے سال چھ مہینے دھکے کھانے اور مغز خوری کرنے کے بعد نینا کے خلاف عدالتی حکم حاصل بھی کر لیا تب بھی وہ بات تو پیدا نہیں ہو سکے گی۔ عدالتی حکم کے ذریعے کسی سے اچھی اداکاری تو نہیں کرائی جا سکتی۔ فلم میکنگ میرے لئے تو ابھی تک ایک آرٹ ہی ہے فائزہ بیگم! یہ محبتوں کا کام ہے جب تک آپ کا دل' آپ کی روح' آپ کا دماغ اس کام میں نہ ہو' آپ لوگوں کے دلوں میں نہیں اتر سکتے"۔

ماحول پر بوجھل پن سا طاری تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے رازی صاحب بولے۔ "اسی لئے اکثر لوگ یک طرفہ طور پر کانٹریکٹ کینسل ہونے کے بعد بھی عدالت میں نہیں جاتے۔ بہت ہی مجبوری اور پیچیدگی کی حالت میں کوئی عدالت کا رخ کرتا ہے۔ جب کسی انسان نے آپ کا ساتھ چھوڑنے کا ارادہ کر ہی لیا پھر کیس لڑ کر اسے واپس لانا ایسے ہی ہے جیسے آپ ڈنڈے کے زور پر کسی کو اپنے آپ سے محبت کرنے پر مجبور کریں"۔

فائزہ گہری سانس لے کر بولی۔ "آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں رازی صاحب! آپ کی ہر بات کے پیچھے تجربہ بولتا ہے لیکن ..... پھر بھی ..... مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے اس معاملے میں آپ ضد میں آ گئے ہیں"۔

"چلو ..... تم یہی سمجھ لو"۔ رازی صاحب ملائمت سے بولے۔

"کاروبار میں ضد نہیں چلتی"۔ فائزہ بولی۔

"ہو سکتا ہے جسے تم ضد کہہ رہی ہو' میری نظر میں وہ اصول پسندی ہو"۔ رازی صاحب بولے۔ ان کے چہرے پر طمانیت تھی جو احساس فتح مندی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ فائزہ کے ہونٹوں پر ایک کشیدہ سی مسکراہٹ تھی لیکن اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے یہ احساس یقیناً ہو چکا تھا کہ وہ ایک غلط مہرہ چل چکی تھی اور فلمی دنیا کی بساط پر اب اسے اس کے نتائج بھگتنے تھے۔

"اب ایسی بھی کیا اصول پسندی رازی صاحب!" فائزہ نے ایک کوشش اور کی۔ "اگر آپ یہاں نہ آئے ہوتے ..... چند منٹ پہلے ہم آپ کے آفس پہنچ گئے ہوتے ..... یا راستے ہی میں ہماری آپ کی ملاقات ہو گئی ہوتی!"

"تو شاید صورت حال مختلف ہوتی"۔ رازی صاحب نے تسلیم کیا۔ "دنیا اسی کا نام ہے' کسی کی لغزش کسی کے لئے سہارا بن جاتی ہے۔ کسی کا فیصلہ اس کے اپنے حق میں غلط ہوتا ہے مگر اس سے کسی دوسرے کی زندگی سنور جاتی ہے۔ ہم اپنی فلمیں بناتے رہتے ہیں مگر اوپر والے کی اپنی ایک فلم چلتی رہتی ہے جسے دیکھنے اور اس سے سبق حاصل کرنے کے لئے بڑی گہری نظر چاہئے"۔

فائزہ شاید بالکل ہی ناامید ہو کر اکتاہٹ آمیز سے انداز میں طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ "مقصد یہ کہ آپ نے رسک لینے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب آپ اس فیصلے کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں؟"

"کیسا رسک؟" رازی صاحب نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"نئی لڑکی کو ہیروئن لینے کا"۔ فائزہ جیسے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"ابھی کچھ ہی عرصے پہلے تک نینا بھی نئی تھی۔ کسی نے اسے بھی ہیروئن بنانے کا رسک لیا تھا"۔ رازی صاحب بولے: "اور رسک کیا ہے ..... رسک تو سپر اسٹارز کی ایک لمبی لائن کو کاسٹ کرنے کے بعد بھی رہتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی پیش

گوئی کرنا بیکار ہے"۔

فریدہ کے چہرے کی رونق بحال ہو چکی تھی۔ رازی صاحب کو مضبوطی سے اپنے وعدے پر قائم دیکھ کر اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ وہ چائے بنا کر ٹرے نینا اور فائزہ کے سامنے کرتے ہوئے مسکرا کر شیریں لہجے میں بولی۔ "یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی ..... چائے لیجئے نا"۔

"شکریہ ..... میں چائے پیتی نہیں ہوں"۔ فائزہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"میں بھی نہیں پیتی۔" نینا جلدی سے بولی۔

"میں بوتلیں منگوا لیتی ہوں"۔ فریدہ ملازم کو آواز دینے لگی تھی مگر فائزہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر قدرے بیزاری سے بولی۔ نہیں ..... نہیں ..... بالکل نہیں۔ آپ کچھ بھی منگوانے کا تکلف مت کیجئے۔ اس وقت کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا"۔

فریدہ مصر تھی۔ وہ مٹھائی کا ڈبا اٹھا کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "اچھا' یہ ذرا سی مٹھائی تو چکھ لیجئے ..... یہ ہماری بچی کے ہیروئین کے طور پر پہلی فلم سائن کرنے کی خوشی میں آئی ہے"۔

فائزہ نے کھا جانے والے نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے کہا نا کہ اس وقت کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا..... اور پھر فلمیں سائن ہونے کی مٹھائیاں تو بہت کھاتے رہتے ہیں۔ اسٹوڈیوز میں دن رات یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے"۔

"بے شک" فریدہ نے ڈبا واپس رکھتے ہوئے تائید میں سر ہلایا۔ "لیکن ہم بیچاروں کے لئے آج کا دن بڑا اہم ہے۔ آج تو ہم لوگوں کے نصیب ہی کھل گئے ہیں۔ صرف اس لئے نہیں کہ رازی صاحب نے ہماری بچی کو ہیروئن سائن کیا ہے اور وہ ہمارے گھر تشریف لائے ہیں' بلکہ اس لئے بھی کہ آج نینا اور فائزہ بیگم جیسی ہستیوں نے اس گھر کو رونق بخشی ہے"۔

"اب ہم چلتے ہیں"۔ فائزہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ نینا اس کے ساتھ ہی اٹھی اور پھر سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

رازی صاحب نینا اور فائزہ سے مخاطب ہوئے۔ "ارے ہاں! میں تمہیں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ میں نے اس لڑکی رئیسہ کا فلمی نام ندیا رکھا ہے۔ کیسا ہے؟؟"

یہ سنتے ہی فریدہ کھل اٹھی۔ اس کے چہرے پر تعجب اور مسرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ رئیسہ کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو حیرت نمودار ہوئی مگر وہ پھر ہمیشہ کی طرح پرسکون ہو گئی لیکن فائزہ تو ایک ٹک رازی صاحب کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ نینا کی رنگت بھی ایک لمحے کے لئے پھیکی سی پڑ گئی۔ چند لمحے کے بوجھل سکوت کے بعد فائزہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ "نینا ..... اور ندیا ..... ! لگتا ہے بہت کچھ سوچ سمجھ کر رکھا ہے یہ نام آپ نے"۔

نینا اور "ندیا" اس وقت ایک دوسرے کے عین سامنے کھڑی تھیں۔ بیچ میں صرف ایک تپائی تھی۔ نینا نے اب گویا از سر نو اس کا جائزہ لیا۔ ندیا یعنی رئیسہ قد میں اس سے خاصی اونچی تھی۔ اس کے چہرے' اس کے خدوخال میں نینا سے زیادہ جاذبیت تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی آنکھیں تھیں۔ بلاشبہ وہ جادوگر آنکھیں تھیں۔

نینا انہی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فائزہ بھی کچھ کھو سی گئی تھی۔ شاید وہ اس انتہائی خاموش اور دھیمی لڑکی کے روپ میں اپنی بہن کی ایک قد آور اور طاقتور حریف کو ابھرتے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً یہی خوف اسے اور نینا کو یہاں تک کھینچ کر لایا تھا اور اسی لئے وہ ہر نقصان کی تلافی کرنے پر تیار ہو گئی تھیں۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شاید کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ رازی صاحب بات کے ایسے پکے ثابت ہوں گے۔

فریدہ کی خود اعتمادی اب اس حد تک بحال ہو چکی تھی کہ وہ بھی اپنی زبان کا رنگ دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے لئے ان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی تو لہجے میں بڑی مٹھاس لئے فائزہ سے مخاطب ہوئی۔ "وہ آپ ہماری ندیا کو دو چار ہزار روپے دینے کی بات کر رہی تھیں تو میں نے سوچا چلتے چلتے

آپ کی غلط فہمی دور کر دوں ..... ہمارا رہن سہن غریبانہ ضرور ہے مگر ہم اتنے بھو
نہیں ہیں ..... خدانخواستہ کبھی آپ پر آڑا وقت آئے اور دس بیس ہزار کی ضرور
پڑے تو ہم سے منگوا لیجئے گا"۔

"وہ وقت آنے سے پہلے ہم دونوں بہنیں زہر کھالیں گی جس دن ہمیں تمہار
ہاں سے کچھ منگانا پڑے"۔ فائزہ کے لہجے میں شعلوں کی تپش تھی۔

"اوہ معافی چاہتی ہوں ..... آپ تو برا منا گئیں"۔ فریدہ مصنوعی تاسف سے
بولی۔ وہ لوگ گاڑی میں جا بیٹھے۔ رازی صاحب وہیں رہے۔ نینا کی بڑی سے 'چر
کرتی گاڑی رخصت ہو چکی تو وہ لوگ واپس آ بیٹھے۔

فریدہ اور رازی صاحب چند لمحے مسکراتے ہوئے خاموشی سے ایک دوسرے کی
طرف دیکھتے رہے۔ آخر رازی صاحب اپنے بجھے ہوئے پائپ کو دوبارہ شعلہ دکھانے کے
بعد بولے۔ "بھئی بڑی تیز لڑکیاں ہیں۔ ہم جیسے گرگوں کے کان کترنے کی فکر میں
رہتی ہیں"۔

فریدہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رازی صاحب کی بلائیں لینی شروع کر
دے۔ وہ خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "رازی صاحب آپ نے تو ہمیں خرید
لیا"۔

رازی صاحب متانت سے مسکرائے۔ پھر فریدہ نے رئیسہ کو دیکھتے ہوئے خوشی
سے کہا: "اور یہ رئیسہ کا نام آپ نے خوب رکھا ..... ندیا!"

"پسند آیا؟" رازی صاحب مسکرائے۔

"بہت! لیکن آپ نے نام کیوں تبدیل کیا؟ رئیسہ کا نام تو فلمیں دیکھنے والوں
کے لئے اجنبی نہ تھا۔ آخر بچپن میں اس نے کئی فلموں میں کام کیا ہے"۔ فریدہ نے
پوچھا۔

"ہاں ..... ! بچپن کی بات اور ہے۔" رازی صاحب پائپ کا کش لے کر بولے۔
"مگر اب نئے اور خوبصورت نام کی ضرورت ہے۔ "رئیسہ" کے لفظ میں "فلمیت"

نہیں ہے"۔

"جی جی بالکل ٹھیک ہے"۔ فریدہ جلدی سے بولی۔ پھر وہ نہایت شکرگزارانہ
لہجے میں کہنے لگی۔ "رازی صاحب! ہمیں تو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ زبان
کے اتنے پکے ثابت ہوئے"۔

"فریدہ بیگم! میں در اصل یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ انسان
چاہے تو جھوٹ کی منڈی میں بیٹھ کر بھی سچ بول کر گزارہ کر سکتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ
نہیں بگاڑ سکتا۔ انسان چاہے تو بے اصولوں کے ہجوم میں گھر کر بھی اپنی اصول پسندی
برقرار رکھ سکتا ہے۔ کوئی اسے اس کے اصولوں سے نہیں ہٹا سکتا۔ ایک وقت آتا ہے
کہ لوگوں کو اسی کے اصولوں کے مطابق اس سے معاملہ کرنا پڑتا ہے۔"

فریدہ مسکراتے ہوئے بولی: "رازی صاحب! آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے
پاؤں مضبوط ہیں۔ آپ اپنے اصولوں پر جمے رہنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ بے چارے
کمزور آدمی کے تو ایک ہی ملے میں پاؤں اکھڑ جاتے ہیں"۔

"انسان اصولوں پر قائم رہنے کا حوصلہ تو کرے۔ اللہ تعالیٰ خودبخود اسباب پیدا
کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی جھولی بھی بھر دیتے ہیں۔ اس کے پاؤں بھی مضبوط کر
دیتے ہیں۔ میں نے انڈین فلم انڈسٹری سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ میں اس وقت
ریڈیو مرمت کرنے والا ایک معمولی مستری تھا اور جب میں نے اسٹوڈیو میں قدم رکھا تو
میری جیب میں کل تیس روپے تھے' لیکن میں شروع ہی سے بڑا اصول پسند آدمی تھا
اور یہی عہد کر کے اسٹوڈیو میں داخل ہوا تھا کہ اخلاقی اصولوں پر کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں
کروں گا خواہ ناکام ہی کیوں نہ رہوں ..... اور آج میں تمہارے سامنے ہوں۔ کیا کوئی
کہہ سکتا ہے کہ میں نقصان میں رہا؟"

فریدہ اور رئیسہ عرف ندیا دونوں ہی حیرت سے رازی صاحب کی طرف دیکھ
رہی تھیں۔ دونوں ہی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ فلم انڈسٹری میں بھی ایسا صوفیانہ مزاج
رکھنے والے لوگ موجود تھے جن کا اعلیٰ انسانی و اخلاقی اقدار پر اس قدر پختہ یقین تھا۔

رازی صاحب بولے۔ ”میری تو زندگی ہی یہ ثابت کرنے میں گزر گئی کہ
پسند آدمی کبھی نقصان میں بھی نظر آئے تو کہیں اس فائدہ میں ہوتا ہے۔ اس
میں یہ ثابت کرنے میں بھی لگا رہا کہ فلمی دنیا اتنی بری جگہ نہیں جتنی اسے لوگ
ہیں۔ بہت سے لوگوں نے مل جل کر اس کا امیج خراب کر دیا ہے“۔

فریدہ نے تائید میں سر ہلایا۔ رازی صاحب گویا‘ دل کا غبار نکالنے پر تلے
تھے۔ پائپ کا ایک طویل کش لے کر بولے۔ ”فلم بھی دوسری انڈسٹریز کی طرح
انڈسٹری ہے۔ ہر انڈسٹری کا اپنا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔ اس کا مزاج ذرا الگ
چونکہ شوبزنس کے زمرے میں آتی ہے اس لئے اس کی طرف لوگوں کی توجہ
مبذول رہتی ہے۔ اسکینڈلز دوسرے شعبوں میں بھی ہوتے ہیں مگر وہ خشک نوعیت
ہوتے ہیں اس لئے ان میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کے اسکینڈل ذرا رنگین
سنگین ہوتے ہیں اس لئے لوگ چٹخارے لے کر پڑھتے ہیں“۔

وہ مسکرائے اور ایک لمحے کے توقف سے بولے۔ ”بات بات پر فلمی دنیا
مثالیں دی جاتی ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے فلمی دنیا بڑی عبرت کی جگہ ہے۔ یہاں چڑھتے
سورج کی پوجا کی جاتی ہے حالانکہ میرے خیال میں یہ مثال دینا فضول ہے۔ پوری دنیا
ہی عبرت کی جگہ ہے مجھے بتاؤ وہ کون سا شعبہ ہے جس میں چڑھتے سورج کی پوجا نہیں
کی جاتی؟ یہ تو پوری دنیا ہی کا چلن ہے۔ فلم انڈسٹری تو اس دنیا کا ایک معمولی سا حصہ
ہے“۔

”آپ بالکل درست فرماتے ہیں رازی صاحب!“ فریدہ عقیدت مندانہ لہجے میں
بولی۔ ”ہم نے تو ان باتوں پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔“

”فلم انڈسٹری کو بدنام کرنے میں نینا اور اس کی سرپرست فائزہ جیسی لڑکیوں کا
بھی بڑا ہاتھ ہے جو بات بات پر جھوٹ بولتی ہیں‘ ذرا سے فائدہ کے لئے ادھر سے ادھر
لڑھک جاتی ہیں‘ کامیابی حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی جائز یا ناجائز ہتھکنڈے استعمال
کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔ مطلب نہ ہو تو آپ کو دھکے دے کر گھر سے نکلوا دیں

گی۔ جہاں بھی ایسے لوگ زیادہ تعداد میں ہوں گے اس شعبے کا امیج تو خراب ہونا ہی
ہے۔“

پھر وہ رئیسہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔ ”ندیا! اگر تم کامیاب ہو گئیں
تو کوشش کرنا کہ ایسی ہیروئن نہ بنو۔ تم بھی میری طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا
کہ ہر خاندان اور ہر شعبے میں اچھے لوگ پائے جا سکتے ہیں۔“

ندیا مسکرائی‘ اس کی مسکراہٹ میں پسندیدگی کی جھلک تھی۔ فریدہ بولی۔ ”خدا نہ
کرے جی‘ جو ہماری بچی ایسی ہو۔ اسے تو ہم نے بس آپ کی سرپرستی میں دے دیا
ہے۔ اب جیسی آپ چاہیں گے‘ یہ تو ویسی بنے گی۔“

”خیر..... یہ تو وقت بتائے گا“۔ رازی صاحب نے طویل سانس لی پھر جیسے انہیں
کچھ یاد آیا۔ کرسی پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”تمہیں معلوم ہے نا‘ کہ
نینا کراچی سے آئی ہے“۔

”معلوم کیوں نہیں ہے جی۔“ فریدہ معنی خیز سے انداز میں مسکراتے ہوئے
بولی۔ ”ہم انڈسٹری میں کسے نہیں جانتے؟ نئے ہوں یا پرانے ... کس کا حال ہم سے
چھپا ہوا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے وہ صحافیوں کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتی ہے کہ وہاں وہ سینٹ
جوزف کالج میں پڑھ رہی تھی‘ جب اسے فلم والوں کی طرف سے آفر آ گئی اور اس
نے بہت غور و خوض کے بعد اسے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا؟“ رازی صاحب بولے۔

فریدہ ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔ رازی صاحب سنجیدگی سے پائپ ہونٹوں میں دبائے
بیٹھے رہے۔ فریدہ کی ہنسی تھمی تو وہ ترحم آمیز سے انداز میں بولی۔

”بے چاری ..... ! کالج تو دور کی بات ہے اس غریب کو تو اسکول جانا بھی نصیب
نہیں ہوا۔ ہم بے شک یہاں بیٹھے ہیں لیکن کیا دور دراز والوں کو ہم نہیں جانتے؟ ان
کی ماں کسی زمانے میں .....“

”بس ..... بس۔“ رازی صاحب ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”ہم کسی کے

خاندان کے بخیے نہیں ادھیڑ رہے۔ ہمیں بھی خود پر فخر کرنا زیب نہیں دیتا۔ ہم ان فلمیں بیچ کر روزی کماتے ہیں۔ اپنے نجی معاملات کے بارے میں ہر شخص کو حق حا ہے کہ وہ انہیں ظاہر کرے یا نہ کرے۔ میرا کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اتنا منہ بھ کر جھوٹ بولنا کوئی ضروری نہیں ہوتا۔ انسان کوئی گول مول بات کر سکتا ہے' بات سکتا ہے ..... یا سیدھی طرح کہہ سکتا ہے کہ جی میرا تعلیمی یا خاندانی پس منظر کچھ ا زیادہ قابل رشک نہیں ہے' بس میں جو کچھ ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ اگر آپ بھی کہہ دیں گے تو کوئی آپ کا کیا بگاڑ لے گا؟ ایسا جھوٹ بولنے سے کیا حاصل' جس پیٹھ پیچھے مذاق اڑایا جائے"۔

فریدہ بولی۔ "میں فخر نہیں کر رہی ہوں لیکن تعلیم کا ذکر آیا ہے تو بتاتی چلوں ک ہماری رئیسہ ..... میرا مطلب ہے ندیا شاید موجودہ دور کی ہیروئنوں میں سب سے زیاد پڑھی لکھی ہے۔ میں نے اسے پرائیویٹ بی اے کرایا ہے۔ انگریزی لکھنا پڑھنا بھ جانتی ہے"۔ اس کے لہجے میں فخر جھلک آیا۔

"بہت خوب ..... یہ تم نے بہت اچھا کیا جو اس طرف بھی توجہ دی"۔ رازی صاحب نے سر ہلایا۔ "انسان کو تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہئے۔ تعلیم ہر شعبے میں ک کرتی ہے"۔

پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ "بھئی تمہارے ہاں نشست خوب رہی۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ نینا کی آمد سے ذرا ڈرامہ بھی پیدا ہو گیا۔ اس کی باتوں نے میری رگوں میں نیا جوش و خروش پیدا کر دیا۔ اب تو یہ میری انا کا مسئلہ بن گیا ہ کہ میری فلم "وفا" سپر ہٹ ثابت ہو"۔

"تو پھر آپ اس کا نام بدل کر "وفا" کی بجائے "انا" ہی رکھ لیں۔" ندیا دھیم لہجے میں بولی۔

رازی صاحب خوش دلی سے ہنسے۔ "ہاں بھئی مشورہ تو اچھا ہے۔ لیکن مسئلہ ی ہے کہ میں اپنی انا کو اسکرین پر لانا نہیں چاہتا"۔

پھر وہ اپنا بریف کیس سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ فریدہ اور استاد مکرم نے مصنوعی خلوص کے ساتھ اصرار کیا کہ وہ کچھ دیر اور بیٹھیں مگر وہ ان کی بات پر توجہ دیئے بغیر بولے۔ "فون تو غالباً" تمہارے ہاں نہیں ہے؟"

فریدہ نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولے۔ "خیر..... میرا آدمی آ کر تمہیں شوٹنگ کا شیڈول بتاتا رہے گا فی الحال تو ندیا کو کچھ اتنی مصروفیت نہیں ہے اس لئے مجھے اس سے ڈیٹس لینے کی ضرورت نہیں"۔

"جی نہیں۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بچی فل ٹائم حاضر ہے۔ دل و جان سے صرف آپ کا کام کرے گی"۔ فریدہ بولی۔

"میں کوشش کروں گا کہ تمہارے ہاں فون بھی لگ جائے تاکہ رابطے میں آسانی رہے"۔ رازی صاحب بولے۔

"بس جی' آپ جیسے لوگوں کی نظر کرم رہے گی تو سب کچھ ہو جائے گا"۔ فریدہ عاجزی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"تمہیں یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ میں وقت کا بہت پابند ہوں اور وقت کی پابندی کرنے والوں کو ہی پسند کرتا ہوں۔" رازی صاحب بولے: "لین دین کی فکر نہ کرنا۔ ہر شوٹنگ پر تمہیں قسطیں باقاعدگی سے ملتی رہیں گی"۔

"پیسوں کی تو اب بات ہی نہ کریں جی۔" فریدہ جلدی سے بولی۔ "آج آپ نے جس طرح اپنی زبان پر قائم رہ کر دکھایا ہے' اس سے تو یوں سمجھئے کہ آپ نے ہمیں بے دام غلام بنا لیا ہے۔ وقت کی پابندی کی بھی آپ بالکل فکر نہ کریں ہماری طرف سے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

ہیروئن ندیا کو لیا جا رہا تھا لیکن وعدے سارے فریدہ کر رہی تھی۔ تمام معاملات اسی نے طے کئے تھے حتیٰ کہ سائننگ کی معمولی اور رسمی سی رقم بھی اس نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی تھی۔

رازی صاحب کے جاتے ہی گھر میں جیسے بھونچال آ گیا۔ گھر کے باقی افراد جو

ابھی تک کمروں سے نہیں نکلے تھے' وہ بھی دوڑے دوڑے آئے۔ سب رئیسہ کو مبارکباد دے رہے تھے جو گزشتہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے دوران رئیسہ سے ندیا بن چکی تھی۔

فریدہ ایک نئے جوش و خروش سے اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ "میری جان! اس دن کے انتظار میں میری آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں ..... خیر..... میں سمجھتی ہوں کہ یہ دن پھر بھی میرے اندازے سے کچھ جلدی آ گیا ہے"۔

پھر وہ اسے ذرا پیچھے ہٹا کر اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"۔

ندیا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "کیوں نہیں ..... آپ سب لوگ خوش ہیں تو میں بھی بہت خوش ہوں"۔



رازی صاحب خود بھی وقت کی بہت پابندی کرتے تھے۔ ان کا اپنے بارے میں یہ دعویٰ درست ہی تھا۔ انہیں کوئی مالی مسئلہ بھی درپیش نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کی فلم "وفا" کی شوٹنگ بہت ہی سست روی سے شروع ہوئی۔ رازی صاحب کی تمام اصول پسندی اور سخت گیری کے باوجود کوئی نہ کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ مقررہ عرصے میں وہ جتنے مناظر عکس بند کرنا چاہتے اتنے نہ کر پاتے۔

رئیسہ نے ..... جو' اب ندیا بن چکی تھی' کافی طویل عرصے کے بعد اسٹوڈیو کا رخ کیا تھا اور اب وہ سمجھدار بھی ہو چکی تھی اب اسے اندازہ ہوا کہ فلم بنانا خاصا مشکل کام تھا۔ تاہم اسے اپنا کام بالکل مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس اسٹوڈیو جاتی..... جب حکم ملتا' میک اپ کروا کے سیٹ پر پہنچتی اور اپنے حصے کے مناظر عکس بند کروا کے واپس آ جاتی۔ اسے محض یوں لگتا جیسے وہ چند اجنبیوں سے کچھ دیر باتیں کر کے واپس آ گئی ہو۔

اس کی فلم کی رفتار دھیمی تھی لیکن فلمی دنیا میں اس کی آمد نہایت سنسنی خیز

ثابت ہو رہی تھی۔ جس اسٹوڈیو میں "وفا" کی شوٹنگ ہو رہی تھی' اسی سے ملحقہ دو اسٹوڈیو اور بھی تھے۔ تینوں اسٹوڈیوز میں یہ خبر بڑے زور و شور سے پھیل گئی تھی کہ رازی صاحب ایک نئی لڑکی کو ہیروئن کے طور پر متعارف کرا رہے ہیں۔

اس کے بچپن کے تھوڑے بہت کام کو سب بھول بھال گئے تھے۔ اسے فلمی دنیا میں ایک قطعی اجنبی اور نئی لڑکی سمجھا جا رہا تھا' اور جب رازی صاحب کوئی نئی لڑکی یا لڑکا متعارف کراتے تھے تو اسٹوڈیوز میں یہ ایک خبر ہوتی تھی۔ تینوں اسٹوڈیوز کے لوگ بہانے بہانے سے اسے دیکھنے آتے اور موقع ملتا تو اس سے بات چیت بھی کرتے ورنہ کچھ دیر منڈلاتے رہتے۔ ندیا کو احساس رہتا کہ وہ اردگرد سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔

پھر' فلمی صحافی اس کے گرد منڈلانے لگے۔ فوٹو گرافر کیمرے اٹھائے فلم کے سیٹ پر ہی نہیں' اس کے گھر بھی پہنچنے لگے۔ فریدہ ان کی بڑی خاطر مدارات کرتی اور ندیا کو بھی نصیحت کرتی۔ "بیٹی! یہ جو اخبار والے ہیں نا ..... ان سے بڑے اچھے اخلاق سے پیش آیا کرو۔ جتنی دیر بھی یہ بیٹھنا چاہیں ان کے پاس بیٹھا کرو اور جتنی تصویریں بھی یہ بنانا چاہیں بنوا لیا کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تمہاری فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی تمہیں ہیروئن بنا دیں گے"۔

وہ سچ ہی کہتی تھی۔ اسے یقیناً ان باتوں کا بڑا تجربہ تھا۔ ادھر اخباروں اور رسالوں میں اس کی بڑی بڑی رنگین تصویریں چھپنے لگیں' ادھر' فلم ساز اور ہدایت کار وغیرہ محض اسٹوڈیوز میں اس کے گرد منڈلانے کے بجائے اس کے گھر پہنچنے لگے۔

ہر کوئی "بے بی" کے لئے بڑی دھانسو قسم کی کہانی لے کر آ رہا تھا جس میں اس کا کردار نگینے کی طرح فٹ تھا اور ان کے خیال میں اسے صرف ندیا ہی کر سکتی تھی ..... حالانکہ ابھی اس نے ندیا کا کام دیکھا ہی نہیں تھا۔ فریدہ بہرحال رازی صاحب سے کیا ہوا معاہدہ نبھا رہی تھی۔ وہ سب سے معذرت کئے جا رہی تھی کہ ندیا کی پہلی فلم ریلیز ہونے تک کوئی دوسری فلم سائن نہیں کی جا سکتی تھی البتہ وعدے وعید سب سے

جاری تھے۔

سحافیوں کو انٹرویو دینے کے لئے فریدہ نے ندیا کو چند بنیادی باتیں رٹا دی تھیں جن کے مطابق ندیا کے والد ایک نہایت اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن جب ندیا چھوٹی ہی تھی تو ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد اس کی والدہ یعنی فریدہ بیگم نے خاصے نامساعد حالات میں اس کی پرورش کی تھی کیونکہ اس کے والد کی تمام دولت و جائیداد پر ان کے قریبی عزیزوں نے قبضہ کر لیا تھا اور انہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔

وہ کالج میں بی اے میں پڑھ رہی تھی جب ایک تقریب میں رازی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ اس کی شخصیت فلم میں کام کرنے کے لئے موزوں تھی لیکن اسے فلمی دنیا کا رخ کرتے ہوئے خوف آتا تھا کیونکہ اس نے یہاں کے بارے میں بہت الٹی سیدھی باتیں سن رکھی تھیں مگر پھر رازی صاحب نے اسے سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی' انسان خود اچھا ہو تو ہر جگہ اس کے لئے اچھی بن جاتی ہے ..... وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ فریدہ نے اسے ہدایت کی تھی کہ ہر انٹرویو میں اسے رازی صاحب کی لازما" بہت تعریف کرنی ہے کہ وہ بہت مہربان اور نہایت باصلاحیت شخص ہیں' ان کے محسن ہیں۔

ہر انٹرویو میں ندیا یہی رٹی رٹائی باتیں دہرا دیتی۔ چھوٹی موٹی اور غیر اہم باتیں وہ اپنی طرف سے بھی کر سکتی تھی۔ مثلا" اسے رنگ کون سا پسند تھا' کھانا کون سا اچھا لگتا تھا۔ یہ جوابات وہ اپنی طرف سے دیتی تھی اور انہیں میں گڑ بڑ ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ کہہ دیتی کہ اسے نیلا رنگ پسند تھا جس میں آسمان کی وسعتوں کا تاثر ملتا تھا اور کبھی کہہ دیتی کہ اسے سفید رنگ پسند تھا۔ کھانے میں کبھی وہ کہہ دیتی کہ اسے نرگسی کوفتے پسند ہیں اور کبھی وہ بگھارے بینگن کو اپنی پسندیدہ ڈش قرار دے دیتی۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ دنوں چیزیں اس نے کبھی نہیں کھائی تھیں!۔

وہ یہ سب باتیں اخباروں رسالوں میں پڑھتی تو اسے بڑی حیرت ہوتی۔ کیا وہ واقعی راتوں رات اتنی اہم ہو گئی تھی کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات ..... ہر غیر اہم بات' ..... ہر جھوٹی سچی بات من و عن چھاپی جا رہی تھی؟

ندیا کو یہ بھی یاد آیا کہ جب رازی صاحب پہلی مرتبہ اس کے پاس آئے تھے تو وہ نیینا کے بارے میں اس قسم کی باتیں کر کے بہت ہنس رہے تھے کہ وہ انٹرویوز میں اپنے بارے میں کتنا جھوٹ بولتی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ رازی صاحب نے اب کبھی یہ نشاندہی نہیں کی تھی کہ فریدہ کی ہدایات پر خود ندیا اپنے بارے میں کتنا جھوٹ بول رہی تھی!

وہ چونکہ صرف رازی صاحب کی فلم میں کام کر رہی تھی اس لئے اسے کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ شوٹنگز میں کئی کئی دن کا وقفہ آ جاتا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے اسٹوڈیو جاتے تقریبا" تین ماہ ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اس کی اپنے ہیرو سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

اسے پتا چلا تھا کہ ہیرو کے بھی چند مناظر عکس بند ہوئے تھے لیکن ان میں ندیا کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ کہانی کے مطابق ابھی ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہیرو الگ تاریخوں میں آیا تھا اور اپنے مناظر عکس بند کروا کے چلا گیا تھا۔

ہیرو کا نام ارمان تھا۔ اسے بھی فلمی دنیا میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا تاہم اس کی چھ سات فلمیں پیش ہو چکی تھیں اور تقریبا" سبھی کامیاب گئی تھیں۔ درحقیقت' ارمان اور نیینا کو ایک فلم میں اکٹھے متعارف کرایا گیا تھا۔ وہ ان دونوں کی پہلی فلم تھی جو سپرہٹ ہو گئی تھی۔

فلمی دنیا کی روایت کے مطابق اس کے بعد دونوں کے پاس فلموں کی لائن لگ گئی تھی اور دونوں بے پناہ مصروف تھے۔ دونوں کی آمد کو فلمی دنیا میں تازہ ہوا کے جھونکے سے تشبیہہ دی جاتی تھی کیونکہ دونوں کم عمر تھے۔ دونوں کے چہروں پر

تازگی تھی۔ نینا کے مقابلے میں ارمان کچھ ایسا کم عمر نہیں تھا لیکن اسکرین پر وہ [illegible] کم عمر ہی نظر آتا تھا اور نینا کے ساتھ اس کی جوڑی جچ گئی تھی۔

اس جوڑے کی فلمیں باکس آفس پر ہٹ جا رہی تھیں۔ ان کی غیر معمولی شہرت کو دیکھتے ہوئے رازی صاحب نے دونوں ہی کو اپنی فلم "وفا" میں لیا تھا۔ اب جبکہ نینا فلم سے علیحدہ ہو چکی تھی، رازی صاحب نے اس کی کمی ندیا سے پوری کرنے کا عزم کیا تھا۔ اب ان کی نظریں اس تجربے پر لگی ہوئی تھیں اور لوگ اس کا نتیجہ دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔

ندیا نے ارمان کی دو فلمیں دیکھی ہوئی تھیں لیکن عجیب اتفاق تھا کہ ابھی تک اس نے اسے حقیقی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ جن دنوں اس نے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا، ان دنوں ندیا اسٹوڈیوز نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی وہ ندیا بنی تھی۔ اب وہ بے پناہ مصروف تھا۔ اس اسٹوڈیو میں بھی اس کی کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی شوٹنگ چل رہی ہوتی تھی جو رازی صاحب کی ملکیت تھا اور جس میں ندیا نے اب تک زیادہ تر شوٹنگز کی تھیں ..... لیکن یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ابھی تک ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ندیا کو ارمان سے ملنے، اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا لیکن وہ اس اشتیاق کا اظہار نہیں کر سکتی تھی تاہم اسے معلوم تھا کہ آخر ایک روز تو ان کا سامنا ہونا ہی تھا۔

وہ دن جلد ہی آ گیا۔

اس سین کی شوٹنگ آن پہنچی تھی جس میں کہانی کے مطابق ہیرو، ہیروئن کی پہلی ملاقات ہونی تھی ..... بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہیں ایک دوسرے سے ٹکرانا تھا!

انہیں سچ مچ کالج کے کاریڈور میں ایک دوسرے سے ٹکرانا تھا۔ ہیرو صاحب اپنے دوست کے ساتھ ایک طرف سے عجلت میں آ رہے تھے۔ یہ دوست، فلموں کا لازمی جزو، یعنی کامیڈین تھا۔ دوسری طرف سے ہیروئن صاحبہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آ رہی تھیں۔ ہیرو، ہیروئن سے ٹکرا گیا۔ ہیروئن کی کتابیں گر گئیں۔ ہیرو نے معذرت

چاہی اور کتابیں اٹھا کر دینے لگا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ایک لمحے کے لئے دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے تیر نظر کے گھائل ہو گئے مگر بظاہر ہیروئن غصہ دکھانے لگی، برہم ہونے لگی اور ہیرو کو ڈانٹ پلانے لگی۔

وہ رومانی فلموں کا دور تھا۔ اسی قسم کی فلمیں پسند کی جاتی تھیں۔ نینا اور ارمان کی جوڑی جس فلم سے مشہور ہوئی تھی وہ بھی محبت کی کہانی تھی اور رازی صاحب بھی جس کہانی پر فلم بنا رہے تھے اس کا موضوع بحث ..... بلکہ بہت ہی شدید اور طوفانی محبت تھی جسے ایثار، سماجی اونچ نیچ کے المیہ اور وفا کی انتہا کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پر تاثیر بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ موضوع پرانا تھا مگر رازی صاحب اس میں اپنے انداز سے نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس روز فریدہ، حسب معمول بالکل صحیح وقت پر ندیا کو ساتھ لے کر اسٹوڈیو پہنچ گئی تھی۔ وہ لوگ اسٹوڈیو کے اس طویل برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے جہاں دفتروں کی قطار تھی۔ اسی برآمدے کو کالج کا کاریڈور دکھایا جانا تھا اور دفاتر کے بند دروازوں سے کلاس رومز کے دروازوں کا تاثر لیا جانا تھا۔ دفاتر کی تختیوں پر عارضی طور پر کاغذ چپکا کر ان پر فرسٹ ایئر..... سیکنڈ ایئر وغیرہ لکھ دیا گیا تھا۔

تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ ندیا اور اس کی سہیلیوں کا کردار ادا کرنے والی ایکسٹرا گرلز کا میک اپ بھی ہو چکا تھا۔ کیمرہ آ چکا تھا۔ صرف ارمان کا انتظار تھا جس کے بارے میں اس کے گھر سے اطلاع ملی تھی کہ وہ روانہ ہو چکا تھا۔ اس کی پہلی شوٹنگ آج ندیا کے ساتھ تھی۔ اس کے بعد اسے دوسری فلموں کے سیٹوں پر جانا تھا۔ ندیا دھڑکتے دل سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ آج پہلی بار حقیقی زندگی میں ارمان سے اس کا سامنا ہونا تھا۔

کیمرہ مین نے کیمرہ پہلے ہی اسٹوڈیو کے برآمدے کے قریب بنے ہوئے فوارے کے قریب رکھوا دیا تھا۔ وہ فوارے کے بھی ایک دو مناظر لینا چاہتا تھا۔ اس نے رازی صاحب سے اجازت طلب کی تو رازی صاحب کاٹ کھانے والے لہجے میں بولے۔

"فوارے کے شاٹس .....؟ وہ کس لئے؟"

"یونہی ..... ذرا سین میں خوبصورتی آ جائے گی۔ رازی صاحب آج خوش قسمتی سے فوارہ چل بھی رہا ہے ..... اور کچھ صاف ستھرا بھی نظر آ رہا ہے"۔ کیمرہ مین نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"احمق کہیں کے ..... ! اگر عقل پلے نہیں ہے تو ڈائرکٹر کے کام میں ٹانگ اڑانے کا مشورہ کیا تمہیں کسی حکیم نے دیا ہے؟ پاگل کے پتر! ہمارے کالجوں میں فوارے نہیں ہوتے"۔ رازی صاحب نے اسے جھاڑ پلائی: "مجھے تو یہ راہداری بھی کسی کالج کی راہداری نہیں لگ رہی لیکن کچھ مجبوری کی وجہ سے ..... اور کچھ سہولت کی خاطر یہاں شوٹنگ کر رہا ہوں۔ اکثر کالج والے تو ہمیں شوٹنگ کے لیے کالجوں میں گھسنے نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں' آپ لوگ فلموں میں کالجوں کے بارے میں جو خرافات دکھاتے ہیں اسے کالج کی چاردیواری سے باہر ہی رکھیں تو بہتر ہے۔"

کیمرہ مین نے جھاڑ سن کر کان دبا کر کیمرہ وہیں رکھوا دیا جہاں رازی صاحب نے بتایا تھا۔ رازی صاحب برآمدے کے قریب ٹہل رہے تھے اور بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے بدمزگی عیاں تھی۔ کبھی کبھی وہ زیر لب کچھ بڑبڑانے لگتے.....

آخر وہ با آواز بلند کہے بغیر نہ رہ سکے۔ "یہ فلم بنانا بھی بڑی ذلت کا کام ہے۔ نہ جانے کس کس کے نخرے سہنے پڑتے ہیں۔ خاص طور پر یہ آج کل کے لڑکے لڑکیاں تو بہت ہی کم ظرف ہیں۔ ادھر چار فلمیں ملیں ..... اور ادھر نخرے شروع ....."

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ فلمی دنیا میں رازی صاحب کا بڑا دبدبہ تھا۔ سب کان دبائے بیٹھے تھے اور سب کو یقین تھا کہ آج مقبول ترین ہیرو ارمان صاحب کی بھی کھنچائی ہو گی۔ وہ جتنی دیر سے آئے گا اتنی ہی زیادہ کھنچائی ہو گی۔

مزید کچھ دیر کے انتظار کے بعد رازی صاحب گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ "اتنی دیر میں تو آدمی ملتان سے یہاں پہنچ جاتا ..... اور وہ گلبرگ سے نہیں پہنچ سکا۔ یہ لوگ راتوں کو دیر دیر تک شوٹنگیں کر کے صبح دن چڑھے تک اوندھے پڑے سوتے رہتے

ہیں۔ ملازموں سے کہلوا دیتے ہیں کہ صاحب گھر سے روانہ ہو چکے ہیں۔"

پھر وہ اپنے اسسٹنٹ کی طرف متوجہ ہوئے جو خواہ مخواہ ادھر ادھر دوڑ بھاگ کر اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کلپ بورڈ اس کے ہاتھ میں تھا جس پر اسکرپٹ کے کچھ اوراق لگے ہوئے تھے۔ "پپو ..." انہوں نے اسسٹنٹ کو پکارا۔

وہ دوڑا دوڑا قریب آیا تو رازی صاحب بولے۔ "تم ٹیلیفون پر بھروسہ مت کرو۔ ٹیلیفون پر غچہ دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ارمان کے گھر چلے جاؤ۔ مجھے یقین ہے وہ جھوٹا اپنے بیڈروم میں ٹانگیں پسارے لیٹا ہو گا....."۔

اسسٹنٹ روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اندرونی گیٹ کی طرف سے ایک دراز قد نوجوان کسی کا سہارا لیے اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کے بازو سے پٹی لپٹی ہوئی تھی اور پٹی کے جھولے میں ہی بازو ٹکا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

"ارمان صاحب آ گئے ..... ارمان صاحب آ گئے ....." غلغلہ سا بلند ہوا۔

پھر کوئی حیرت سے بولا۔ "ارے ..... یہ کیا ..... ! ان کے تو بازو پر پٹی بندھی ہوئی ہے"۔

نوجوان کراہتا ہوا رازی صاحب کے قریب آن رکا۔ سب لوگ تیزی سے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "رازی صاحب مجھے معلوم تھا آپ ناراض ہو رہے ہوں گے ..... لیکن میں کیا کرتا ..... راستے میں میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

"ایکسیڈنٹ ..... !" رازی صاحب نے جیسے دل تھام لیا۔ شاید انہیں اپنی پوری فلم کی شوٹنگ کھٹائی میں پڑتی نظر آتی تھی۔ وہ اپنا غصہ بھول بھال گئے اور ذرا تشویش سے بولے: "کہاں ہوا ایکسیڈنٹ .....؟"

"اسی ملتان روڈ پر چوبرجی کے قریب ایک ٹرک والے نے راؤنڈ اباؤٹ پر اپنا ٹرک میری گاڑی میں مار دیا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ صرف بازو پر چوٹ آئی اور گاڑی کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچا ورنہ آپ کو تو پتا ہی ہے ٹرک والے تو جس کو

مارتے ہیں اس کے بچنے کی امید ذرا کم ہی ہوتی ہے"۔ ارمان نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔

"چلو خیر..... اللہ نے رحم کیا..... تھوڑی بہت چوٹ پر ہی بات ٹل گئی....." رازی صاحب ذرا سکون کی سانس لے کر بولے: "میرا خیال ہے شوٹنگ کینسل کر دیتے ہیں"۔

"نہیں ... نہیں .. شوٹنگ کینسل کرنے کی ضرورت نہیں۔" ارمان جلدی سے بولا۔ "شوٹنگ کی جلد بازی میں ہی تو یہ تکلیف اٹھائی ہے"۔

سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ کسی نے بھی ان دو لمبے تڑنگے آدمیوں کی طرف نہیں دیکھا جو نہ جانے کس طرف سے ٹہلنے کے سے انداز میں چلتے ہوئے برآمدے میں آن رکے تھے۔ وہ گہرے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیضوں میں تھے۔ دونوں ہی بھاری بھرکم تھے اور دونوں ہی کے گھنی مونچھیں تھیں۔

وہ دونوں ندیا کے قریب آ کر رکے تھے جو اس وقت ایک ٹک ارمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ندیا تم ہو؟" ان میں سے ایک نے نیچی مگر بھاری آواز میں پوچھا۔

"ہاں ..... کیوں .....؟" ندیا چونکتے ہوئے بولی۔ وہ جاگتی آنکھوں سے گویا کوئی خواب دیکھتے دیکھتے چونکی تھی۔

ان میں سے ایک شخص نے اچانک قمیض کے نیچے سے پستول نکال لیا اور دوسرے نے اسی طرح قمیض کے نیچے سے شیشے کا ایک جار نکال لیا جس میں پانی کی طرح کوئی بے رنگ سیال نظر آ رہا تھا۔

پستول والے نے پستول ندیا پر تان لیا۔ دوسرے بھاری بھرکم شخص نے نہایت پھرتی سے شیشے کے جار کا ڈھکنا کھولا۔ ندیا اس دوران میں گویا دم بخود بیٹھی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی مگر جونہی اسے احساس ہوا کہ جار کھول کر وہ بے رنگ سیال اس کے چہرے پر پھینکا جانے لگا ہے تو اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک لفظ لپکا..... اور وہ لفظ تھا۔ "تیزاب....."

کسی غیبی قوت نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا جا رہا تھا اور شاید اسی غیبی قوت نے اسے اتنی ہمت دی کہ وہ یکدم ہی کرسی سے نیچے لڑھک گئی۔ اس نے نہ تو چیخ ماری اور نہ ہی کسی اور طرح اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی۔ جبلت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیتی یا خوف کے عالم میں بازو لہراتے ہوئے اس شخص کو روکنے کی کوشش کرتی لیکن نہ جانے کس قوت نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اس قسم کی کوئی بھی کوشش اسے گزند سے نہیں بچا سکتی تھی۔

بس وہ ایک دم کرسی سے لڑھک گئی، یہی اس کے حق میں اچھا ہوا۔

وہ سارے کا سارا بے رنگ سیال اس کرسی پر آ کر گرا جس پر ایک لمحہ پہلے ندیا بیٹھی تھی۔ صرف ایک لمحے نے زمین آسمان کا فرق ڈال دیا تھا۔ اس ایک لمحے کی تاخیر سے بات کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ زندگی ندیا کو نہ جانے کہاں سے کہاں لے جا پہنچتی لیکن فی الحال کتاب زندگی کا یہ ورق اس طرح رقم ہونے سے رہ گیا تھا۔

کرسی مصنوعی چمڑے اور فوم کی تھی۔ اس پر جہاں جہاں تیزاب گرا تھا، وہاں

کھدبد کھدبد سی ہونے لگی تھی اور فوراً" ہی گڑھے پڑنے لگے تھے۔ اس وقت کی یہ تصور کرنے کا ہوش نہیں تھا کہ مصنوعی چہرے کی جگہ اگر انسانی کھال اور قوم کی ہ گوشت ہوتا تو اس وقت تیزاب نے اسے بھی اسی طرح گلانا اور جھلسانا شروع کر د ہوتا۔ یہ تصور ہی بڑا لرزہ خیز تھا۔

اسٹوڈیو کے اس برآمدے میں اس وقت بہت سے افراد موجود تھے لیکن شاید کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے تھا۔ حتیٰ کہ رازی صاحب بھی شاید بدحواس ہو چکے تھے۔ وہ کیمرہ مین کے قریب کھڑے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ کسی نے ان دونوں بدمعاشوں کو ان کی کاروائی سے روکنے کے لیے شور بھی نہیں مچایا تھا۔

بدمعاش' تیزاب کا جار خالی کر چکا تھا لیکن اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ اس پر وہ بھی بوکھلا گیا تھا اور اپنے ہاتھ میں موجود جار کو خالی دیکھ کر شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا اور وہ سکوت بھی صرف ایک لمحے ہی کا تھا۔

اچانک ایک طرف سے وہ دونوں تنومند آدمی دوڑتے ہوئے آئے جنہیں ندیا نے ہمیشہ گھر پر دیکھا تھا اور جنہیں' فریدہ' شیر خان اور احسان علی کہہ کر بلاتی تھی۔ ندیا کے لئے وہ دو پراسرار سے کردار تھے۔ اسے آج تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ دونوں درحقیقت کون تھے' اس گھر سے ان کا کیا تعلق تھا' اور وہ کیوں فریدہ کے اتنے وفادار تھے؟

ندیا کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آج وہ ان کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ فریدہ اور ندیا کو لینے کے لیے آج اسٹوڈیو سے گاڑی بھیجی گئی تھی۔ اس میں صرف وہ دونوں ہی آئی تھیں۔ شیر خان اور احسان علی نہ جانے کب اور کس طرح اسٹوڈیو پہنچے تھے۔ ندیا یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ شاید یہ ہر شوٹنگ پر ہی آتے ہوں لیکن اس کی نظروں سے اوجھل' آس پاس کہیں موجود رہتے ہوں۔

ندیا کرسی سے پھسل کر فرش پر ذرا سا کھسک کر ایک صوفے کی آڑ میں ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہولے ہولے کپکپا رہے تھے مگر وہ بالکل ہی بدحواس نہیں تھی۔ وہ یہ سارا منظر صوفے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ شیر خان اور احسان علی دونوں بھاری بھرکم اور دراز قد تھے مگر نہایت سبک اندام کھلاڑیوں کی طرح دو زقندوں میں ہی ان دونوں بدمعاشوں کے سر پر آن پہنچے تھے۔

یقیناً انہیں خطرہ کا احساس ہو گیا تھا کیونکہ وہ جب برآمدے کے کونے سے نمودار ہوئے تبھی ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ "مشن" پر آئے ہوئے دونوں بدمعاش بری طرح بوکھلا گئے۔ انہیں ایک تو ان کے مشن کی ناکامی نے بدحواس کر دیا تھا۔ دوسرے انہیں شیر خان اور احسان علی جیسے آدمیوں کی اچانک آمد کی بالکل توقع نہیں رہی ہو گی۔ شیر خان اور احسان علی نہ صرف شکل سے ہی خوفناک اور بارعب نظر آتے تھے بلکہ اس وقت تو ان کے ہاتھوں میں ریوالور بھی تھے۔

نامعلوم بدمعاشوں میں سے بھی ایک کے ہاتھ میں پستول تھا لیکن شاید وہ صرف ڈرانے کے لئے تھے۔ وہ گولی چلانے یا کسی اور طرح اپنا دفاع کرنے کی بجائے الٹے قدموں بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرے بدمعاش نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے گویا کسی خواب سے چونکتے ہوئے خالی جار پھینکا اور اپنے ساتھی کے پیچھے لپکا۔

شیر خان نے بلا تامل فائر کیا لیکن وہ دونوں برآمدے سے نکل چکے تھے۔ گولی ایک ستون پر لگی۔ دوسری گولی چلانے کی نوبت نہیں آ سکی کیونکہ رازی صاحب اپنی لحاتی بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے ان دونوں کے راستے میں حائل ہو گئے تھے اور چیخ کر بولے تھے۔ "بس' بس گولیاں مت چلاؤ ..... اسٹوڈیو میں سنسنی پھیل جائے گی' انہیں ویسے ہی پکڑنے کی کوشش کرو"۔

شیر خان اور احسان علی نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ انہوں نے مزید فائر نہیں کئے اور بدمعاشوں کے تعاقب میں بھاگے جو اس وقت تک اسٹوڈیو کے اندر والے چھوٹے گیٹ سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

رازی صاحب اور فریدہ لپک کر ندیا کے پاس پہنچے جو صوفے کی اوٹ میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے شکاریوں کے ڈر سے خرگوش کسی جھاڑی میں دبکا بیٹھا ہو۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے لوگ بھی بدمعاشوں کے غائب ہوتے ہی واپس آنے لگے۔ سب ندیا کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ کوئی اس کے لئے پانی لا رہا تھا' کوئی بوتل لینے دوڑا جا رہا تھا۔ رازی صاحب اور فریدہ نے ندیا کو اٹھا کر اسی صوفے پر بٹھایا جس کے پیچھے اس نے پناہ لی تھی۔

اس دوران اس کرسی کی مصنوعی چمڑے کی پوشش اور فوم کے کافی بڑے حصے کو تیزاب کھا گیا تھا اور اس میں کتنے ہی چھوٹے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے جس پر چند سیکنڈ پہلے ندیا بیٹھی تھی۔ وہ اب اس کرسی کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

فریدہ نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے اپنے پہلو سے چمٹا لیا تھا اور تسلیاں دے رہی تھی۔ "گھبرانا مت میری جان ..... میری بچی ..... ! میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم اسے برا نہیں' بلکہ اچھا شگون سمجھنا۔ اگر ابھی سے تمہارے ایسے دشمن پیدا ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہت بلندی تک جاؤ گی اور بڑے لوگوں کی زندگی میں اس قسم کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ تمہیں ان سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

رازی صاحب اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ "میرے اسٹوڈیو میں آج تک کسی کو اس قسم کی غنڈہ گردی کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس لیے میں آج تک حفاظتی انتظامات کی طرف سے بالکل بے پرواہ رہا ہوں' لیکن اب میں سکیورٹی کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ مین گیٹ پر بیٹھا ہوا محض ایک ڈنڈا بردار چوکیدار کافی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ اسٹوڈیو میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ بے چارہ ہر ایک کے بارے میں انکوائری تو نہیں کر سکتا' میں کچھ اور انتظامات بھی کرتا ہوں"۔

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر متاسفانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"حالت اور ماحول دن بہ دن خراب تر ہی ہوتا جا رہا ہے"۔

فریدہ پر سکون لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی : "انتظامات تو خیر آپ جو بھی مناسب سمجھیں' کر لیں ..... آپ کا اپنا اسٹوڈیو ہے ..... لیکن میں اس قسم کے واقعات سے پریشان ہونے یا ہمت ہارنے والی عورت نہیں ہوں اور نہ ہی میں اپنی بچی کو خوفزدہ ہونے دوں گی۔ ہم اتنے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں۔ ہم اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔ میں اس طرف سے کبھی غافل نہیں رہی۔ ہم نے ہمیشہ اپنا بندوبست رکھا ہے"۔

"ہاں' واقعی' فریدہ بیگم !" رازی صاحب تحسین آمیز سے لہجے میں بولے۔

"مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہارے آدمی شوٹنگ پر بھی تمہارے ساتھ آتے ہیں۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا"۔

"بعض لوگوں کا پس منظر میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے رازی صاحب !" فریدہ بڑی سمجھداری سے بولی : "انہیں صرف ضرورت کے وقت سامنے آنا چاہئے"۔

"ہاں' ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو"۔ رازی صاحب نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

ارمان گو کہ ندیا سے متعارف نہیں تھا لیکن اسے یقیناً معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کون تھی۔ ویسے بھی اس وقت تعارف کرانے کا کسے ہوش تھا۔ ایک عجیب سی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ تاہم جتنے لوگوں کو بھی کسی ایک طرف توجہ دینے کا ہوش تھا' ان کی توجہ کا مرکز ندیا ہی تھی۔ اس افراتفری کے دوران ارمان خاموشی سے ندیا کے قریب آ بیٹھا تھا۔

فریدہ کے بازو کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تو ندیا سیدھی ہو کر بیٹھی اور تب اچانک اس کی نظر اپنے قریب بیٹھے ارمان پر پڑی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی اور وہ آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں لئے' اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے گویا ندیا کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

ندیا نے آج پہلی بار حقیقی زندگی میں' اور وہ بھی اتنے قریب سے ارمان کو دیکھا تھا۔ اس کی رنگت میں ذرا سانولا پن تھا مگر اس کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔

اس کے سانولے پن نے تو گویا اس کی کشش اور بڑھا دی تھی۔ خصوصاً" اسکی آنکھیں بڑے غضب کی تھیں۔

اس کی صرف چند فلمیں پیش ہوئی تھیں لیکن انہوں نے دھوم مچا دی تھی۔ اس وقت وہ مقبول ترین ہیرو تھا۔ خصوصاً نو عمر لڑکیوں میں اس کی مقبولیت کے بڑے عجیب عجیب افسانے ندیا نے سنے تھے۔ کسی فلمی رسالے میں اس نے پڑھا تھا کہ ک کی لڑکیاں اس کی تصویریں کتابوں میں رکھتی ہیں اور جس روز اس کی فلم نمائش کے لئے پیش ہوتی ہے' سینما گھروں پر مردوں سے زیادہ خواتین کی لمبی لمبی قطاریں نظر آتی ہیں۔

آج ندیا کو اندازہ ہوا کہ اس کی مقبولیت بے وجہ نہیں تھی۔ وہ فوٹو جینک تو تھا ہی' اسکرین پر اپنی اصل شخصیت سے بھی زیادہ پرکشش لگتا تھا لیکن حقیقت میں بھی وہ خوبرو تھا۔ خصوصاً" اس کی آنکھیں بڑا غضب ڈھاتی تھیں اور ان آنکھوں میں ندیا کے لئے تشویش کی پرچھائیاں تھیں۔

ندیا کو اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرایا اور کسی قسم کی تمہید یا رسمیات وغیرہ کے بغیر بولا: "آج کا دن اچھا نہیں ہے' آغاز ہی اچھا نہیں ہوا ..... میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور تمہارے بدخواہوں کی سازش کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس لحاظ سے میں کہوں گا کہ آج کا دن اتنا بھی برا نہیں تھا۔ قدرت کو اتنی محنت سے بنائے ہوئے اس حسین چہرے کی بربادی منظور نہیں تھی"۔

اس کے لہجے میں کچھ ایسی اپنائیت اور بے تکلفی تھی جیسے وہ ندیا کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ ان کی شناسائی برسوں پرانی تھی' اور گویا آج بھی ہنگامہ شروع ہونے سے بہت پہلے ہی سے ان کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ فلموں میں بھی وہ عام سے مکالمے اسی ٹھہرے ٹھہرے انداز میں ادا کرتا تھا لیکن جو بات اس کے لہجے میں اس وقت تھی' وہ شاید فلموں میں کوشش کے باوجود پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

ندیا کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ بس ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ

جیسے سحر زدہ سی ہو گئی تھی۔ ارمان حوصلہ دینے کے سے انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "بس' اب ہوش میں آ جاؤ ..... خوف کو ذہن سے نکال دو' جو ہونے والی تھی وہ ٹل گئی ہے"۔

اس کے ہاتھ کے لمس نے ندیا کی رگ و پے میں بجلی دوڑا دی۔ ایک انجانی حرارت نے گویا اسے پگھلا کر رکھ دیا۔ وہ اب بھی کچھ نہ بول سکی۔

فریدہ قدرے ناگواری سے ارمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید پہلی ہی ملاقات پر ندیا سے ارمان کی یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ ندیا کو بازو سے اپنی طرف کچھ اور کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ "میری بچی بڑے حوصلے والی ہے"۔

ارمان کو گویا فریدہ کی ناگواری کا احساس ہو گیا۔ وہ ذرا پرے کھسکتے ہوئے گہری سانس لے کر مربیانہ لہجے میں کسی کو خاص طور پر مخاطب کئے بغیر بولا۔ "لوگ سمجھتے ہیں فلمی ستارے ہر وقت جنت کی فضاؤں میں رہتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ بے چارے فلمی ستارے ہر وقت کن کن خطرات میں گھرے رہتے ہیں"۔

وہ ذرا دور ہٹا تو ندیا جیسے انوکھے اور مدہوش کن خیالات کی دنیا سے باہر آئی اس نے فریدہ کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ فریدہ پیار سے اس کا رخسار تھپتھپانے لگی' پیار جتانے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ رازی صاحب متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے مگر کسی گہری سوچ میں تھے۔

اس دوران شیر خان اور احسان علی ہانپتے ہوئے لوٹ آئے۔ ریوالور اب ان کے ہاتھوں میں نہیں تھے۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ رازی صاحب تیزی سے آگے بڑھ کر ان سے مخاطب ہوئے۔ "کیا ہوا ان میں سے کوئی ہاتھ نہیں آیا؟"

شیر خان محض نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔ احسان علی بتانے لگا: "وہ ..... جو اسٹوڈیو کی ادھر والی دیوار ہے نا ....." اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا: "وہ دونوں ادھر بھاگے' دیوار کے ساتھ پرانا اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر پڑا ہے ..... اس پر چڑھ کر دیوار پر چڑھے اور

دوسری طرف کود گئے .....“

”تم دیوار پر نہیں چڑھے؟“ رازی صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔

”چڑھے تھے جناب!“ احسان علی گہری سانس لے کر بولا۔ ”لیکن دوسری طرف ایک کار تیار کھڑی تھی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ وہ کار میں بیٹھے اور کار زناٹے سے ملتان روڈ کی طرف نکل گئی“۔

”اوہ .....“ رازی صاحب نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ”تم نے کار کا نمبر نہیں دیکھا؟“

”کار پر نمبرپلیٹ ہی نہیں تھی سر!“ احسان علی نے جواب دیا۔ ”کم از کم پیچھے کی طرف تو نہیں تھی‘ اور ہم اسے صرف پیچھے ہی سے دیکھ سکے“۔

”چلو جی ..... دفع کرو۔“ فریدہ بولی۔ ”ہمیں تو خوشی یہ ہے کہ ہماری بچی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کرائے کے ٹٹو بھاگ گئے تو بھاگنے دو“۔

” یہ ..... یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“ ارمان ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کے خیال میں یہ کرائے کے لوگ تھے تو انہیں کس نے بھیجا ہو گا؟“

فریدہ سے سوال ارمان نے کیا تھا لیکن فریدہ نے جواب دیتے ہوئے رازی صاحب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”یہ میں اور رازی صاحب اچھی طرح سمجھتے ہیں .....“

”لیکن ہم ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتے“۔ رازی صاحب نے جلدی سے گویا جملہ مکمل کیا۔

”جی ہاں .....“ فریدہ نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا: ”ویسے بھی یہ میری بچی کی ہیروئن کے طور پر پہلی فلم ہے۔ میں جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ذرا میری بچی کے پاؤں جم جائیں‘ پھر دیکھوں گی کون اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے؟ اس کی آنکھیں نکال کر ہاتھ پہ رکھ دوں گی“۔

وہ گویا ارمان سمیت‘ وہاں موجود سب لوگوں کو سنانے کے لئے یہ بات کہہ رہی

تھی پھر شاید اسے کچھ خیال آیا اور وہ تصحیح کرنے کے سے انداز میں بولی۔ ”مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ندیا کے پاؤں جمنے تک ہم اس قسم کی حرکتیں برداشت کرتے رہیں گے۔ اب ہم ہوشیار رہیں گے۔ آئندہ اگر کسی نے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔ پھر ہم اسے بھی دیکھ لیں گے اور اسے بھیجنے والوں کو بھی“۔

ایک اسسٹنٹ نے آگے بڑھ کر مودبانہ لہجے میں رازی صاحب سے پوچھا۔ ”سر! کیا پولیس کو فون کر دوں!؟“

رازی صاحب نے مشورہ طلب نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گویا فیصلہ فریدہ پر چھوڑ دیا تھا۔ فریدہ بولی۔ ”میں فی الحال کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں ندیا خاموشی اور سکون سے یہ فلم مکمل کر لے۔ اس کی یکسوئی میں فرق نہ پڑے۔ یہ فلم اس کے لئے بہت اہم ہے۔ پولیس آئے گی تو اسکینڈل بنے گا۔ سو طرح کی باتیں ہوں گی۔ بات کو نہ جانے کون کیا رخ دے دے“۔

”سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا .....“ رازی صاحب اپنے جھالر نما بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پر خیال لہجے میں بولے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ وہ اس صوفے کے عین مقابل ایک اسٹول پر آ بیٹھے جس پر فریدہ‘ ندیا اور ارمان بیٹھے تھے۔

فریدہ کی طرف جھک کر وہ ذرا نیچی مگر پرجوش سی آواز میں بولے۔ ”ویسے یہ پبلٹی کا بھی سنہری موقع ہے۔ اگر ہم صحیح طرح اس موقعے سے فائدہ اٹھائیں تو ندیا کو‘ اور اس فلم کو لاکھوں کی پبلٹی مفت حاصل ہو جائے گی۔ شو بزنس کے تو اکثر اسکینڈل اداکاروں کو نقصان نہیں‘ فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ پولیس اور پریس کو میں سنبھال لوں گا۔ اسکینڈل کو کسی غلط رخ پر جانے نہیں دوں گا“۔

فریدہ نے ایک لمحے کو سوچا پھر نیم رضامندی سے بولی۔ ”بات تو آپ کی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ سوچ سمجھ لیں‘ آپ ان معاملات میں ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔

فائدہ کی بات ہے تو بسم اللہ"۔

"کیا خیال ہے ارمان؟" رازی صاحب نے اسے بھی مشورہ میں شریک کرتے ہوئے پوچھا۔

ارمان مسکراتے ہوئے بولا۔ "اگر مجھے بھی اس پبلسٹی میں معقول حصہ ملے تو میرا مشورہ یقیناً اس کے حق میں ہو گا"۔

"بھئی ظاہر ہے اس واقعے میں تمہارا ذکر تو لازماً آئے گا"۔ رازی صاحب نے اسے اطمینان دلایا۔ "آخر تم اس فلم میں ندیا کے ساتھ ہیرو ہو، اس وقت تم بھی شوٹنگ کے لئے موجود تھے، اور اوپر سے آج ہی تمہارا بھی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ یہ تو خود اپنی جگہ ایک خبر ہے ..... دو خبریں یکجا ہو جائیں گی۔ بڑی ٹھیک ٹھاک کوریج ملے گی"۔

ارمان نے یوں اپنے پٹیوں میں لپٹے ہوئے بائیں بازو کو دیکھا جیسے وہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے، بلکہ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ ایک ہنگامی قسم کی پریس کانفرنس کر ڈالتے ہیں۔ میں بہت مصروف ہوں لیکن اس کام کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لوں گا"۔

"آج شوٹنگ کینسل ہی کرنا پڑے گی، لیکن یہ شوٹنگ سے زیادہ فائدے کا کام ہو گیا"۔ رازی صاحب اس واقعے کے تمام اثرات کو بھول کر بے پناہ خوش دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوئے: "تم فوراً پولیس کو فون کرو۔ اگر ایس ایچ او فیاض تھانے میں موجود ہوا تو اسے میرا سلام کہنا"۔

شیر خان نے بھاگتے ہوئے بدمعاشوں پر جو فائر کیا تھا، اس کی آواز اسٹوڈیو میں کافی دور تک سنی گئی تھی۔ ویسے بھی اب تک اس واقعے کی اطلاع سنسنی خیز سے انداز میں پورے اسٹوڈیو میں پھیل چکی تھی۔ اس وقت اسٹوڈیو میں زیادہ لوگ موجود نہیں تھے، لیکن جتنے بھی تھے، وہ یکے بعد دیگرے متجسس انداز میں چلے آ رہے تھے۔ رازی

صاحب اس ہجوم کو دیکھ کر کچھ گھبرا رہے تھے۔ شوٹنگ کی تو اب کوئی امید ہی نہیں رہی تھی اس لئے انہوں نے باآواز بلند اعلان کیا: "پیک اپ ....."

ایک ہفتے بعد شوٹنگ دوبارہ شروع ہو سکی اور وہ ہفتہ خاصہ ہنگامہ خیز سا رہا۔ رازی صاحب نے واقعی ایک پریس کانفرنس کر ڈالی جسے اخبارات میں پہلے تو عمومی خبروں کے درمیان ذرا کم جگہ ملی لیکن بعد میں فلمی ایڈیشنوں اور فلمی رسائل میں خوب نمایاں جگہ ملی۔ ندیا کی بڑی بڑی رنگین تصویریں شائع ہوئیں۔ اس کی کوئی فلم منظر عام پر آنے سے پہلے ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ فلمی دنیا میں ایک ستارے کا اضافہ ہو چکا تھا جسے نہ جانے کس کس نے اپنی حریف سمجھا تھا کہ اس کے چہرے پر تیزاب پھنکوا کر اسے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

اس کے بعد سے ندیا اکثر ہی ان خبروں میں رہنے لگی۔ گاہے گاہے اس کے جو انٹرویو چھپتے رہے تھے، وہ اس شہرت کے علاوہ تھے۔ خود ندیا کو بڑا عجیب لگتا تھا کہ اسکی کوئی فلم دیکھنے سے پہلے ہی راہ چلتے لوگ اسے پہچاننے لگے تھے۔ اس سے آٹو گراف لئے جانے لگے تھے۔ اس طرح اپنی شناخت بن جانے کے احساس میں ایک خفیف اور بے عنوان سی لذت پوشیدہ تھی۔

شہرت کے احساس کے ساتھ اسے پہلی مرتبہ اپنے "زندہ" ہونے کا بھی احساس ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو مردہ ہی تصور کرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس کے دل میں جینے کی امنگ ہی نہیں تھی۔ اس کے وجود میں ایک عجیب یخ بستگی اور افسردگی سی پھیلی رہتی تھی مگر اب جیسے دھیرے دھیرے اس کے اندر سے برف پگھل رہی تھی۔

"کہیں اس کی وجہ درحقیقت ارمان تو نہیں تھا؟" اس نے بارہا دل ہی دل میں اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا۔ اسے کوئی واضح جواب نہیں ملا تھا مگر محض اس سوال پر ہی اس نے اپنے آپ کو چور چور سی محسوس کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ پہلے دن سے ہی ارمان کی طرف کھنچی چلی جا

رہی تھی۔ اس میں شاید ارمان کے روپیے کو بھی دخل تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ فلم
بھی ایسی تھی۔ وہ محبت کی کہانی تھی۔ ایک نو عمر لڑکی اور ایک کھلنڈرے نوجوان کے
طوفانی عشق کی پرگداز داستان ..... !

فلم میں زیادہ تر کام بھی انہی دونوں کا تھا۔ ان کی اکٹھے شوٹنگ مسلسل چل رہی تھی۔ اسٹوڈیو سے باہر ایک گانا بھی عکس بند ہو چکا تھا۔ فلم کے مناظر بہت ہی خوبصورت مکالموں سے آراستہ تھے۔ ایسے ہی مکالمے جو دو نو عمر' محبت کرنے والوں کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے تھے۔ لیکن جب ارمان یہ مکالمے ادا کرتا تو یوں لگتا جیسے یہ اس کے دل کی آواز تھی۔

ویسے بھی اس کی چند فلمیں پیش ہوتے ہی اس کے بارے میں ناقدین اور فلمی مبصروں کی یہ رائے بڑے تواتر سے سامنے آئی تھی کہ وہ رومانی کردار بڑی عمدگی سے ادا کرتا تھا۔ اخباروں میں فلموں کے اشتہاروں میں بڑے جلی حروف میں اسے "رومانس کا شہزادہ" کا خطاب دیا جاتا تھا۔

رازی صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ بہت کم کسی کے کام سے مطمئن ہوتے تھے۔ آرٹسٹ کی جان نکال لیتے تھے۔ نئے لوگوں کو تو ان کے ساتھ کام کرنا بہت ہی مشکل لگتا تھا' لیکن ارمان کے کام سے وہ بھی بہت مطمئن نظر آ رہے تھے۔ بہت کم ری ٹیکس ہوتی تھیں۔

کیا اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ارمان اس کردار میں ڈوب کر رہ گیا تھا؟ ندیا اکثر اپنے آپ سے سوال کرتی۔ کیمرے کے سامنے وہ جب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا۔ "تمہیں میرے عشق کی گہرائی کا اندازہ ہی نہیں ہے ..... مجھے عشق میں! آزمانا مت ..... پچھتاؤ گی ..... کیونکہ میں عشق میں جان بھی دے سکتا ہوں"۔

ندیا کو یوں لگا جیسے اس قسم کے مکالمے ادا کرتے وقت اس کا ذہن کہیں اور چلا جاتا تھا۔ وہ کھوسا جاتا تھا۔ یوں لگتا جیسے یہ محض اسکرپٹ سے رٹے ہوئے مکالمے نہیں تھے۔ وہ سچ مچ ندیا کو کسی بات کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ اس کی محویت کا اندازہ ندیا کو ان

روز ہوا جب ایسا ہی ایک سین اوکے ہو گیا۔ رازی صاحب نے باواز بلند "کٹ" بھی کہہ دیا لیکن ارمان ایک خوبصورت پارک کے پھولوں بھرے کنج میں ندیا کے دونوں ہاتھ تھامے کھڑا رہا اور سحرزدہ سے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ گویا اپنے گردوپیش سے بالکل بے خبر تھا۔ نہ جانے کیوں ندیا بھی اس سے ہاتھ نہ چھڑا سکی۔ وہ ارمان کی آنکھوں میں بھی ایک ارمان' ایک خواب دیکھ رہی تھی اور اس خواب کے طلسم میں خود اس کا بھی کھو جانے کو جی چاہا تھا۔ ایک غیر مرئی سی ندی تھی جس کا بہاؤ اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی' مزاحمت کر رہی تھی۔

آخر رازی صاحب نے ہانک لگائی۔

"ارمان میاں! اب تو لڑکی کے ہاتھ چھوڑ دو۔ بہت عشق جھاڑ چکے۔ اس سے زیادہ عشق ہم اس سین میں نہیں ڈال سکتے"۔

لفظوں کا بے رحم ہتھوڑا گویا ارمان کی سماعت پر اس طرح پڑا کہ اس کے احساسات مجروح ہو کر رہ گئے۔ وہ بری طرح چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آیا جو شاید اس وقت اسے بہت بری لگی۔ وہ سچ مچ تھوڑا سا کھسیانا نظر آنے لگا۔ لوکیشن پر موجود کئی افراد نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"آئی ایم سوری ..... رئیلی سوری ....." ارمان نے باآواز بلند رازی صاحب سے کہا' پھر وہ زیر لب ندیا سے مخاطب ہوا۔ "میں واقعی بھول گیا تھا کہ میں فلم کی شوٹنگ کر رہا ہوں"۔ اس نے ندیا کا ہاتھ چھوڑ دیئے۔

ندیا کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ اس نے دزدیدہ سی نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا' جو کافی دور ایک فولڈنگ چیئر پر بیٹھی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ رازی صاحب کے مذاق سے بھی وہ گویا بالکل محظوظ نہیں ہوئی تھی اور جب وہ بے پناہ سنجیدہ ہوتی تھی تو اس کے چہرے پر ہلکی سی سفاکی بھی جھلکنے لگتی تھی۔

شوٹنگ میں کچھ وقفہ آ گیا تھا۔ اسی پارک میں ایک گانا عکس بند کیا جانا تھا۔ اس

کے لیے کچھ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں وہاں واپس آ گئے جہاں یونٹ کے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کچھ فولڈنگ کرسیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے فریدہ کے قریب کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ ارمان اور ندیا کچھ فاصلے پر پڑی دو کرسیوں پر جا بیٹھے۔

عام طور پر انہیں شوٹنگ میں وقفے کے دوران بھی کوئی خاص بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا کیونکہ زیادہ تر وہ لوگوں میں گھرے رہتے تھے جو کام کی بھاگ دوڑ میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ ہنسی مذاق اور فقرے بازی بھی کرتے رہتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فریدہ ان کے قریب بیٹھی ہوتی تھی۔ اس کی نظر گویا تلوار کی دھار ہوتی تھی، جو ان کے درمیان ایک مخصوص فاصلہ حائل رکھتی تھی۔ وہ ہنسی مذاق کر سکتے تھے۔ ایک دوسرے پر فقرے چست کر سکتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں..... اور ندیا تو اس معاملے میں بھی کمزور تھی۔

اسے ہنسی مذاق کی عادت نہیں تھی۔ دوسروں پر جملے چست کرنا اسے نہیں آتا تھا جبکہ فلمی دنیا میں اسے لائٹ مین سے لے کر ڈائریکٹر تک سبھی بڑے بذلہ سنج، بڑے فقرے باز معلوم ہوتے تھے۔ جب ماحول پر شگفتگی کا غلبہ ہوتا تو اچھے بھلے سنجیدہ لوگ بھی اس رو میں بہتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بھی چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی میں حصہ لیتے تھے۔ ندیا محسوس کرتی کہ وہ لوگ ماحول کو شگفتہ رکھ کر درحقیقت اس تھکا دینے والے کام کے لئے اپنی توانائی بڑھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنے جذبوں کو مہمیز دیتے تھے۔

اس روز پہلی بار ندیا اور ارمان کو ذرا الگ تھلگ بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ اتفاق سے کوئی ان کے سر پر سوار نہیں تھا۔ یونٹ کے کئی افراد گانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ پلے بیک سیٹ کیا جا رہا تھا۔

ارمان، فریدہ کی طرف دیکھے بغیر نیچی آواز میں بولا: "یہ تمہاری ماں ہر وقت تمہارے سر پر کیوں سوار رہتی ہے؟" وہ ندیا کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ سر جھکائے اپنے جوتے کا فیتہ درست کر رہا تھا۔

ندیا ایک لمحے کے لیے بھونچکا سی رہ گئی۔ اس نے آج تک کسی کو فریدہ کے

بارے میں اس طرح بات کرتے نہیں سنا تھا۔ اس کے ذہن پر فریدہ کا تسلط بہت گہرا تھا۔ فریدہ اس کہنہ سال درخت کی طرح تھی جو اس کے وجود پر اگا ہوا تھا۔ اس کی جڑیں گویا فریدہ کی روح تک میں اتری ہوئی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے ایک عجیب سے احساس جرم کے ساتھ فریدہ کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر ان کی طرف متوجہ نہیں تھی اور چھوٹا سا ایک نفیس قسم کا پاندان اپنی گود میں رکھے، اپنے لیے پان بنا رہی تھی مگر نہ جانے کیوں ندیا کو احساس تھا کہ اس کی تمام تر توجہ انہی کی طرف تھی اور وہ کسی بھی لمحے اپنا پاندان اٹھا کر ان کے قریب آ کر بیٹھ سکتی ہے۔

ندیا کے منہ سے بے ساختہ نکلنے لگا تھا۔ "وہ میری ماں نہیں ہے" لیکن اس نے بہ مشکل اپنے آپ کو یہ کہنے سے باز رکھا اور کمزور سے لہجے میں بولی۔ "وہ بہت سمجھدار ہیں، میرا خیال رکھتی ہیں۔"

"تم کیا دودھ پیتی بچی ہو"۔ ارمان اب بھی اس کی ..... یا فریدہ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ اب وہ بظاہر اپنی پتلون کے پائینچے سے نادیدہ گرد جھاڑ رہا تھا اور اس کی آواز بدستور نیچی تھی۔ صرف ندیا ہی اس کی بات سن سکتی تھی۔

"میں ...... میں بچی تو نہیں ہوں ...... لیکن میں کچھ ایسی سمجھدار بھی نہیں ہوں۔" وہ ایک عجیب سی بے بسی سے بولی۔

"سہاروں کے بغیر دنیا میں نکلنا سیکھو گی تبھی تو سمجھ آئے گی۔" ارمان اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گہری سانس لے کر مربیانہ لہجے میں بولا۔ "انگلی پکڑ کر چلتی رہو گی تو ہمیشہ بے سمجھ اور محتاج ہی رہو گی۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو انڈسٹری میں آ کر قیامت برپا کر دیتی ہیں، اپنے معاملات خود طے کرتی ہیں، اور ان بڈھے کھڈوں سے بہتر طور پر طے کرتی ہیں۔ اپنی زندگی خود بسر کرتی ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ زندگی اپنی ہے، مگر اسے بسر کوئی اور کر رہا ہے۔" وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے، آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اب بظاہر گویا موسم کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

"میں ان کے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔" ندیا بولی۔

"ظاہر ہے' اس نے تمہیں چلنا سکھایا ہی نہیں۔" ارمان بولا "انسان تو اصل م وہ ہے۔ تم محض کٹھ پتلی ہو۔ تمہاری ڈوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔"

ندیا خاموش رہی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "تم نے کبھی آکاش بیل دیکھی ہے؟ اس کے بارے میں سنا ہے؟"

ندیا نے نفی میں سر ہلایا۔

ارمان بزرگوں کے سے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ کسی ناپختہ درخت کے پاس اُگتی ہے۔ اس سے لپٹ جاتی ہے' اور بس لپٹی ہی رہتی ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ دھیرے دھیرے درخت سوکھ جاتا ہے۔ ٹنڈ منڈ ہو جاتا ہے مگر بیل ہری بھری رہتی ہے۔ مجھے تمہارا انجام بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔"

ندیا کو اس کی باتوں سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے مجرمانہ سی نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب ٹانگیں پسارے' بغلوں میں ہاتھ دیئے' بڑے اطمینان سے پان چبا رہی تھی اور ایک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ندیا اس سے نظر چراتے ہوئے دھیمی آواز میں ارمان سے مخاطب ہوئی۔ "کوئی اور بات کیجئے نا۔"

"میرا تو تم سے نہ جانے کتنی اور کیا کیا باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن مجھے معلوم ہے میری کوئی بھی بات تمہاری اماں کو اچھی نہیں لگے گی۔ وہ تم پر پابندیاں لگائے گی۔ تمہیں تکلیف ہو گی اور میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچتے دیکھنا نہیں چاہتا کیونکہ ....."

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کیونکہ فریدہ اٹھ کر ان کی طرف آ رہی تھی۔ آخر وہ نہیں رہ سکی تھی۔ ایک خالی کرسی گھسیٹ کر وہ ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولی "آج تو ہمارے ارمان میاں بڑے اچھے موڈ میں ہیں۔ کیا مشورے دیئے جا رہے ہیں

اپنی ہیروئین کو"۔ لہجہ نہایت سرسری اور انداز گپ شپ کرنے کا سا تھا لیکن اس میں چھپے ہوئے تیکھے پن کو کوئی بھی صاحب احساس نہایت آسانی سے محسوس کر سکتا تھا۔

ارمان نے ہونٹوں پر نہایت خلیق سی مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی ناگواری کو کوئی بھی صاحب نظر نہایت آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔ "میں بھلا اس بے چاری کو کیا مشورے دے سکتا ہوں مجھے تو خود اس میدان میں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں"۔

"ارے نہیں ارمان میاں! یہ تو تمہاری انکساری ہے ورنہ تم تو اب ایک جانے اور مانے اسٹار ہو۔ آج کل تو جس نے تم جتنی فلمیں کر لی ہوں اور وہ ہٹ بھی گئی ہوں' اس کا تو دماغ آسمان پر ہوتا ہے"۔

"وہ کم ظرف ہوتے ہیں۔" ارمان ہنس کر بولا۔

ندیا ان کی گفتگو سنتے ہوئے بھی نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن تو اس گفتگو میں اٹکا ہوا تھا جو فریدہ کے آنے سے پہلے ہو رہی تھیں۔ ارمان کا ادھورا چھوڑا ہوا جملہ ایک تیر نیم کش کی طرح اس کے دل میں پیوست تھا اور اس کی رگ و پے میں ایک عجیب لذت آمیز سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ ارمان نے گویا اس کے دل میں مقید کسی طوفان کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے اپنے رخسار اور کانوں کی لویں تپتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے یخ بستہ سے وجود میں کوئی ایسا شعلہ فروزاں' کوئی ایسی برق تپاں بھی مقید تھی۔

وہ جملہ کیا ہو سکتا تھا جو ارمان کے ہونٹوں پر ادھورا رہ گیا تھا' ندیا نے اپنے آپ سے کئی بار پوچھا اور ہر بار ایک نئے مسرت آگیں تصور سے اس کے جسم میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ اس کا لہو گویا آتشیں سیال بن گیا۔

ارمان ایک لمحے کے توقف سے فریدہ سے مخاطب ہوا۔ "میں تو ندیا کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ فلم مجھے بڑی جان دار لگتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے میری اور ندیا کی جوڑی اس سے زیادہ مقبول ہو جائے جتنی میری اور نینا کی تھی۔"

"ارمان میاں! میں بڑا بول نہیں بولتی۔" فریدہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "تم ندیا کی پانچ سات فلمیں ریلیز ہو لینے دو۔ نینا تمہیں اپنے اصل ٹھکانے کی طرف دوڑتی نظر آئے گی۔ اول تو تمہیں اس ایک فلم کے بعد ہی اندازہ ہو جائے گا۔ ندیا کے خلاف یونہی تو پہلے دن سے سازشیں شروع نہیں ہو گئی تھیں نا۔"

"جی ہاں' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" ارمان نے سر ہلایا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا دھیان اب اس گفتگو میں نہیں تھا۔ اسے فریدہ سے بات کرنے کا یقیناً کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ محض مروت کے تحت ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بیٹھا تھا۔

اس دوران ڈانس ڈائریکٹر نے ان کے پاس آکر درخواست کی کہ وہ ان درختوں اور فوارے وغیرہ کے قریب چلیں جہاں گانے کے ساتھ ان کے رقص کے چند شاٹس لیے جانے تھے۔ ڈانس ڈائریکٹر انہیں ڈانس کی ریہرسل کرانا چاہتا تھا۔ ارمان اور ندیا اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیئے۔ ارمان نے گویا فریدہ سے جان چھوٹنے پر اطمینان کی گہری سانس لی۔

رازی صاحب بھی وہیں آ گئے جہاں ارمان اور ندیا ڈانس ڈائریکٹر کے ساتھ رقص کی ریہرسل کر رہے تھے۔ گانے کی عکس بندی ایک مشکل کام ہوتا ہے' اس میں ڈائریکٹر' ڈانس ڈائریکٹر اور کیمرہ مین' تینوں کو باقی فلم کی نسبت زیادہ محنت' زیادہ مغز ماری کرنا پڑتی ہے۔ ایڈٹ ہوکر جو گانا بہ مشکل تین ساڑھے تین منٹ کا رہ جاتا ہے' اس کی عکس بندی میں کم از کم پورا دن' اور بعض اوقات دو یا تین دن بھی لگ جاتے ہیں۔

ندیا کے معاملے میں ڈانس ڈائریکٹر اور رازی صاحب کو یہ آسانی تھی کہ وہ رقص کی تربیت حاصل کر چکی تھی۔ ارمان بھی رقص کی ہدایات کو جلد سمجھ لیتا تھا۔ ان کے اس قسم کے مناظر کی عکس بندی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ پلے بیک پر بار بار گانے کے بول دوہرائے جا رہے تھے۔ اور دونوں بار بار ان پر ریہرسل کر رہے تھے۔ اکتا دینے والا کام تھا۔ اسکرین پر جو گانا نہایت خوبصورت لگتا تھا۔ اس کی

عکس بندی میں اداکار سب سے زیادہ اکتاہٹ کا شکار ہوتے تھے۔ ایک ایک بول کے کئی ٹکڑے ہوتے تھے' اس طرح تکرار کے بعد ایک ایک شاٹ لیا جاتا تھا کہ جو لوگ بڑے شوق سے عکس بندی دیکھنے آتے تھے' وہ بھی اکتا جاتے تھے۔

اس دوران پلے بیک میں کوئی خرابی ہو گئی۔ ڈانس ڈائریکٹر اور رازی صاحب میز پر رکھی ہوئی ریکارڈنگ مشین کو دیکھنے چلے گئے۔ ارمان ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ندیا قریب ہی درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

دفعتاً ارمان نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ ندیا کے ہونٹ تھرتھرائے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے نہایت نیچی آواز میں پوچھا: "آپ کچھ کہنے لگے تھے؟"

"ہاں' کہنے تو لگا تھا.... لیکن چھوڑو .... ادھر میں کوئی بات کرنے لگوں گا' ادھر تمہاری اماں اٹھ کر یہاں آ جائے گی۔ اسے تو گویا ہونٹ ہلتے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کیا بات کرنے لگا ہے... بلکہ شاید وہ ہونٹ ہلنے سے بھی پہلے دل کی بات جان لیتی ہے۔"

"وہ بہت جہاندیدہ عورت ہیں۔" ندیا بولی۔

"ظاہر ہے۔" ارمان نے کندھے اچکائے: "بیٹیوں کو ہیروئن بنانے کے لئے فلم انڈسٹری میں لانے والی اکثر عورتیں جہاندیدہ ہوتی ہیں۔"

"آپ ان سے اتنے الرجک کیوں ہیں؟ ویسے وہ دل کی بری نہیں ہیں۔" ندیا نے نہ جانے کس جذبے کے تحت فریدہ کی وکالت کی۔

ارمان نے ایک بار پھر سر اٹھا کر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "یقین نہیں آتا کہ تم واقعی اتنی بھولی ہو۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "خیر... یہ تو تمہیں آگے چل کر اندازہ ہو گا کہ وہ کیا چیز ہے۔"

"آپ اصل میں کہنا کیا چاہتے تھے؟" ندیا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"بس یہی .... کہ جب سے میں نے تمہارے ساتھ کام شروع کیا ہے' مجھے کچھ

ہونے لگا ہے۔" ارمان اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ "میں عجیب عجیب باتیں سوچنے لگا ہوں۔" وہ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

"مثلاً"؟" ندیا کا دل گویا اس کی کنپٹیوں میں آکر دھڑکنے لگا تھا۔

"مثلاً" یہی کہ ... کاش تم سے ملاقات کسی اور جگہ پر' کسی اور طرح کے حالات میں ہوئی ہوتی! کاش وہ تمام مکالمے کسی اور کے لکھے ہوئے نہ ہوتے' جو ہم نے اب تک ادا کیے ہیں ... اور کاش ہم انہیں کیمرے کے سامنے نہ بولتے۔ کاش ہم اس پارک میں شوٹنگ کے لیے نہیں' اپنی مرضی سے سیرو تفریح کے لیے آئے ہوتے' کاش ایسا ہوتا' کاش ویسا نہ ہوتا!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "ایسے بہت سے "کاش" میرے دل میں مچل رہے ہیں۔"

ندیا نے دزدیدہ نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا مگر اس وقت کیمرامین اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا اور وہ اس سے بات کر رہی تھی۔ ندیا اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے مضطربانہ سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "یہ باتیں آپ نے اس سے پہلے نینا اور اپنی فلموں کی دوسری ہیروئنوں کے ساتھ بھی کی ہوں گی۔"

ارمان نے مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا گویا اسے ندیا کی بات سے دلی صدمہ پہنچا ہو۔

"تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" ندیا جلدی سے بولی۔ اسے گویا اندیشہ ہو چلا تھا کہ ارمان اس کی بات کا برا نہ مان جائے... اور اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ تصور اس کے لیے تکلیف دہ ہو چکا تھا... وہ بولی۔ "میں .... میں تو اصل میں یہ جتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں آپ کو زیادہ اچھی طرح نہیں جانتی ہوں۔"

"ہاں' یہ بات تمہاری صحیح ہے۔" ارمان نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

"جب تم مجھے جان لو گی تو تمہیں میری قدر ہو جائے گی۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں حقیقی زندگی میں جھوٹ نہیں بولتا۔ ہم کیمرے کے سامنے جو

جھوٹ بول لیتے ہیں' وہی کافی ہے۔"

"لیکن آپ کا ایک جھوٹ تو میں پکڑ چکی ہوں۔" ندیا مسکرائی۔

"کون سا جھوٹ؟" ارمان بری طرح چونکا۔

"یاد نہیں ....؟ جس روز میرا اور آپ کا پہلی بار آمنا سامنا ہوا تھا۔ اس روز ہمیں پہلی بار ایک ساتھ شوٹنگ کرنا تھی لیکن میرے چہرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش کی گئی تھی اور شوٹنگ کینسل ہو گئی تھی۔ اس روز آپ بہت لیٹ آئے تھے کیونکہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسی۔

ندیا کو اپنی تمام تر گھبراہٹ اور پریشانی کے باوجود اچھی طرح یاد رہا تھا کہ اس روز ارمان کے وائیں بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور بازو ایک پٹی ہی کے جھولے میں لٹکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ گویا فرض شناسی' کا ثبوت دیتے ہوئے بازو کو آستین کو چھپا کے شوٹنگ کرنے کے لیے تیار تھا۔ بقول اس کے' وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے رازی صاحب کا نقصان ہو مگر اس کے فوراً" بعد ندیا پر تیزاب پھینکنے والا واقعہ پیش آگیا تھا اور آخرکار شوٹنگ کینسل ہی ہو گئی تھی۔

دوسرے روز رازی صاحب نے ندیا سے ایک ہوٹل میں پریس کانفرنس کروا ڈالی تھی۔ ندیا بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی لیکن ارمان' فریدہ اور دیگر کئی لوگوں نے اس کی مدد کی تھی۔ رازی صاحب کی ہدایت ہر بات میں شامل رہی تھیں اور وہ اس کے شانہ بہ شانہ بھی رہے تھے۔ آخرکار وہ اس مرحلے سے گزر ہی گئی تھی اور سرخرو رہی تھی۔ وہ جب ہوٹل سے واپس آ رہے تھے تو اتفاق سے ارمان' فریدہ اور ندیا ایک ہی گاڑی کی پچھلی نشست پر تھے۔ رازی صاحب کچھ پیچھے اپنی گاری میں آ رہے تھے۔

دفعتاً" ندیا نے چونک کر پوچھا تھا۔ "ارمان صاحب! کل تو آپ کے دائیں بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آج بائیں بازو پر بندھی ہوئی ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟"

ارمان نے پہلے تو بوکھلا کر اگلی نشستوں کی طرف دیکھا تھا لیکن آگے موجود دونوں افراد اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے تب ارمان اطمینان سے بولا تھا۔ "دراصل

دائیں ہاتھ پر پٹیاں باندھ کر چھوٹے موٹے کاموں میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی مثلاً" کسی سے مصافحہ کرنا' کسی کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہنا ... اس لئے میں نے سوچا بائیں ہاتھ پر ٹھیک رہے گی۔"

"اس کا مطلب ہے آپ کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا؟" ندیا نے آنکھیں پھیلا کر اس کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا تھا۔ فریدہ ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی اور پان چباتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ارمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"خدا نہ کرے کہ میرا ایکسیڈنٹ ہو۔" ارمان نے شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "وہ تو بس یونہی چھوٹا سا ڈراما کرنا پڑا تھا۔ میں بہت لیٹ ہو چکا تھا نا ... فون پر ملازم سے جھوٹ بھی بلوا چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا' اب سیٹ پر پہنچوں گا تو رازی صاحب سے جھاڑ سننا پڑے گی۔ مشکل یہ ہے کہ رازی صاحب انڈسٹری کے بہت ہی سینئر بہت ہی بڑے آدمی ہیں' ورنہ چھوٹے موٹے اور نئے ہدایت کاروں کو تو میں خود ڈانٹ پلا دیتا ہوں۔ چنانچہ راستے میں تھوڑا سا بندوبست کرنا پڑا۔ ایک میڈیکل اسٹور سے پٹیاں وغیرہ لے کر میرے مینجر نے مجھے "حادثے کا زخمی" بنایا۔ آج میں نے مینجر کی مدد نہیں لی اپنا "گیٹ اپ" خود ہی کر لیا جس کی وجہ سے پٹیاں بائیں بازو پر منتقل ہو گئیں' لیکن خدا کا شکر ہے تمہارے سوا کسی نے دھیان نہیں دیا۔ خدا کے لئے اب زبان بند رکھنا۔ آپ بھی فریدہ بیگم ... پلیز..."

اس نے ندیا اور فریدہ بیگم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور ندیا اس کے اس انداز پر ہنسے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ نہ جانے کتنے برسوں میں پہلی بار وہ کھل کر ہنسی تھی اور یہ ہنسی مصنوعی نہیں تھی۔ اس کے جذبوں کی ساکت جھیل میں پہلی بار ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ احساس کی لہریں دائرہ در دائرہ پھیلتی چلی گئی تھیں۔

اس واقعے کی یاد نے ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی تھیں ارمان گہری سانس لے کر بولا۔ "اچھا.... وہ بات کر رہی ہو تم! بھئی وہ کچھ اور بات تھی۔ کام کے معاملے میں تو ایسے چھوٹے موٹے جھوٹ چلتے رہتے ہیں۔ میں تو انسان

محسوسات کی' جذبوں کی' محبتوں کی بات کر رہا ہوں۔"

بات پھر ادھوری رہ گئی کیونکہ ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے پے بیک کی خرابی دور کر دی تھی اور ڈانس ڈائریکٹر ان کے پاس لوٹ آیا تھا۔ وہ نئے سرے سے ندیا کو شاٹ سمجھانے لگا۔ ندیا کے دل میں ادھوری بات کے تیر نیم کش کی اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ کیا اس بات کے مقدر میں مکمل ہونا نہیں تھا؟ ندیا نے افسردگی سے سوچا۔

پھر یہ سوچ کر اس کی افسردگی کچھ اور بڑھ گئی کہ اگر ارمان نے بات مکمل کر بھی لی تب بھی کیا ہوگا؟ کون سا فرق پڑ جائے گا؟ پھر بھی یہ تصور بہرحال جاں فزا تھا کہ جو لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا' اس کا دل ندیا کے لیے دھڑک رہا تھا۔ کیا یہ حقیقت تھی؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی؟

کیمرے کے سامنے وہ کئی جذباتی اور محبت بھرے مناظر عکس بند کروا چکے تھے لیکن ان مناظر کے دوران میں کبھی ندیا کے محسوسات اس طرح اتھل پتھل نہیں ہوئے تھے۔ وہ کبھی حقیقی جذبوں کے مدوجزر سے نہیں گزری تھی' لیکن کیمرے سے ہٹ کر ارمان نے جو ادھوری سی بات کی تھی اس نے اس کے حواس پر جمی ہوئی برف پگھلا دی تھی۔

وہ گانا انہیں شام تک مکمل کرانا تھا اور یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ پورے یونٹ کو اس کوشش میں دانتوں پسینے آ رہے تھے لیکن گانے کا کام اسی روز سورج ڈھلنے تک مکمل کرنا ضروری تھا کیونکہ اس کے بعد ارمان کے پاس تاریخیں نہیں تھیں۔ وہ آؤٹ ڈور پر مری' کاغان وغیرہ جا رہا تھا اور اس کی واپسی کم از کم ایک ماہ بعد متوقع تھی۔

محض ہیرو کی مصروفیت کی وجہ سے ندیا کو پورا ایک ماہ گھر بیٹھ کر انتظار کرنا تھا کیونکہ وہ فی الحال صرف "وفا" میں کام کرنے کی پابند تھی تاہم رازی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ اس دوران وہ ندیا کے چند ایسے مناظر عکس بند کرنے کی کوشش کریں گے جن میں اس کا کام ارمان کے ساتھ نہیں تھا۔

شام تک وہ بے پناہ مصروف رہے۔ کیمرے کے سامنے سے ہٹ کر انہیں ہلکے پھلکے ہنسی مذاق کے علاوہ کوئی بات کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کے بعد فریدہ سائے کی طرح ان کے ساتھ رہی۔ اس کے علاوہ اس پر مشقت کام نے انہیں بے پناہ تھکا دیا تھا۔ گانا مکمل ہوا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا! اس وقت شام کے سرمئی سائے گہرے ہو رہے تھے۔

گھر واپس آ کر جب ندیا رات کو سونے کے لیے لیٹی تو اپنی تمام تر تھکن کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار ارمان کا چہرہ اس کی آنکھوں میں گھومنے لگتا تھا۔ اس قسم کی صورت حال کی عکاسی اس نے فلموں میں دیکھی تھی۔ ایسے افسانے پڑھے تھے۔ جن میں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خود فلموں میں کام کرنے والے بھی کیا حقیقی زندگی میں اپنی فلموں کا ایک کردار بن سکتے تھے؟

اس کے بعد ایک ماہ تک اسے ارمان کی صورت نظر نہیں آئی‘ مگر وہ صورت گویا اس کی نظر سے اوجھل بھی نہیں ہوئی۔ اس ایک ماہ کے دوران اس نے نہ جانے کتنی بار اس کے بارے میں سوچا۔ وہ گویا اسے ایک ادھوری بات کی زنجیر میں جکڑ گیا تھا۔

اب ان کے ہاں فون لگ چکا تھا۔ کبھی کبھی ایک موہوم سی امید کے ساتھ وہ ٹیلی فون کی طرف دیکھتی۔ شاید کبھی وہ مری سے اسے فون کرے.... شاید....!

پھر اسے دل ہی دل میں اپنے آپ پر ہنسی آ جاتی۔ یہ لفظ "شاید" بھی کتنے دلوں کی ڈھارس تھا! اسے خیال آتا کہ بفرض محال ارمان کا فون آ بھی جائے تو فریدہ ہی اٹھائے گی۔ فون صرف وہی اٹھاتی تھی کسی اور کو فون سننے کی اجازت نہیں تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ ارمان سے اس کی بات کرواتی۔ وہ اسے بڑی صفائی سے ٹال سکتی تھی۔

ایک اور خیال سے بھی اسے اپنے آپ پر ہنسی آتی۔ آخر وہ اتنی خوش فہم اور خوش گمان کیوں تھی؟ ارمان‘ مری اور کاغان میں نیبنا اور ایک دوسری ہیروئن کے

مختلف فلموں کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ ندیا کو فلمی دنیا کا زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ وہاں یونٹ کے لوگوں کے روز و شب کیسے گزر رہے ہوں گے۔ سنوفال‘ ہوٹل میں قیام‘ گھروں سے دوری‘ آزاد فضائیں‘ آزاد خیال لوگوں کی رفاقت.... ! کیا ایسے میں ارمان کو اس کا خیال آ سکتا تھا؟ وہ سوچتی رہی.... سوچتی رہی.... !

حتیٰ کہ ایک روز اسے پتا چلا کہ ارمان لوٹ آیا تھا۔ دو دن بعد "وفا" کی شوٹنگ کا پروگرام طے تھا۔ اسٹوڈیو میں سیٹ لگ رہا تھا۔ ندیا نے ہجر کے مارے ان لوگوں کی طرح بے تابی سے ارمان کا انتظار کیا تھا جن کے دل میں عشق کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں.... گو کہ اس نے بارہا اپنے آپ کو سمجھایا بھی تھا کہ ابھی تو بات کچھ بھی نہیں تھی !

اس روز وہ مقررہ وقت پر فریدہ کے ساتھ سیٹ پر موجود تھی۔ ارمان حسب معمول خاصی تاخیر سے آیا۔ رازی صاحب جیسے گھاگ آدمی کو بھی غچا دینے کے لئے اس کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ موجود ہوتا تھا۔ اس روز صبح تک بقول اس کے‘ اسے ایک سو چار بخار تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بیڈ سے اترنے سے بھی منع کیا تھا لیکن اس نے ڈاکٹر کی منت کی تھی کہ اس کا شوٹنگ پر پہنچنا ازحد ضروری تھا چنانچہ ڈاکٹر نے اسے ایک ایسا انجکشن لگایا تھا کہ بخار فوراً" نیچے آ گیا تھا۔ اس نے رازی صاحب کے سامنے دو چار چھینکیں بھی ماریں اور ناک سے شوں شوں کی آوازیں بھی نکالیں۔

رازی صاحب ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے تاہم اس کے بخار پر کوئی تبصرہ کئے بغیر اسے مکالمے یاد کرنے کی ہدایت کر کے کیمرہ مین سے تبادلہ خیال کرنے چلے گئے۔

رازی صاحب سے نمٹ کر ارمان اسکرپٹ ہاتھ میں لیے سیدھا ندیا کی طرف آیا۔ فریدہ کو رسمی سے انداز میں سلام کر کے وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیسی ہو ندیا؟"

"میں ٹھیک ہوں آپ سنائیے؟ سنوفال میں شوٹنگ کا تجربہ کیسا رہا؟" ندیا نے

دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اسے اپنی اس کمزوری پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ ارمان کے سامنے آتے ہی اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگتا تھا۔

"تجربہ بہت اچھا رہا، بہت اچھا وقت گزرا۔" ارمان ٹھہر ٹھہر کر بولا پھر جیسے ایک لمحے کے لئے اسے فریدہ کی بھی پرواہ نہ رہی اور وہ ذرا روانی سے کہہ گیا۔ "لیکن نہ جانے کیوں مجھے بار بار خیال آتا کہ کاش تم وہاں ہوتیں۔ تم بھی ان خوبصورت نظاروں سے محفوظ ہو سکتیں۔ کاش ان دونوں فلموں کی ہیروئن بھی تم ہوتیں؟"

ندیا تو اپنی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش ہی کرتی رہی گئی لیکن فریدہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"اطمینان رکھو ارمان میاں! وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے جب تمہاری ہر فلم کی ہیروئن ندیا ہوگی۔"

دفعتاً" رازی صاحب اس کے قریب آکر گویا اپنی ناگواری کو دباتے ہوئے بولے۔ "اگر تمہیں واقعی مکالمے یاد کرنے ہیں تو لوگوں کے ہجوم سے ذرا دور کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر یاد کرو۔"

ارمان اٹھ کر طویل و عریض فلور کے ایک کونے میں چلا گیا اور مکالمے یاد کرنے میں منہمک ہو گیا۔ فریدہ نے گویا سکون کی سانس لی۔ ندیا اپنا دھیان بٹانے کے لئے احمد فراز کے ایک مجموعہ کلام کے اوراق پلٹنے لگی جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی چند منٹ بعد فریدہ کو اٹھ کر واش روم جانا پڑا جو فلور پر نہیں تھا۔ اس کے لئے اسے فلور سے باہر جانا پڑا۔

اسے جاتے دیکھ کر ارمان جلدی سے اٹھ کر ایک بار پھر ندیا کے قریب آ گیا۔ اسکرپٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ بظاہر وہ اسکرپٹ اس کے سامنے کر کے گویا کوئی مشورہ کرنے لگا لیکن درحقیقت وہ اس کے نیچے سے ایک تہ شدہ کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے جلدی سے کہیں چھپا لو۔ یہ تمہارے نام میرا ایک بہت اہم خط ہے۔ میں نے پورے ایک مہینے میں یہ ایک صفحے کا خط لکھا ہے۔ مری اور کاغان میں ہر روز

شوٹنگ سے واپس آکر میں رات کے دو دو بجے تک بیٹھا ایک ایک لفظ سوچ کر لکھتا تھا۔ تب کہیں جاکر یہ خط مکمل ہوا۔ گھر جاکر تنہائی میں تم نے نہایت توجہ سے پڑھنا۔"

وہ گھٹی گھٹی آواز میں بول رہا تھا۔ ندیا کو اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑتے محسوس ہوئے۔ اس نے ایک لمحے سوچا۔ آخر اسکرپٹ کی آڑ میں اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھایا اور خط لے کر جلدی سے مجموعہ کلام میں رکھ لیا۔ کتاب کو اس نے سختی سے بھینچ لیا۔ اس کا دل گویا قفس جاں سے نکل جانے کو بے تاب تھا!



اس کے بعد شوٹنگ میں ندیا کا دل نہیں لگا۔ اس سے کئی غلطیاں بھی سر
ہوئیں جن کی وجہ سے بعض شاٹس کی کئی کئی مرتبہ ری ٹیکس ہوئیں حالانکہ ندیا کے
معاملے میں ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

بار بار اس کا دھیان اسی خط کی طرف چلا جاتا جسے اس نے فراز کے مجموعہ کلا
میں چھپایا تھا۔ کتاب اس نے اپنے بیگ میں رکھ لی تھی مگر بیگ فریدہ کے پاس تھا۔ با
بار اس اندیشے سے اس کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں کہ کہیں فریدہ اس کے بیگ سے
کتاب نکال کر، کھول کر نہ دیکھنے لگے اور کبھی اس تصور سے اس کے لہو کی گردش تیز
ہو جاتی کہ نہ جانے خط میں ارمان نے کیا لکھا ہو گا؟

کتنی عجیب بات تھی کہ ارمان کا امیج ایک رومانی ہیرو کے طور پر مستحکم ہو رہا تھا
فلم کے پردے پر وہ ان گنت پیار بھرے دلوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ خوبصورت جذبا
کے اتار چڑھاؤ سے سجے ہوئے مکالمے بولتا تھا۔ تو نہ جانے کتنے ہونٹوں پر یہ خاموش
صدا ہوتی تھی۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

مگر اسے خود اپنے دل کی بات کہنے کے لئے، اپنا ماجرائے قلب بیان کرنے کے
لئے کاغذ قلم کا سہارا لینا پڑا تھا اور چوروں کی طرح چھپ کر ندیا کو وہ خط دینا پڑا تھا۔ مگر
ندیا سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ ارمان کی نہیں، اس کی اپنی بدنصیبی تھی۔ اگر
فریدہ ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ نہ رہتی اور ندیا کی جنبش ابرو تک پر نظر

نہ ہوتی تو ارمان بھی اطمینان سے اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے شوٹنگ مکمل کی اور بڑی دشواری سے وہ رازی
صاحب کی خواہش کے مطابق کام کر پائی کیونکہ کام میں اس کا دل نہ لگ رہا تھا۔
دوسری پریشانی یہ تھی کہ اس دن کے سارے مناظر میں ارمان شامل تھا اور ارمان کو
دیکھ کر آج وہ مکالمے بھول رہی تھی۔

سین بھی طویل تھا اور ندیا کی ری ٹیکس کی وجہ سے اور بھی دیر لگی۔ شوٹنگ
ختم ہوتے ہی اس نے سکون کی سانس لی اور فریدہ کے ساتھ گھر روانہ ہو گئی۔ رازی
صاحب کی گاڑی انہیں واپس پہنچانے جا رہی تھی۔

عموماً ندیا شوٹنگ سے واپس آکر غسل کرتی تھی، لباس تبدیل کرتی تھی۔ پھر
اگر ٹی وی پر اس کے مطلب کا کوئی پروگرام ہوتا تھا تو وہ دیکھ لیتی تھی ورنہ شعر و ادب
سے تعلق رکھنے والی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس کے گھر میں تو کیا نگار خانوں
میں کتابوں کا کچھ زیادہ گزر نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی کے ہاتھ میں کوئی فلمی رسالہ
یا اخبار نظر آ جاتا تھا لیکن ندیا کو شعر و ادب سے شغف تھا اور اچھی کتابیں ہی اس کی
تنہائی کے لمحوں کی ساتھی تھیں، مگر اس روز وہ گھر آتے ہی سر درد کا بہانہ کر کے اپنے
کمرے میں بند ہو گئی۔ تجسّس اور اشتیاق اب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ
خط کو پڑھنے کے لیے بے تاب تھی۔ اسے خط کے مندرجات کے بارے میں ایک مبہم
سا اندازہ تو تھا لیکن بہرحال وہ اس کی زندگی کا پہلا محبت نامہ تھا، اور وہ بھی ایک ایسے
شخص کی طرف سے، جو خود لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا۔

وہ مسرت و انبساط اور سرور محبت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا فخر بھی محسوس
کر رہی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ اس وقت کے سب سے مصروف اور
سب سے مقبول ہیرو نے اسے خط لکھا تھا۔ اسے کوئی پیغام بھیجا تھا، اس سے حال دل
کہنا چاہا تھا۔ اس کی رگ وپے میں ایک عجیب سا خمار پھیلتا جا رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کر کے اس نے کھڑکیوں کے پردے پھیلائے،

لائٹ روشن کی اور بستر پر نیم دراز ہو کر اپنے بیگ میں سے کتاب نکالی۔ چند لمحے تک وہ اسے کھولے بغیر خواب ناک سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کے وجود میں سر سے پاؤں تک گدگدی سی ہو رہی تھی اور وہ ان لمحوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔

کتاب سے خط نکالنا بڑی رومانوی سی بات تھی۔ اس کی عمر بھی خوابوں کے تانے بانے بننے کی تھی مگر گھر کے سفاک اور کاروباری ماحول نے اس سے گویا اس کے خواب چھین لئے تھے۔ آج پہلی بار گویا کسی نے اس کے احساسات کے تار چھیڑے تھے تو وہ خوابوں کی دنیا میں ڈرتے جھجکتے قدم رکھنے لگی تھی۔

ارمان عمر میں اس سے یقیناً" خاصا بڑا تھا لیکن اسکرین پر کچھ ایسا بڑا نہیں لگتا تھا۔ ندیا نوخیز تھی مگر اس کا قد کاٹھ اچھا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے ذرا بڑی لگتی تھی لیکن چہرے پر بہرحال نو عمری کی تازگی و شگفتگی تھی۔ اسکرین پر ان کی جوڑی بڑی بھرپور اور تازہ دم لگتی تھی۔ فلمی صنعت اس وقت جن سپراسٹارز پر انحصار کیے ہوئے تھی' کم از کم ان کے درمیان تو ارمان اور ندیا کی جوڑی' کمسن اور نوخیز اداکاروں ہی کی جوڑی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ عرصے پہلے تک نیپنا اور ارمان کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ فلمی دنیا میں ان کی آمد تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند تھی لیکن اب یہی جملہ ارمان اور ندیا کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ رازی صاحب نے ان کی اب تک تیار ہونے والی ریلیں ایڈٹ کروا کے' اسٹوڈیو کے پروجیکشن روم میں چلوا کر دیکھی تھیں اور وہ نہ صرف ان کی کارکردگی سے مطمئن تھے بلکہ ان کی یہ بھی پیش گوئی تھی کہ ندیا کے ساتھ ارمان کی جوڑی اس سے بھی زیادہ مقبول ہو گی جتنی نیپنا کے ساتھ تھی۔

ندیا نے نہایت آہستگی سے کتاب کھولی۔ گلابی لفافے کو دیکھ کر اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور حواس پر خمار سا چھانے لگا۔ اس نے لفافہ کتاب سے نکالا تو اس کی انگلیوں میں ارتعاش تھا۔ چوروں کی طرح اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اندیشہ سا محسوس ہو رہا تھا کہ بند کمرے میں بھی کوئی اسے وہ خط پڑھتے دیکھ لے گا۔

آخرکار ہمت اور جرات سے کام لیتے ہوئے اس نے لفافہ چاک کیا۔ چھوٹے

چھوٹے خوبصورت الفاظ موتیوں کی طرح اس کے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی کنپٹیوں میں دھمک سی ہو رہی تھی۔ لہو کی گردش اتنی تیز تھی کہ ایک لمحے کے لئے الفاظ اس کی نظروں کے سامنے دھندلا گئے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا اور پڑھنا شروع کیا۔

اجنبی لڑکی!

سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیسے مخاطب کروں۔ آخرکار تمہیں "اجنبی لڑکی" لکھنا ہی موزوں محسوس ہوا ہے۔ حالانکہ تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو۔ مجھے تو یہی محسوس ہو رہا ہے جیسے میں تمہیں صدیوں سے جانتا ہوں اور اس سے پہلے صدیوں مجھے تمہاری تلاش رہی ہے۔

تمہیں یہ خط لکھتے وقت مجھے ہنسی بھی آ رہی ہے۔ اپنا یہ فعل بڑا احمقانہ سا لگ رہا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے پاس خط لکھنے کا وقت کہاں ہوتا ہے جبکہ مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ خط بہت طویل ہو جائے گا کیونکہ خیالات کا ایک سیلاب ہے جو میرے دل میں امنڈتا چلا آ رہا ہے۔ ہماری لائن کے لوگوں کو بھلا خط کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی ضرورت کہاں پیش آتی ہے۔ روز تو آمنا سامنا ہوتا ہے' ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ بے تکلفی سے باتیں ہوتی ہیں .... اور ہم کچھ ایسے چھوئی موئی سے لوگ بھی نہیں ہوتے۔ جس کو جس سے جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح کہہ ہی ڈالتا ہے۔ خط لکھنے کے جھنجٹ میں نہیں پڑتا لیکن مجھے مجبوراً" کاغذ قلم کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ تمہاری ماں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہتی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے تم سے دل کی بات نہیں کی جا سکتی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ تمہاری ماں ہے۔ اس کی اور تمہاری عادات' انداز و اطوار جدا ہیں۔ تم صرف اس سے ہی نہیں بلکہ پوری فلم انڈسٹری سے بہت مختلف قسم کی لڑکی ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم کسی شریف خاندان کی لڑکی ہو جبکہ فریدہ بیگم کے پس منظر سے تو ہم سب فلم والے اچھی طرح واقف ہیں۔

بہرحال' یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اس وقت اس پر بات کرنا مقصود نہ
اس وقت تو میں تمہیں' تمہارے بارے میں اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں
اب انہیں دل میں چھپائے رکھنا میرے بس سے باہر ہو گیا ہے۔ میں نے شو
کوششوں سے تمہارے تصور کو دور بھگانے کی کوشش کی لیکن بے سود....!
تمہیں اپنے تخیل سے قریب تر پایا اور اب اس جذبے سے مغلوب ہو کر ہتھیار
دیئے ہیں جسے محبت کہتے ہیں۔

محبت ایک ایسا مرض ہے جو ابتدا ہی سے لاعلاج ہوتا ہے لیکن زندگی کی سا
گرم بازاری بھی اسی کی بدولت ہے۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ محبت کے بغیر ا
اس چراغ کی طرح ہے جسے روشن نہ کیا گیا ہو۔ جب یہ شعلہ رگ جاں سے گزرتا
اور زندگی کا نچوڑ روشنی بن کر پھیلتا ہے تب زندگی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

میں نے کہیں ایک شاعر کا تذکرہ پڑھا تھا جس نے کسی کو اپنی محبت کا یقین دلا
کے لیے اپنا ہاتھ سب کے سامنے شمع کی لو پر رکھ دیا تھا لیکن مجھے یوں لگتا ہے
میں نے تمہاری محبت میں اپنا دل نکال کر شمع کے شعلے پر رکھ دیا ہے اور وہ قطرہ
شمع کے آنسوؤں کے ساتھ پگھل رہا ہے۔

تمہاری محبت نے مجھے ایک ضدی بچہ بنا دیا ہے جو چاند کو اپنے گھر میں دیکھنے
ضد کرتا ہے۔ تمہارے پیار کا درد میرے دل کے آنگن میں اتر آیا ہے اور میں
تمہارے احساسات سے آگاہ نہیں ہوں کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو
محسوس کرتی ہو ... اس لئے میں بڑی اذیت میں ہوں۔

میں رنگوں اور روشنیوں کی دنیا میں رہتا ہوں مگر میرے دل میں شام غر
جیسا اندھیرا ہے۔ لوگ ہماری اس دنیا کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر مجھے ابھی
اس سے چڑ ہونے لگی ہے۔ حالانکہ بقول شخصے' ابھی تو مجھے یہاں آئے جمعہ جمعہ
دن بھی نہیں ہوئے۔ یہ کیسی دنیا ہے جہاں ہم دن رات کیمرے کے سامنے' دو
کے لکھے ہوئے مکالمے بولتے رہتے ہیں مگر ہمیں خود اپنے الفاظ میں' اپنے جذبوں

اظہار پر قدرت نہیں ہوتی.... اور اگر کسی طرح ہم دل کی بات زبان پر لے ہی آئیں تو اس پر یقین نہیں کیا جاتا کیونکہ ہم سب خود بھی اس دنیا کو تصنع اور فریب کی دنیا سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بات پر اعتبار نہیں کرتے۔

یہاں سب نے اپنی ذات پر "فنکار" کا لیبل چسپاں کر رکھا ہے لیکن حقیقت میں کوئی فنکار نہیں۔ کیونکہ فنکار تو بڑے حساس' بڑے نازک دل کا مالک ہوتا ہے۔ بڑا سچا اور کھرا انسان ہوتا ہے۔ وہ بھلا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟ کیسے سن سکتا ہے ... کیسے برداشت کر سکتا ہے ؟ جبکہ یہاں بڑی کثرت سے جھوٹ بولا جاتا ہے.... لیکن مجھے یقین ہے تم ایک مختلف لڑکی ہو۔ تم سچ مچ اپنی ذات کے اندر ایک فنکارہ ہو.... سچی فنکارہ !

اس لیے تم میرے دل کی آواز ضرور سن لو گی۔ جو کچھ میں محسوس کر رہا ہوں' وہ تم بھی ضرور محسوس کر لو گی۔ یہ خط نہیں' میری بے لوث اور بیکراں محبتوں کے پھول ہیں.... اور پھول قبول کئے جاتے ہیں' ٹھکرائے نہیں جاتے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ جب میں یہ لکھوں گا کہ میں دل ہی دل میں تمہاری پرستش کرنے لگا ہوں تو تم یہ پڑھ کر میرا مذاق نہیں اڑاؤ گی.... وعدہ کرو کہ جب میں لکھوں گا کہ تمہارے سراپا کی خوشبو میری نس نس میں سما گئی ہے اور میرا اپنا وجود اس خوشبو میں کہیں کھو گیا ہے ... تو تم میرے الفاظ پر شک کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں نہیں مسکراؤ گی۔

جب میں لکھوں گا کہ میرے چاروں طرف تمہارے تصورات کا حصار ہے اور میں زندگی بھر اسی حصار میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا وجود نہیں چاہئے.... تو تم میرے الفاظ میں کھوکھلاپن تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ تم میری باتوں پر شک نہیں کرو گی کیونکہ شک کے سنپولئے نازک اور نوخیز محبتوں کو ڈس لیتے ہیں۔

میرے اظہار محبت کے لیے تو شاید ابھی الفاظ ہی تخلیق نہیں ہوئے۔ یہ خط تو محض اپنی بات تم تک پہنچانے کا ایک لنگڑا لولا سہارا ہے' ایک اشارہ ہے ... ایک استعارہ ہے۔ میں اپنے جذبوں کے اظہار کے لئے ہمیشہ ہی خطوں کا سہارا نہیں لینا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں وہ دن بھی جلد ہی آئے جب ہم خطوں کا سہارا چھوڑ کر ایک

دوسرے کی بانہوں کا سہارا لیں۔ جب ہمارے تخیل کو لفظوں کی تلاش میں نہ بھٹکنا پڑے بلکہ جذبے خود اپنی زبان کھولیں اور دل ان جذبوں کی شدت کو محسوس کرے۔

میں تمہارے ساتھ محض وقت گزاری نہیں چاہتا ندیا! اپنے خلوص نیت کا ثبوت دینے کے لیے میں صرف اتنا لکھ دینا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ فلمی دنیا کے سیانے گرگے کہتے ہیں کہ ایک ہیرو جب میرے مقام پر ہو یعنی ابھی عروج پر پہنچا ہی ہو اور اسے سپر اسٹار بنے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو تو شادی اس کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ شادی سے صرف ایک نئی ہیروئن ہی نہیں.... ایک نئے ہیرو کی مارکیٹ ویلیو کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی مقبولیت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن محبت میں اس قسم کے نفع و نقصان کی پروا نہیں کی جاتی۔ محبت کرنے والے ان باتوں کے بارے میں بھلا کہاں سوچتے ہیں ؟

مجھے پریشانی صرف یہ ہے کہ میں شاید یک طرفہ طور پر ہی یہ سب کچھ سوچ رہا ہوں۔ شاید میں محض خوش فہمیوں کا شکار ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں کہ تم میرے بارے میں کس طرح سے سوچتی ہو ... کیا سوچتی ہو.... آیا کچھ سوچتی بھی ہو یا نہیں؟ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ مستقبل کے بارے میں بیسیوں منصوبے بنانے ہیں۔ تم اگر مجھ سے محبت نہیں بھی کرتیں .... یا تمہارے جذبوں میں میرے جذبوں جیسی شدت نہیں ہے.... تب بھی تم کم از کم ایک بار مجھ سے ضرور ملو تاکہ بات کسی نتیجہ خیز موڑ پر پہنچ جائے۔ ہم دونوں صاف ذہن اور کھلی آنکھوں کے ساتھ اپنی اپنی منزل متعین کر سکیں۔ میری محبت تمہارے لیے قابل قبول نہیں ہوگی تب بھی میں کم از کم یکسو تو ہو جاؤں گا۔ بے شک یہ صدمہ میرے لیے ناقابل برداشت ہوگا لیکن میں لاعلمی کے اندھیرے سے آگہی کی روشنی میں تو آ جاؤں گا۔

تمہیں تمہاری عزیز ترین چیز کی قسم ہے' انکار نہ کرنا۔ تمہیں ایک بار مجھ سے ضرور ملنا ہوگا.... اور یہ ملاقات تخلیئے میں ہونی چاہئے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے لئے یہ ایک بہت مشکل کام ہے لیکن تمہیں اس مشکل سے گزرنا ہوگا۔ صرف ایک بار

.... میری خاطر.... ! پھر خواہ تم زندگی بھر شوٹنگ کے علاوہ کہیں مجھ سے نہ ملنا۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔

مجھے معلوم ہے تمہاری ماں تمہیں کسی بھی بہانے تنہا کہیں بھی جانے نہیں دے گی۔ اس سے چند گھنٹوں کے لیے بھی قطعی طور پر جان چھڑانا تو ممکن نہیں ہوگا' اس لئے تم اسے یہ تو بتا سکتی ہو کہ تم مجھ سے ملنے آ رہی ہو لیکن اس ملاقات کا مقصد تم اسے یہ بتانا کہ میں تمہیں کسی بہت بڑی اور بہت دولت مند پارٹی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم فی الحال رازی صاحب کی فلم کے لیے پابند ہو لیکن تم اپنی نام نہاد ماں کو بتانا کہ وہ پارٹی تمہارے اس فلم سے فارغ ہونے کا انتظار کرے گی۔ وہ مستقبل میں فلم سازی کے بہت بڑے منصوبے رکھتے ہیں اور ان کے پاس بے حساب دولت ہے لیکن پہلے وہ تم سے تخلیئے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں تمام کاروباری معاملات وہ بلاشبہ تمہاری ماں سے ہی طے کریں گے لیکن پہلے وہ تمہیں صرف ذرا بہتر طور پر جاننا چاہتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے پرسوں تمہاری کوئی شوٹنگ نہیں۔ پرسوں شام سات بجے میری گاڑی تمہیں لینے آئے گی اور میں فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرہ نمبر پانچ سو پانچ میں تمہارا منتظر ہوں گا۔ جو باتیں میں نے لکھی ہیں' وہ بتا کر تم اپنی ماں کو ساتھ لا سکتی ہو لیکن یہ اس پر پہلے ہی واضح کر دینا کہ اسے نیچے ہوٹل کی لابی میں بیٹھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے وہ اس کے لیے تیار ہو جائے گی۔ بعد میں تم اسے بتا دینا کہ پارٹی سے ملاقات ہو گئی ہے اور وہ لوگ چند روز بعد تفصیلی مذاکرات کے لیے تمہارے گھر آئیں گے .... اور یہ کوئی ایسی مشکل بات بھی نہیں ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس عورت کا منہ بند کرنے کے لیے ایسی کسی پارٹی کو اس کے پاس بھیج بھی سکتا ہوں۔ بہت سے لوگ اس وقت بہت سی دولت اور بہت سے منصوبے لیے میرے پیچھے پھر رہے ہیں۔ میرے پاس فی الحال اتنا وقت نہیں ہے کہ ان کے کسی بھی منصوبے میں حصہ لینے کی حامی بھر سکوں لیکن میں ان میں سے ایک آدھ کو تمہاری ماں سے ملوا سکتا ہوں۔ اسے یقیناً" ایسے لوگوں کی

تلاش ہوگی۔

طریقہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب تمہیں یہ کام ہر حال میں کرنا ہوگا۔ میں اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دینے کے لئے بے تاب ہوں۔ مجھے تم سے ان گنت باتیں کرنی ہیں اور مجھے کچھ یوں لگتا ہے جیسے یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں انتظار کی تمام ترشدتوں کے ساتھ تمہارے لیے چشم براہ رہوں گا۔

تمہارا اپنا

......؟

(نام کی کیا ضرورت ہے؟)

ندیا جوں جوں یہ خط پڑھتی گئی اس کے دل میں ایک عجیب سا تموج' ایک عجیب سا تلاطم برپا ہوتا گیا۔ اس کے محسوسات میں بے پناہ گداز سا پیدا ہو گیا۔ خوشی اپنی جگہ تھی لیکن وہ بے اختیار رونے لگی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس خط پر گرے اور انہوں نے بہت سے الفاظ کو دھندلا دیا۔

اصل میں وہ اب تک اس طرح اپنی بے وقعتی کے احساس سے دبی ہوئی تھی کہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے اس شدت سے چاہ بھی سکتا تھا۔ خود اپنی نظر میں اس کا مقام ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھا مگر ارمان نے تو نہ صرف اسے جیتی جاگتی لڑکی سمجھا تھا بلکہ اسے وہ وقعت و اہمیت دی تھی جس کا ندیا نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس شخص نے اتنے خوبصورت اور لافانی جذبوں سے آراستہ خط لکھا تھا جو خود کتنی لڑکیوں کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ ان لڑکیوں میں بہت سی بے پناہ حسین بھی ہوں گی۔ بہت سی دولت مند بھی ہوں گی۔ نہ جانے کس کس مقام و مرتبے والی ہوں گی' مگر ارمان نے تو اس لڑکی سے نظر التفات کی بھیک مانگی تھی جو خود اپنی نظر میں کچھ نہیں تھی۔

ارمان کو تو شاید گمان بھی نہیں تھا کہ وہ محبت کی طلب میں جس کے سامنے

دست سوال دراز کر رہا تھا' وہ تو پہلے دن اسے دیکھنے کے بعد سے چپکے چپکے دل ہی دل میں اس کی پرستش کر رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھ رہی تھی۔ کیا واقعی اس شخص نے اسے خط لکھا تھا؟ لیکن یہ سوچ سوچ کر وہ اونچی ہواؤں میں نہیں اڑ رہی تھی بلکہ اسے رونا آئے جا رہا تھا۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی۔

کیا محض اس لئے اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں کہ پہلی بار کسی نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ بھی دل و جان سے چاہے جانے کے قابل تھی؟ کسی کے دل میں اس کی طلب بھی اس شدت سے جاگ سکتی تھی؟ کسی نے یوں اس کا مان بڑھایا تھا کہ وہ اپنی نظر میں سربلند ہو گئی تھی۔

دھیرے دھیرے اس کا دل ٹکا اور مسرت و خمار کی ایک دھیمی سی لہر نے آنسوؤں کی جگہ لے لی۔ اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور خط کو تہ کر کے لفافے میں رکھ دیا۔ اس کی الماری میں تھوڑی سی کتابیں تھیں۔ خط اس نے ایک دوسری کتاب میں چھپا دیا۔ اس کے بعد وہ دیر تک سوچوں میں بھٹکتی رہی۔



رات کو کھانے کی میز پر اس نے ڈرتے ڈرتے فریدہ کے سامنے بات شروع کی۔ جھوٹ بولنا اس کی عادت نہیں تھی۔ کبھی کبھی فریدہ ہی کے کہنے پر اسے جھوٹ بولنا پڑتا تھا تو وہ بھی مشق کے بعد بولتی تھی اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوتی تھی۔ اب محبت اس سے جھوٹ بلوا رہی تھی۔ اس نے بظاہر سرسری سا لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ آواز کی لرزش چھپانے میں اسے دقت پیش آ رہی تھی۔

"آج شوٹنگ کے دوران ارمان نے ایک پارٹی کے بارے میں بات کی تھی۔ بہت دولت مند لوگ ہیں ...."

دولت کے تذکرے پر فوراً" فریدہ کے کان کھڑے ہوتے تھے۔ وہ ندیا کی طرف متوجہ ہوئی تو ندیا نے ارمان کے خط میں درج ہدایات کے مطابق بات آگے بڑھائی۔ کس قدر اعتماد سے بات کرنا اس کے بس میں تھا' وہ کرتی چلی گئی۔

اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فریدہ نے کسی خاص گرمجوشی کا اظہار نہیں ک
ندیا کے بات کرنے کے دوران وہ سپاٹ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ن
خاموش ہوئی تو فریدہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "یہ بات وہ مجھ سے بھ
کر سکتا تھا۔"

"آپ سے بات کرتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔" ندیا نے نظر جھکا کر پلیٹ اپ
طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "وہ چاہ رہا تھا کہ پہلے میں آپ سے بات کر لوں۔ اگر آپ
دلچسپی ظاہر کریں تو پہلے میں ہوٹل میں اس پارٹی سے مل لوں۔ اگر میں ان کی توقعا
پر پوری اتری تو پھر پارٹی آپ سے بات کرنے گھر آ جائے گی۔"

"تم جانا چاہتی ہو؟" فریدہ نے بڑے دو ٹوک لہجے میں پوچھا۔ ندیا کو احساس تھ
کہ فریدہ کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

اپنے دل کا چور چھپانے کے لیے وہ سر اٹھا کر اس سے نظر ملاتے ہوئے بولی۔
"میں سوچ رہی ہوں مل لینے میں کیا حرج ہے۔ کوئی بات بنتی نظر آئی تو ٹھیک ہے۔
ورنہ ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"ہاں.... یہ بات تو ہے...." نہ جانے کیوں فریدہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی او
اس کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے بولی۔ "اب تم بڑی سمجھ دار ہو گئی ہو۔"

"عمر کے ساتھ ساتھ آپ جو کچھ مجھے سکھانے کی کوشش کر رہی ہیں، وہی سی
رہی ہوں۔" اس نے ہمت کر کے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ فریدہ نے ایک بار پ
گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ندیا نے بصد کوشش اپنے آپ کو نظر جھکانے سے
باز رکھا۔ اسے شبہ ہوا کہ فریدہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی مگ
وہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگی۔

"تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" چند لمحے کے توقف کے بعد ندیا نے پوچھا۔
"ٹھیک ہے... تم کہتی ہو تو چلے چلیں گے۔" فریدہ نے کسی خاص گرمجوشی کے
بغیر جواب دیا۔ اس کے لہجے سے نہ تو دلچسپی عیاں تھی اور نہ ہی بیزاری۔

ندیا نے کچھ اس انداز سے اطمینان کی گہری سانس لی کہ فریدہ محسوس نہ کرنے
پائے۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہ مشکل مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔
اس کا رواں رواں خوشی سے رقص کر اٹھا۔

دوسرے روز بھی ارمان کے ساتھ اس کی شوٹنگ تھی۔ اسی منظر کا تسلسل چل
رہا تھا جو کل شروع ہوا تھا۔ وہی ایک دولت مند گھرانے کے ڈرائنگ روم کا سیٹ لگا
ہوا تھا۔ ایک کیرکٹر ایکٹر اور ایکٹریس بھی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ وہ دونوں
ارمان کے دولت مند والدین کا کردار ادا کر رہے تھے۔

منظر یہی تھا کہ ارمان کے والدین کو لڑکی تو پسند آئی لیکن جب انہیں معلوم ہوا
کہ وہ ایک غریب گھرانے کی تھی تو ان کے تیور بالکل بدل گئے۔ والدین اور بیٹے کے
درمیان خوب گرما گرم، دھواں دھار مکالموں کا تبادلہ ہوا اور آخر کار بیٹا ان کی تمام دولت
و جائیداد کو ٹھکرا کر، لڑکی کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کر کے گویا اسے اپنی پناہ میں
لیے خالی ہاتھ اس گھر سے نکل آیا۔ وہ ایک طویل جذباتی منظر تھا۔ آج اس کے باقی
حصے عکس بند ہونے تھے۔

ارمان حسب معمول دیر سے آیا۔ آج وہ دونوں گویا ایک نئے ہی زاویہ نظر سے
ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ارمان کی نظروں میں سوال تھا، تشویش تھی۔ ندیا کی
نظروں میں خمار تھا، امنگ تھی۔ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی، وہ
اسے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج پہلی بار اسے فلم میں کام کرنا اچھا لگ رہا
تھا۔ محض ارمان کی وجہ سے!

کیمرہ ریہرسل کے دوران جب رازی صاحب ذرا لائٹ مین وغیرہ کی طرف متوجہ
ہوئے تو ارمان نے نہایت نیچی آواز میں پوچھا: "خط پڑھ لیا تھا تم نے؟"

"ظاہر ہے، پڑھنا تو تھا ہی ... تم نے پڑھنے ہی کے لئے دیا تھا نا۔" وہ بظاہر بے
نیازی سے بولی۔ آج اس کا بھی ذرا اپنے آپ پر اترانے کو جی چاہ رہا تھا۔ کوئی اس کے
بھی ناز اٹھانے والا موجود تھا، اور وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" ارمان کے لہجے میں نوعمر لڑکوں کا سا ارتعاش تھا۔ اس نے کنکھیوں سے فریدہ کی طرف دیکھا جو دور بیٹھی گہری نظروں سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اتنی جلدی بھلا کیا سوچ سکتی ہوں۔" ندیا قدرے رکھائی سے بولی۔

"تو پھر کل آ رہی ہو یا نہیں؟" ارمان کا دل گویا اس کے قابو سے نکلا جا رہا تھا۔

"ہاں۔" ندیا ذرا تامل سے بولی۔ "تم نے اتنی منت سے بلایا ہے ... آنا تو پڑے گا۔"

"اوہ.... تھینک گاڈ..." ارمان کی گویا جان میں جان آئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کنکھیوں سے فریدہ کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ایک بار پھر فکر مند ہو گیا۔ "تمہاری ماں کو شک تو نہیں ہوا کہ ہم کوئی اور ہی چکر چلا رہے ہیں؟"

"شک تو شاید ہوا تھا لیکن پھر دولت مند پارٹی کا سن کر ان کی رال ٹپک گئی۔" ندیا نے اب سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ویری گڈ' یعنی تدبیر کارگر رہی۔" ارمان مسرور لہجے میں بولا۔ "وہ اوپر کمرے میں تو نہیں آئے گی نا؟ نیچے لابی میں ہی بیٹھے گی؟"

"امید تو یہی ہے۔" ندیا نے جواب دیا پھر تیکھی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "لیکن تمہیں اس پر اصرار کیوں ہے؟"

"ظاہر ہے ابھی وہ تمہیں مجھ سے شادی کی ہرگز اجازت نہیں دے گی۔ تم اس کی مستقبل کی سونے کی چڑیا ہو۔ وہ تمہیں ہاتھ سے نکلتے کیسے دیکھ سکتی ہے؟ اس لئے ہمیں اطمینان سے تنہائی میں بیٹھ کر کوئی پروگرام بنانا پڑے گا۔ تفصیلات طے کرنی پڑیں گی۔ اب یہ کام اس کی موجودگی میں تو نہیں ہو سکتا نا۔"

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ ندیا کو کچھ خوف بھی محسوس ہوا لیکن دوسری طرف خوشیوں اور انبساط کا ایک سمندر تھا۔ اپنی تمام تر کم عمری اور ناتجربے کاری کے باوجود اسے یہ احساس تو خود بھی تھا کہ فریدہ کے لئے وہ محض دولت کمانے کی ایک مشین

تھی۔ اس نے اسے پالا نہیں تھا' ایک بہت ہی زیادہ منافع بخش سرمایہ کاری کی تھی۔ اسی اسکیم کا نتیجہ برآمد ہونے کے انتظار میں تو اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔

ادھر ندیا کو اس گھر کا ماحول بالکل پسند نہیں تھا۔ اسے تو فلموں میں کام کرنے کا بھی شوق نہیں تھا۔ اگر اسے فلموں میں کام کرنا ہی تھا تو کم از کم اپنی مرضی سے تو کرتی۔ کٹھ پتلی بن کر جینا تو کوئی جینا نہیں تھا' لیکن اس سارے جنجال سے نکلنے کے لیے اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔

ارمان کے روپ میں اسے وہ سہارا دکھائی دیا تھا!

عین ممکن تھا کہ جس قسم کا منظر وہ آج عکس بند کرانے جا رہی تھی' کچھ اسی قسم کا موڑ اس کی حقیقی زندگی میں بھی آ جاتا۔ ارمان اسے اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے کر اس دنیا سے بہت دور لے جاتا جس میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ خصوصاً" اپنے گھر سے اور فریدہ سے نجات حاصل کر کے شاید اسے ایک نئی زندگی مل سکتی تھی۔ اس احساس اور امید کی بدولت اس کے دل میں جینے کی ایک نئی امنگ جاگی تھی۔ آج اسے دنیا کی ہر چیز خوبصورت اور مختلف لگ رہی تھی۔

"تو پھر تم کل آ رہی ہو نا؟" ارمان نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" ندیا نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ارمان کو جیسے یہ سن کر قرار سا آ گیا۔ اس کے چہرے پر ایسی طمانیت پھیل گئی جو ندیا نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

☆

دوسرے روز ندیا زندگی میں پہلی بار کہیں جانے کے لیے اتنے اہتمام سے تیار ہوئی کہ فریدہ بھی اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر وہ اس کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ "واہ میری بنو...! یہ تو میری تجربہ کار آنکھ کو بھی آج تک اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ تمہارے اندر یہ چمک دمک موجود ہے۔"

پھر وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے بولی۔ "اس چمک

دمک کو بن مول نہ لٹاتی پھرنا میری جان! یہ تمہارا سب سے قیمتی سرمایہ ہے... اور وقت بڑا ہرجائی ہے۔ بہت جلد سب کچھ چھین کر لے جائے گا اور تم یوں خالی ہاتھ رہ جاؤ گی جیسے تمہارے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔"

ندیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آج اس کی کسی گہری یا معنی خیز گفتگو میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کچھ اور ہی تصورات میں مگن تھی۔ مقررہ وقت پر ارمان کا ڈرائیور گاڑی لے کر انہیں لینے آ گیا۔ فریدہ بھی تیار تھی۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔

ہوٹل کی لابی میں پہنچ کر فریدہ نے ندیا کا بازو تھاما اور کچھ عجیب سے لہجے میں بولی: "ندیا! میری جان! ایک بار پھر سوچ لو.... کیا تم واقعی ارمان سے ملنا چاہتی ہو؟"

"ظاہر ہے ... اور میں اتنی دور سے بھلا کس لیے آئی ہوں؟" ندیا نے بے خیالی میں فوراً جواب دیا پھر ذرا سنبھل کر بولی: "میرا مطلب ہے مجھے ذرا اس پارٹی کا جائزہ لینا ہے اور دیکھنا ہے وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ سنا ہے' وہ دو پارٹنر ہیں۔ دونوں بے پناہ دولت مند ہیں۔ ان کا کاروبار خلیجی ریاستوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ارمان کے بتائے ہوئے یہ جملے گویا خودبخود اس کی زبان سے پھسلتے چلے گئے۔

"ٹھیک ہے۔" فریدہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "میں یہیں لابی میں بیٹھتی ہوں۔ جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا.... اور دیکھو... ابھی کسی کو اپنے ساتھ زیادہ فری ہونے کا موقع مت دینا... ارمان کو بھی نہیں ..."

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں امی! میں اب ایسی ناسمجھ تو نہیں رہی۔" ندیا شکوہ آمیز لہجے میں بولی۔

"یہ محض تمہارا خیال ہے میری جان!" فریدہ اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "ابھی تم بہت ناسمجھ ہو۔ ابھی تم نے زمانے میں دیکھا ہی کیا ہے۔"

وہ لابی میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی جس کے سامنے تپائی پر بہت سے اخبارات و رسائل بکھرے ہوئے تھے۔ ندیا کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لفٹ

کے ذریعے پانچویں فلور پر پہنچ کر اس نے کمرہ پانچ سو پانچ پر دستک دی تو سینے کے قفس میں اس کا دل بہت ہی بری طرح دھڑک رہا تھا۔

ارمان نے بلا تاخیر دروازہ کھولا۔ وہ گویا بے تابی سے اس کا منتظر تھا لیکن اس کی حالت دیکھ کر ندیا کو دھچکا سا لگا۔ وہ خود جتنے اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی' ارمان اتنا ہی بدحال نظر آ رہا تھا۔ اس نے آج شیو نہیں بنائی تھی۔ کپڑے شکن آلود اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔

ارمان نے باہر دروازے کی ناب پر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا ٹیگ لٹکایا اور دروازہ بند کر کے بے تابی سے اس کے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لئے۔ اس کے ہاتھ گویا بخار میں تپ رہے تھے۔

"تم آ گئیں ندیا... ! نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گی۔" وہ مرتعش اور لڑکھڑاتی سی آواز میں بولا: "تم نے یہاں آ کر... میری بات مان کر میرا مان بڑھایا ہے... مجھے عزت دی ہے... میرے بکھرتے ہوئے وجود کو سہارا دیا ہے۔"

"بکھرتے ہوئے وجود کو؟" ندیا نے قدرے حیرت سے دہرایا۔ وہ اس وقت فلموں کے ایک نئے دور کا نیا سپر اسٹار نہیں' ایک نہایت شکستہ دل' مضمحل اور تہی دست سا انسان لگ رہا تھا جس کے سامنے ایک انتہائی تابناک مستقبل تو کیا' امید کی کوئی دھندلی سی کرن بھی نہیں تھی۔ یہ وہ زندہ دل' شوخ اور چنچل ارمان تو نہیں تھا جسے ندیا اسٹوڈیو میں دیکھتی تھی۔

"ہاں ندیا... ! تم نے میرے بکھرتے ہوئے وجود کو سہارا دیا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں اندر سے کتنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں۔ کتنے دکھ' کتنی محرومیاں' میری زندگی کو ڈس رہی ہیں۔ میں وہ ارمان نہیں ہوں جسے تم روزانہ دیکھتی ہو۔ جسے اسٹوڈیوز والے دیکھتے ہیں... یا جسے فلم کے پردے پر عام لوگ دیکھتے ہیں۔ ارمان کی حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔ میں کتنا تہی دست اور پریشان حال شخص ہوں... اس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔"

پھر گویا اس نے تصحیح کی۔ "تہی دست ہونے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ مجھے کوئی مالی پریشانی ہے۔ دولت تو بہت تیزی سے میرے تعاقب میں آ رہی ہے۔ وقت بھی مجھے کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن جتنی تیزی سے دولت اور شہرت میرے پاس آ رہی ہے' خوشیاں اتنی ہی تیزی سے مجھ سے دور جا رہی ہیں۔"

ندیا نہایت آہستگی سے اس سے ہاتھ چھڑا کر بیٹھنے کے لئے صوفے کی طرف بڑھی لیکن وہ دوبارہ دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام کر خود اسے وہاں لے گیا اور اپنے پاس بٹھاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولا۔ "بیٹھو... بیٹھو... میرے پاس بیٹھو۔ میں آج اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے پاس وقت کم ہے... میں تمہیں اپنے ہر دکھ' ہر درد سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔"

ارمان کی زندگی میں دکھ درد؟ یہ شکستہ دلی' یہ اضمحلال' یہ مایوسی...؟ وہ حیرت سے ارمان کو دیکھ رہی تھی۔

پھر اس کی نظر تپائی پر پڑی جس پر بوتل اور گلاس موجود تھا۔ ندیا کو ایک اور دھچکا لگا۔ یہ پہلے دھچکے سے زیادہ شدید تھا۔

"تم پی رہے تھے؟" اس کے لہجے میں ایک بے عنوان سا شکوہ تھا۔

"ہاں..." اس نے بلا تامل اعتراف کیا۔

"میرے دل پر جب غم کا بوجھ حد سے بڑھ جاتا ہے تو میں پینے بیٹھ جاتا ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "یہ بھی میری زندگی کی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی ہے۔ جو بھی تم ہی کو دور کرنا ہوگی۔ مجھے تمہاری محبت مل جائے گی تو میری زندگی سنور جائے گی۔ یہ سب دکھ درد... یہ پریشانیاں... یہ بری عادتیں... سب میری زندگی سے رخصت ہو جائیں گی... لیکن یہ کام صرف تم جیسی کوئی لڑکی کر سکتی ہے۔ کوئی خالص فلمی لڑکی یہ کام نہیں کر سکتی۔ تم فلمی دنیا میں رہتے ہوئے بھی فلمی لڑکی نہیں ہو۔ تم میں فلمی لڑکیوں والی کوئی عادت نہیں ہے۔ شاید اسی لئے میرا دل خود بہ خود تمہارے قدموں میں آن ٹکا ہے۔ تم... اور صرف تم میری زندگی سنوار سکتی ہو... ورنہ میں بہت جلد

طرح زندگی کی بے اعتدالیوں کا شکار ہو کر وقت سے پہلے مر جاؤں گا۔ بہت جلد مجھے زوال آ جائے گا... یہ ابھرتا ہوا سورج وقت سے پہلے غروب ہو جائے گا..."

ندیا متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ سب کچھ دیکھنے سننے کی توقع لے کر یہاں نہیں آئی تھی۔ تاہم اسے ارمان پر ترس بھی آ رہا تھا۔ وہ اس وقت اٹھائیس تیس برس کا مرد نہیں' ایک کمسن بچہ نظر آ رہا تھا جو گھر کا رستہ بھول گیا تھا۔

پھر وہ واقعی بچوں کی طرح اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ غیرارادی طور پر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ ہچکیاں سی لیتے ہوئے بولا۔ "یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے... مجھے تباہی سے صرف تم بچا سکتی ہو۔ اگر تم نے میرا ہاتھ نہ تھاما تو میں دھیرے دھیرے اسی دلدل میں دھنستا ہوا ایک روز شہرتوں کے افق سے غائب ہو جاؤں گا۔"

"آخر تمہارے دکھ درد ہیں کیا؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی... اور میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتی ہوں؟" ندیا کچھ سنبھلتے ہوئے بولی۔

"میری پوری زندگی ہی ایک مسلسل داستان غم ہے... میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا..." وہ روتے ہوئے بولا۔ "لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے شادی کرو گی نا؟ ایک اچھی' شریف اور محبت کرنے والی لڑکی سے شادی ہی میرے دکھوں کا علاج ہے۔ ایسی کوئی لڑکی میری زندگی میں آ جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب دکھ درد دور ہو جائیں گے... بولو... تم مجھ سے شادی کرو گی نا؟"

"ہاں..." وہ کچھ شرماتے اور کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"خواہ یہ زمانہ... اور خواہ تمہاری ماں اس شادی کی کتنی ہی مخالفت کرے؟" اس نے سر اٹھا کر انگارہ سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... اگر تم تیار ہو... تو میں بھی اس مخالفت کا سامنا کر لوں گی..." وہ اٹک

اٹک کر بولی۔ وہ اپنی ذات کے کونے کھدروں میں بکھری ہوئی گمشدہ جرات اور ہمت تلاش کر کے اسے مجتمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا دل گویا کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔

"بس... مجھے تم سے یہی جواب چاہئے تھا۔" ارمان کو جیسے یکدم قرار سا آ گیا طمانیت اور آسودگی کی لہر گویا اس کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ گئی۔

دیر تک وہ اس کے کندھے سے سر ٹکائے' آنکھیں بند کیے یوں بیٹھا رہا گویا کوئی کھویا ہوا بچہ راہ میں کہیں گھنی چھاؤں دیکھ کر بیٹھ گیا ہو' اپنی آبلہ پائی اور تھکن سے چور ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لی ہوں اور دھیرے دھیرے کسی حسین خواب نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔

پھر اس کے ہاتھ بھٹکنے لگے... گستاخ ہونے لگے تو ندیا دور کھسکتے ہوئے غصے سے بولی: "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

ارمان کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔ وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔ "مجھے یوں نہ دھتکارو... میں محبت کا بھوکا ہوں۔ میرے اندر محبت کی بھوک کا ایک بیکراں صحرا پھیلا ہوا ہے۔ ویسے بھی میرے اور تمہارے درمیان اب اجنبیت کیسی ؟ تم بھی شادی کے لیے تیار ہو۔ میں بھی رضامند ہوں۔ اب تو صرف رسمی کارروائی ہی باقی ہے۔"

"میرے لیے وہ رسمی کارروائی ہی زیادہ اہم ہے۔" ندیا مضبوط لہجے میں بولی۔

"اب اتنے تکلفات میں مت پڑو۔ ہم ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔"

ارمان نے دوبارہ اس کے قریب کھسکنے کی کوشش کی۔

ندیا اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے سے زیادہ غصے سے بولی: "تت ... تت ... تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے ارمان ! میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں ... اپنے خط میں تم نے خود اعتراف کیا تھا کہ میں فریدہ جیسی عورت کے ساتھ رہتے ہوئے اور فلموں میں کام کرتے ہوئے بھی اس ماحول سے بالکل الگ تھلگ ہوں۔ میں ایک مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم کوئی ایسی ویسی لڑکی ہو۔" ارمان محبت سے بولا۔ "بات بس اتنی ہے کہ اب تم میری ہو چکی ہو... اور میں تمہارا ہوں..."

اس سے پہلے کہ ندیا کوئی جواب دیتی' دروازے پر دستک ہوئی۔ ارمان قدرے تعجب سے خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "یہ کون آن مرا...؟ میں نے تو باہر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا ٹیگ بھی لٹکایا ہوا ہے...؟"

اس نے اٹھ کر ذرا غصے سے دروازہ کھولا لیکن دروازہ کھولتے ہی اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایک گوری چٹی دراز قد اور مضبوط کاٹھی کی عورت اسے تقریباً" دھکیل کر ایک طرف ہٹاتی ہوئی اندر آ گئی۔

وہ خوش لباس' خوشبوؤں میں بسی ہوئی اور خوبصورت تھی مگر اس کی خوبصورتی میں ایک عجیب سا پھیکا پن تھا۔ خوبصورت ہونے کے باوجود اس میں کوئی خاص کشش نہیں تھی۔ اس کی عمر تیس کے قریب ہوگی۔ اس کی غزالی آنکھیں غصے سے سلگ رہی تھی لیکن بظاہر وہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔

نہایت آہستگی سے اس نے دروازہ بند کر کے مقفل کر دیا اور دوبارہ ندیا کی طرف گھومی۔ اس نے گہری نظر سے ندیا کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ وہ بظاہر پرسکون تھی لیکن اس کے تاثرات کی تہ میں ہزاروں طوفان مچل رہے تھے۔

"اچھا... تو تم ہو ندیا ...!" وہ آہستگی سے بولی تو ندیا کو اس کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ محسوس ہوئی۔ اس کے لہجے میں کوئی الزام... کسی قسم کی نفرت یا غیظ و غضب تو نہیں تھا مگر ایک عجیب سا کرب ضرور تھا۔

ندیا اپنے آپ کو بہت شرمندہ شرمندہ سا محسوس کر رہی تھی۔ نووارد عورت کی محض نظروں نے اسے شرمندہ کر دیا تھا لیکن اس نے اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے حتی الامکان وقار اور متانت سے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی تعریف ...؟"

عورت گویا سنی ان سنی کرتے ہوئے ایک ٹک ندیا کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ "خوبصورت ہو... پرکشش ہو... اور سب سے بڑھ کر

یہ کہ کم عمر ہو..."

اس کے الفاظ تعریفی تھے مگر لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ احساس اہانت سے ندیا کے رخسار تپ اٹھے۔ وہ ذرا تیزی سے بولی۔ "میں نے پوچھا تھا... آپ کی تعریف...؟"

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "میں اپنا تعارف کرا ہی دوں تو بہتر ہے..." اس نے انگلی سے یوں ارمان کی طرف اشارہ کیا گویا وہ انگلی نہیں' ایک خنجر تھا جسے وہ ارمان کے پہلو میں پیوست کر دینا چاہتی تھی۔ "میں اس جھوٹے بدمعاش اور ڈرامے باز کی بیوی ہوں۔"

ندیا کے سینے میں گویا چھن سے کوئی چیز ٹوٹی۔ شاید وہ اس کا دل تھا۔ اسے گویا کسی نے کہکشاں کی بلندیوں سے پاتال میں پھینک دیا۔ اس کی روح میں ایسا گہرا سناٹا پھیل گیا جیسے خود روح کی بھی موت واقع ہو گئی ہو۔ ایک لمحے کے لیے اسے چکر سا آ گیا۔

رائٹنگ ٹیبل کا سہارا لے کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ڈوبتی ہوئی نظروں سے ارمان کی طرف دیکھا۔ وہ بدحواس سا اس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جو اپنے آپ کو اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔ ندیا کا تو اس امکان کی طرف ذہن ہی نہیں گیا تھا کہ وہ شادی شدہ بھی ہو سکتا ہے۔

ارمان اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر بولا: "تت... تت... تم اسلام آباد میں تھیں..."

"اسلام آباد سات سمندر پار تو نہیں ہے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی: "مناسب وقت پر اطلاع مل جائے تو لوگ سات سمندر پار سے بھی آ جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے آنا تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بروقت پہنچ گئی اور یہ لڑکی ہمیشہ کے لیے تمہاری جھوٹی باتوں کے سحر میں گرفتار ہونے سے بچ گئی۔"

ندیا اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی مگر آنسوؤں کے سوتے گویا خشک

ہو گئے تھے۔ اس کی پلکوں تلے آنسو شاید انگارے بن گئے تھے۔ اس کی آنکھیں گویا جل رہی تھیں۔ اسے کمرے کا منظر کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارمان کی طرف دیکھ رہی تھی مگر ارمان اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ خوفزدہ سی نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا اور ندیا اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود محسوس کر رہی تھی کہ اس کا خوف محض اس شوہر کا خوف نہیں تھا جسے اس کی بیوی نے کسی دوسری لڑکی پر ڈورے ڈالتے ہوئے پکڑ لیا تھا... بلکہ اس خوف کی جڑیں شاید اس سے زیادہ گہری تھیں۔ اس کی نوعیت شاید کچھ اور بھی تھی۔ اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

ندیا اپنی شرمساری کا ناقابل برداشت بوجھ اٹھائے لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی لیکن عورت نے اسے بازو سے پکڑ کر راستے میں روک لیا۔ ندیا ذرا خوفزدہ ہو گئی کہ شاید وہ اسے بھی اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنائے گی۔

خلاف توقع وہ نرم لہجے میں بولی۔ "مجھے معلوم ہے اس میں تمہارا قصور نہیں ہوگا۔ تم چلتر چالاک قسم کی چیز نہیں لگتیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ ارمان نے تم سے بے شمار جھوٹ بولے ہوں گے۔ یہ ازل کا جھوٹا ہے۔"

"مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں یہاں آ گئی۔" ندیا لرزاں آواز میں بولی۔ "میں تم سے بھی معافی چاہتی ہوں... اور اپنے اندھے اعتماد سے بھی... مجھے قطعاً" معلوم نہیں تھا کہ دنیا میں محبت کے نام پر بھی اتنے بڑے بڑے دھوکے ہوتے ہیں... مجھے جانے دو' اب تم دونوں اپنا نجی جھگڑا نمٹاتے رہو... میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

اسے اندیشہ تھا کہ عورت اب چیخنا چلانا نہ شروع کر دے' کوئی ہنگامہ نہ برپا کر دے لیکن وہ اسی نرم لہجے میں بولی۔ "چلی جانا... ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اپنے فائدے کے لیے میری چند باتیں سنتی جاؤ۔ تمہاری معلومات میں اضافہ ہوگا اور تم آئندہ بھی کسی دھوکے سے محفوظ رہو گی ورنہ اس شخص سے کچھ بعید نہیں کہ یہ بعد میں بھی تمہیں دوبارہ اپنی مظلومیت کا قائل کر لے اور تمہیں ایک بار پھر اس سے ہمدردی ہو

جائے۔ تم بھول جاؤ کہ اس نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ اور تم یہ بھی بھول جاؤ کہ یہ شادی شدہ ہے۔ یہ زبان کا بڑا جادوگر ہے۔ لڑکیاں اس کی خطائیں بہت جلد معاف کر دیتی ہیں ... خصوصاً" کم عمر کی لڑکیاں۔"

ندیا کا دل اس وقت خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا اور وہ کسی کونے میں منہ چھپا کر جی بھر کے رونا چاہتی تھی لیکن اس عورت کا انداز اور اس کے الفاظ ندیا کے پیروں کی زنجیر بن گئے۔ وہ آگے نہ بڑھ سکی۔

عورت بولی۔ "ہماری شادی آج کی بات نہیں ہے۔ اسے کئی سال گزر چکے ہیں۔ ہماری ایک بچی بھی ہے۔ میرے والد اسلام آباد میں ایک بہت بڑے سرکاری افسر ہیں' اور ساتھ ساتھ وہ بڑے زمیندار بھی ہیں۔ ارمان نے بقول اپنے تو میری محبت میں گرفتار ہو کر اور میرے والدین کی منت سماجت کر کے مجھ سے شادی کی تھی لیکن میں جلد ہی اس محبت والی خوش فہمی سے نکل آئی تھی۔ میرا خیال ہے اس نے میرے والد کی دولت اور اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے مجھ سے شادی کی تھی۔ اسے شوبزنس میں اپنا مستقبل بنانے کا شوق تھا۔ میں نے اور میرے والدین نے اس کے اس شوق کے سامنے بھی سر تسلیم خم کر دیا۔ اس کی پہلی فلم کے لیے سرمایہ میرے والد نے فراہم کیا تھا۔ لیکن وہ پس پردہ ہی رہے تھے۔ اسی فلم کی وجہ سے یہ آج اتنا بڑا فلمی ہیرو ہے۔ اس کے علاوہ' میرے والد کی وجہ سے اس کی کوئی فلم سنسر وغیرہ میں نہیں اٹکتی۔ اسے بہت سے رعایتیں ملتی ہیں۔ اسے ٹیکس وغیرہ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔"

عورت نے خاموش ہو کر افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ارمان کی طرف دیکھا جو بیڈ پر جا بیٹھا تھا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس کی بیوی نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "اسلام آباد میں ہمارا شاندار بنگلہ ہے جو میرے والد نے جہیز میں دیا تھا' اور بھی بہت کچھ دیا تھا۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ ایک فراخ دل دولت مند شخص اپنی اکلوتی بیٹی کی خوشیوں کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ارمان کے لاہور آنے سے پہلے اس کے لیے یہاں بھی بنگلہ خریدا گیا تھا جس میں یہ شروع سے رہ رہا ہے۔ وہ اس کی فلم کی کمائی سے نہیں خریدا گیا' حتیٰ کہ جس گاڑی میں تم بیٹھ کر آئی ہو' وہ بھی اس کی فلم کی کمائی سے نہیں خریدی گئی۔ ہم نے اس سے آج تک نہیں پوچھا کہ اس کی فلم کی کمائی کہاں ہے؟"

اس نے ندیا کا بازو چھوڑ دیا لیکن ندیا میں اب بھی اتنی ہمت اور سکت نہیں تھی کہ دروازے کی طرف قدم بڑھا سکتی۔ عورت ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "اس شخص کے لئے ہم نے سب سے بڑی قربانی یہ دی کہ ہم نے اس شادی کو راز رکھا۔ اسلام آباد میں یہ ویسے بھی بہت کم ہی رہا ہے۔ میرے شوہر کی حیثیت سے اسے وہاں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ پھر جب اس نے فلم کے میدان میں باقاعدہ قدم رکھنے کا ارادہ کیا' تب تو اس نے پرزور فرمائش کی تھی کہ ہم کبھی کسی سے اس شادی کا ذکر نہ کریں کیونکہ اس طرح ہیرو کی مارکیٹ ویلیو متاثر ہوتی ہے۔ ہم نے اس کی خوشی اور اس کی کامیابیوں کی خاطر یہ احتیاط بھی رکھی لیکن مشہور لوگوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں بہرحال چھپتی نہیں ہیں۔

بہت سے لوگ ارمان کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ شادی شدہ ہے لیکن کچھ ہماری راز داری اور کچھ اس کی حکمت عملی کی وجہ سے بہرحال پریس میں کبھی اس کی زندگی کے اس پہلو کو اس طرح نہیں کریدا گیا جس طرح شوبزنس کے دوسرے لوگوں کو اس سلسلے میں زچ کیا جاتا ہے۔ ارمان گول مول باتیں کر کے اپنے غیر شادی شدہ ہونے ہی کا تاثر دیتا رہا اور ہم بڑے صبر و تحمل سے کسی ایسے موزوں وقت کا انتظار کرتے رہے جب وہ علی الاعلان اپنی بیوی اور بچی کے بارے میں بات کر سکے۔ میں اسلام آباد ہی میں رہتی ہوں۔ ارمان ہفتے میں ایک آدھ دن کے لیے وہاں آ جاتا ہے۔ کبھی پندرہ بیس دن بھی گزر جاتے ہیں لیکن میرے لیے اس کی تاکید ہے کہ یہ خواہ کتنے ہی دن اسلام آباد والے گھر نہ آ سکے ... لیکن میں اس دوران لاہور آنے کی کوشش نہ کروں..."

عورت نے مجروح سی نظروں سے ارمان کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز کچھ اور

دھیمی ہو گئی۔

"میرا خیال ہے میں اس شخص کی محبت میں مبتلا ہوں جو اس خاموشی اور حوصلے سے یہ سب کچھ برداشت کرتی آ رہی ہوں۔ میں ... اور میرے والد اس کے لیے قربانیاں دے سکتے تھے' دیتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے کئی زور دار معاشقوں کی خبریں بھی ہم تک پہنچیں لیکن ہم نے انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ شوبزنس میں کوئی کہاں تک پارسا رہ سکتا ہے؟ لیکن اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ بہت ہو چکی۔ اب ارمان کو اپنا طرز زندگی بدلنا ہوگا۔ یہ بے شک شوبزنس میں رہے لیکن اسے ایک معقول اور میچور انسان کا سا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ مجھ سمیت زندگی کی تمام حقیقتوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ اب یہ ڈرامے بازیاں مزید نہیں چلیں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اب تک تمام فیصلے ارمان کرتا آیا ہے۔ لیکن اب کچھ فیصلے میرے بھی چلیں گے۔ اور ہاں' برسبیل تذکرہ ... ارمان اس کا فلمی نام ہے' اس کا اصل نام نوید ہے۔ بات اہم تو نہیں' لیکن میں نے سوچا بتاتی چلوں۔"

"بہت شکریہ ... تمہارا بہت شکریہ ..." ندیا نے اپنے آنسو پیتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا۔ "تم نے جو کچھ بھی بتایا وہ سب کچھ بہت اہم ہے ... اور ... اور تم واقعی بہت صحیح وقت پر آئیں ..."

اس نے ایک نظر ارمان کی طرف دیکھا۔ وہ مجبور سی نظروں سے قالین کو گھور رہا تھا۔ اب اس کا خوف ندیا کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس جیسی بیوی کے سامنے وہ واقعی کیسے بول سکتا تھا؟ یہ اسی عورت کا حوصلہ تھا کہ اس نے سماجی طور پر اتنی طاقتور ہوتے ہوئے بھی اتنی خاموشی سے سب کچھ برداشت کیا تھا۔

ندیا نے تیزی سے دروازہ کھولا اور باہر آگئی۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرح لفٹ تک پہنچی۔ ہر چیز اس کی آنکھوں کے سامنے ہلکورے لے رہی تھی۔ لفٹ کے نیچے پہنچتے تک اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا لیکن وہ آنسو اب پلکیں بھگونے لگے تھے جو اس سے پہلے گویا انگارے بن کر پس چشم ایک آگ سی لگا رہے

تھے۔ دکھ اپنی تپش تو دے چکا تھا' شاید اب وہ شبنم کے روپ میں ڈھلنا چاہتا تھا۔

لابی میں پہنچ کر اس نے دیکھا' فریدہ بڑے وقار اور متانت سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے اپنے چہرے کے سامنے ایک انگریزی جریدہ پھیلائے بیٹھی تھی۔ گو کہ اسے انگریزی پڑھنا نہیں آتی تھی مگر وہ بڑے "انہماک" سے مطالعہ کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ندیا کو خیال آیا کہ وہ خود تو یونہی محض نام کی اداکارہ تھی ورنہ اس دنیا میں تو ہر دوسرا فرد اس سے بڑا اداکار تھا۔

وہ قریب پہنچی تو فریدہ نے سر اٹھا کر گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا اور رسالہ بند کر کے تپائی پر رکھ دیا۔

"بس ... چلیں ...؟" اس نے گویا کچھ حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ..." ندیا کے حلق سے آنسوؤں میں بھیگی آواز بہ مشکل نکلی۔

"بہت جلدی آگئیں۔" فریدہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں ... میرا خیال ہے میں نے جانے میں جلدی کی تھی۔ واپسی میں تو بہت دیر لگ گئی۔" ندیا نے جواب دیا اور منہ پھیر کر دروازے کی طرف چل دی۔ فریدہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

باہر آ کر فریدہ ادھر ادھر دیکھنے لگی تو ندیا نے پوچھا۔ "کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟"

"ارمان کی گاڑی نظر آئے تو ڈرائیور کو اشارہ کر کے یہاں بلاؤں۔" فریدہ نے جواب دیا۔

"نہیں ... ہم ٹیکسی سے چلیں گے۔" ندیا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور ڈرائیو وے سے گزر کر سڑک کی طرف چل دی۔

"خیریت تو ہے ...؟ لگتا ہے پارٹی سے تمہاری ملاقات اچھی نہیں رہی۔" فریدہ بظاہر سادگی سے بولی۔

ندیا نے پلٹ کر گھائل سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "کچوکے کیوں لگاتی ہیں؟"

"کچوکے ... ؟ کیسے کچوکے؟" فریدہ نے حیرت سے کہا۔

"ارمان کی بیوی کو آپ نے فون کر کے نہیں بلوایا تھا؟" ندیا نے دھندلائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لیے فریدہ کا چہرہ سپاٹ رہا پھر وہ گہری سانس لے کر ملائمت سے بولی۔ "چلو... گھر چل کر بات کریں گے۔ یہ جگہ بات کرنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔"

ندیا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آتے جاتے لوگ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی ابھی کوئی فلم نمائش کے لیے پیش نہیں ہوئی تھی لیکن اخبارات اور رسائل میں اس کے کافی انٹرویو اور تصویریں چھپ چکی تھیں۔ کہیں کہیں، راہ چلتے لوگ اسے پہچان لیتے تھے۔ شاید یہاں بھی لوگ اسے پہچان رہے تھے یا پھر ویسے ہی، ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کی لابی میں کھڑی، خوبصورت و پرکشش لڑکی کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو انہیں تجسّس میں مبتلا کر رہے تھے۔ ندیا یہ سوچ کر بادل نخواستہ فریدہ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

گھر پہنچ کر فریدہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی اور تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔ "تمہارا خیال درست ہے، ارمان کی بیوی کو میں نے ہی فون کر کے بلوایا تھا۔"

"اس سے آپ کو کیا ملا ؟" ندیا نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اسے اس لئے نہیں بلوایا تھا کہ اس سے مجھے کچھ ملتا۔ میں نے اسے اس لیے بلوایا تھا کہ اس سے تمہیں کچھ مل سکے۔" فریدہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے ... ؟ مجھے اس سے کیا مل سکتا تھا؟" ندیا نے اب اپنے آنسو پی لئے تھے اور غصے سے اس کے کانوں کی لویں تپنے لگی تھیں۔

"سبق ..." فریدہ نے جواب دیا: "میں چاہتی تھی اس واقعے سے تمہیں کوئی سبق مل سکے ... لیکن ایسا لگتا ہے کہ بات اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اگر آپ مجھے صرف یہ سمجھانا چاہتی تھیں کہ ارمان پہلے سے شادی شدہ ہے تو آپ یہ بات علیحدگی میں راز داری سے بھی مجھے بتا سکتی تھیں۔ مجھے اس کی بیوی کی نظروں میں ذلیل کرانا کیا ضروری تھا؟" ندیا کے لہجے میں کچھ جارحانہ پن آ چکا تھا۔

"انسان پر جب نئی نئی جوانی آتی ہے اور اس کے سر میں عشق کا سودا بھی سمایا ہوتا ہے۔ تو اس قسم کی باتیں اتنی آسانی سے اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔" فریدہ نہایت بردباری سے بولی۔ "پھر' یا تو وقت ہی اسے سب کچھ سمجھاتا ہے یا پھر اسے اچانک کوئی شدید دھچکا لگتا ہے تب بات اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ اب میں یہ انتظار تو نہیں کر سکتی تھی کہ تمہیں وقت ہی سب کچھ سمجھائے کیونکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب تک وقت انسان کو کچھ سمجھاتا ہے تب تک اس کا سب کچھ برباد ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں شدید دھچکا پہنچانا ہی بہتر سمجھا۔"

ندیا سامنے بیٹھی ایک ٹک اسے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی دھندلائی ہوئی سی تھیں۔

فریدہ بڑے سکون سے بولی۔ "میرا مقصد تمہیں صرف یہی بتانا نہیں تھا کہ ارمان پہلے سے شادی شدہ ہے اور وہ تمہیں چکر دے رہا ہے' بلکہ میں تمہیں اور بھی بہت کچھ سمجھانا اور بتانا چاہتی تھی۔ میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ یہاں تمہیں قدم قدم پر ایک ارمان ملے گا۔ ابھی تو تمہارے سفر کا آغاز ہوا ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے' ابھی تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔"

"آپ کے ساتھ رہ کر تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے کئی جنم بتا دیئے

ہیں۔" ندیا بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔

"یہ تمہارا وہم ہے میری جان!" فریدہ بڑے ٹھہراؤ سے بولی۔ "یہ جو تم افسانے' ناول اور شاعری کی کتابیں پڑھتی ہو' ان کی وجہ سے تمہارا ذہن افسانوی سا ہو گیا ہے۔ تم ہر بات افسانوی سے انداز میں سوچنے لگی ہو لیکن میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی کہ حقیقی زندگی' کتابی زندگی سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے چندا! جب انسان زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے ذہن پر برف کی طرح جمی ہوئی افسانویت کی تہ کو یہ دنیا چند ہی دن میں ادھیڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس عمل سے اس کی روح تک پر خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ خوابوں سے لہو رسنے لگتا ہے۔"

شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی ... ندیا نے سوچا۔ اس وقت اس کی یہی کیفیت تو تھی۔

فریدہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی: "تمہارا ذہن افسانوی تھا۔ اسی لئے تو تم ارمان کے افسانوی سے خط سے متاثر ہو گئیں۔"

"آپ نے وہ خط پڑھا تھا؟" ندیا اس کی بات کاٹتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"ظاہر ہے۔" فریدہ بولی۔ "اگر میں نے وہ خط نہ پڑھا ہوتا تو میں ارمان کے اصل ارادوں کا اندازہ کیسے لگا سکتی تھی؟ تم نے تو مجھے اسی طرح غچا دینے کی کوشش کی تھی جس طرح اس نے تمہیں پٹی پڑھائی تھی۔ جب تم اپنا پرس مجھے دے کر شوٹنگ پر گئیں تو میں نے اس میں سے فراز کا دیوان نکال لیا تھا جس میں تم نے وہ خط چھپایا تھا۔ میں نے اسے اخبار کی آڑ میں رکھ کر پڑھا تھا۔"

"کتنی کمینی عورت ہیں آپ ...!" ندیا نے بے اختیار کہا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"بے شک ..." فریدہ نے بلا تامل اعتراف کیا۔ "لیکن میرے اس کمینے پن کے لئے تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہئے۔ شاعری کی کتابوں میں چھپائے جانے والے ایسے

خوشبودار خط تم جیسی خواب پرست لڑکیوں کو نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں اور آخرکار اندھیروں میں بھٹکنا ان کا مقدر ہو جاتا ہے۔"

ندیا خاموش رہی۔

فریدہ مدبرانہ انداز سے بولی: "میں اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔"

"مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔" ندیا تلخ لہجے میں بولی۔ "میں آپ کی اس کوالی فیکیشن سے بہت اچھی طرح آگاہ ہوں۔"

"اس کے لئے بھی تمہیں شکرگزار ہونا چاہئے کہ تمہیں ایک ایسی عورت کا سایہ میسر ہے جو زمانے کی ہر اونچ نیچ کو سمجھتی ہے۔ وقت کی ہر ادا سے واقف ہے۔ زندگی کے ہر محاذ پر ہر لمحے چوکس رہتی ہے۔ میں ان باتوں کی بھی خبر رکھتی ہوں جن کی طرف تمہارا کبھی گمان بھی نہیں جا سکتا۔ میں بہت دن سے ارمان کی نظریں دیکھ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ تم پر جال ضرور پھینکے گا۔ میں ہوشیار تھی۔ اس روز میرے دل نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ تم نے اس کتاب میں اس کا خط چھپایا ہے۔"

ندیا کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس خوبصورت خط کے خوابناک الفاظ اب بھی اس کے ذہن پر نقش تھے۔

فریدہ گویا اس کے دل پر ایک اور خراش ڈالنے کے لیے بولی۔ "معاف کرنا ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ سب سے پہلے تو مجھے تم کو اس خط کی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہئے تھا۔ ارمان نے تو وہ خط بھی اپنے ہاتھ سے لکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ تم تو خوابوں کے دوش پر اتنا اونچا اڑ رہی تھیں کہ تم نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ وہ ارمان کی اپنی رائٹنگ نہیں تھی۔ خیر' اس میں تمہارا بھی قصور نہیں۔ تم نے تو آج تک ارمان کی رائٹنگ ہی نہیں دیکھی ہوگی' اور اگر دیکھی بھی ہوگی تو اس کا خط پڑھتے وقت تمہیں خیال ہی نہیں آیا ہوگا کہ اس میں اتنا فرق کیوں آ گیا ہے۔ اس وقت تو تمہارا ذہن ہی نہ جانے کہاں پہنچا ہوا ہوگا۔"

"تت ... تت ... تو پھر وہ خط کس کا لکھا ہوا تھا؟" ندیا نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

اب اس کے لہجے سے جارحانہ پن غائب ہو چکا تھا۔

"ایک ناکام فلمی مصنف مرزا منور کا۔" فریدہ نے جواب دیا۔ "تم نے اکثر اسے اسٹوڈیوز میں منڈلاتے دیکھا ہوگا۔ سانولا اور مجہول سا آدمی ہے۔ باچھوں سے پان کی پیک بہتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار ارمان کے ساتھ بھی نظر آتا ہے۔ ارمان سے اس کی کافی دوستی ہے۔ ارمان نے کئی جگہ اس کی سفارش بھی کی لیکن کسی نے اس کی سفارش پر کان نہیں دھرا۔ مرزا منور نے دو فلمیں لکھی تھیں لیکن بدقسمتی سے دونوں فلاپ ہو گئیں' اور تمہیں معلوم ہی ہے ہمارے ہاں کسی کی پہلی ایک دو فلمیں فلاپ ہو جائیں تو عام طور پر وہ آدمی بھی فلاپ ہو جاتا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "ویسے وہ کوئی ایسا باصلاحیت آدمی بھی نہیں ہے۔ سنا ہے وہ مصنف کم' منشی زیادہ ہے۔ ہر ایک کے مشورے پر سر تسلیم خم کر کے اس کی پسند کا سین کہانی میں شامل کر دیتا ہے یا پھر ادھر ادھر سے ٹکڑے جوڑ کر کہانی بناتا ہے۔ خط بھی شاید اس نے بہت سے افسانوں وغیرہ سے جملے کھینچ کھانچ کر تیار کیا ہوگا۔"

ندیا خاموشی سے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے سینے میں جیسے کوئی چیز کرچی کرچی ہو گئی تھی۔ شاید یہ اس کا دل تھا۔ اس کا اب بولنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جیسے خود اپنی نظر میں گر سی گئی تھی۔

"ارمان! تمہیں مجھ سے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا ...!" اس نے اندر ہی اندر سسکی لے کر بزبان خموشی کہا۔

فریدہ نے بات جاری رکھی۔ "اس کی محبت کا اندازہ تم اسی سے لگا لو کہ اس نے خط بھی اپنے ہاتھ سے لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ لکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہاں! کم از کم اتنا ہی کر لیتا کہ مرزا منور نے اگر خط لکھ دیا تھا تو اسے اپنی رائٹنگ میں نقل ہی کر لیتا مگر اس نے اتنی بھی زحمت نہیں کی۔ فرصت ہی نہیں ملی ہوگی۔"

پھر فریدہ گویا ندیا کی خاموشی سے مزید حوصلہ پاکر پہلے سے زیادہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔ "ارمان فلم انڈسٹری میں نیا ہی ہے مگر بہت گھاگ اور شاطر انسان ہے۔ تمہیں خوبصورت لفظوں اور جھوٹے خوابوں کے سحر میں الجھا کر اس کا مقصد صرف اپنی بے لگام خواہشوں کی تسکین کرنا ہی نہیں ہوگا بلکہ وہ تمہیں اپنی اسیر بنا کر اپنی پوزیشن بھی اور مستحکم کرنا چاہتا ہوگا۔ فلمسازوں کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر سودے بازی کی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہوگا۔ اس کی نظریں یقیناً بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔"

ندیا بدستور خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فریدہ نے گویا وضاحت کی۔ "اسے اندازہ ہوگیا ہے کہ رازی صاحب کی فلم ہٹ جائے گی اور تمہارے ساتھ اس کی جوڑی اس سے زیادہ مقبول ہو گی جتنی نینا کے ساتھ ہوئی تھی۔ نینا اب بھی اس کے قابو میں آنے والی لڑکی نہیں ہے۔ وہ ایکٹنگ میں تم سے بہت پیچھے لیکن چالاکیوں میں تم سے بہت آگے ہے۔ اس کم عمری میں ہی وہ پوری لومڑی ہے۔ اس لئے ارمان نے تمہیں قابو میں کرنے کا سوچا ہوگا۔ اگر تمہارے ساتھ اس کی جوڑی ہٹ ہو جائے اور تم ارمان کے اشاروں پر چلنے لگو تو کاروباری لحاظ سے فلمی دنیا میں ارمان کی طاقت دگنی ہو جائے گی۔ تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔"

ندیا نے تھکے تھکے انداز میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فریدہ نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "ابھی تو تمہاری فلم ریلیز نہیں ہوئی ہے... ابھی سے ارمان جیسے لوگوں نے تم پر آنکھ رکھ لی ہے۔ جب تمہاری فلم ہٹ ہو جائے گی اور فلمسازوں کی قطار تمہارے دروازے پر کھڑی ہوگی تو نہ جانے کتنے ارمان اپنا جال لے کر تمہاری طرف بڑھیں گے۔ ان کی عمریں مختلف ہوں گی۔ شکلیں مختلف ہوں گی۔ شعبے مختلف ہوں گے۔ طریقہ واردات مختلف ہوگا... لیکن مقصد سب کا ایک ہوگا۔ یعنی تمہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور قدرے نرم لہجے میں بولی۔ "اگر تم اتنی ہی بے وقوف ثابت ہوئیں جیسی ارمان کے معاملے میں ہوئی ہو' تو یہ دنیا تمہیں نوچ کر کھا

جائے گی۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کی میری جان! تمہیں تباہی سے بچایا ہے اور نہایت ابتدائی مرحلے میں بچایا ہے۔ اگر تم ذرا زیادہ آگے نکل جاتیں تو پھر شاید اپنی بھلائی کی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہ آتی۔"

ندیا نے سر جھکا لیا۔

فریدہ صوفے کے بازو کو اپنی انگلیوں سے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "میری جان! ایک بات اس طرح ذہن پر نقش کر لو جس طرح پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ یہ ساری دنیا ہی مکر و فریب کا ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ فلمی دنیا تو اس کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہے... اور اس دنیا میں تم ہماری مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتیں۔"

"ہماری سے آپ کی مراد کیا ہے؟" ندیا نے سر اٹھا کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"وہ سب لوگ جو اس گھر میں رہتے ہیں' مجھ سمیت یہ سب لوگ تمہارے لئے ناگزیر ہیں۔ میں ان سب کی سربراہ ہوں۔ میری سرپرستی تمہارے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر ہم لوگ نہ ہوتے تو تمہیں شاید رازی صاحب کی فلم کی پہلی شوٹنگ کرنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ شیر خان اور احسان علی بروقت نہ پہنچتے تو نینا کے بھیجے ہوئے وہ بدمعاش تمہارے چہرے کو بگاڑ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے اور آج تم مستقبل قریب کی سپر اسٹار ہونے کے بجائے اپنے برباد چہرے کے ڈراؤنے پن کو چھپانے کے لئے کسی اندھیرے گوشے میں منہ دیئے پڑی ہوتیں۔"

ندیا کا سر ایک بار پھر جھک گیا۔ ندیا خود بھی فیصلہ نہ کر سکی کہ یہ احسان کا بوجھ تھا یا دکھ کی گرانی... جس نے اس کا سر جھکا دیا تھا۔

فریدہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "ایک اور بات بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ چاہے تم اسے ہماری غرض سمجھو یا لالچ' لیکن حقیقت یہ ہے کہ جتنے مخلص تمہارے لئے ہم ہو سکتے ہیں' اتنا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ آئندہ زندگی میں بھی تمہیں خواب دکھانے والے بہت ملیں گے لیکن حقیقت بتانے والا شاید ہی کوئی ملے۔ تمہاری جتنی بھلائی ہم چاہ سکتے ہیں' اتنی کوئی اور نہیں چاہ سکتا۔ یہ میں صرف جذباتی

باتیں نہیں کر رہی ہوں۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم تمہاری بھلائی چاہیں کیونکہ تمہاری بھلائی میں ہماری بھلائی ہے۔ ہم سے بڑا تمہارا کوئی خیر خواہ نہ اس وقت ہے نہ آئندہ ہوگا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "اس لیے ہر معاملے میں ہم پر بھروسہ کرنا سیکھو۔ کوئی بھی قدم اٹھاؤ' ہمارے مشورے سے اٹھاؤ کوئی بھی کام کرو' ہمارے مشورے سے کرو۔ ہمیشہ فائدے میں رہو گی۔ کبھی نقصان نہیں اٹھاؤ گی۔ اس عمر سے ہی مشق شروع کر دو کہ کبھی جذباتی بن کر نہ سوچنا جذباتی بن کر سوچو گی تو ہمیشہ مار کھاؤ گی۔ تمہیں صرف کیمرے کے سامنے اور سینما اسکرین پر جذبات کی سوداگری کرنی ہے۔ ذاتی زندگی میں جذباتیت کو مت گھسنے دو جذباتی لوگ اکثر گھاٹے میں رہتے ہیں۔"

"اگر جذبات کو زندگی سے نکال دیا جائے... تو پھر زندگی میں رہ ہی کیا جاتا ہے؟" ندیا نے ایک طویل سکوت کے بعد سر اٹھا کر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

"بہت کچھ رہ جاتا ہے۔ یہ بات دھیرے دھیرے تمہاری سمجھ میں آئے گی ویسے بھی میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہر قسم کے جذبات کو زندگی سے نکال دو یا بالکل بے حس' خود غرض اور لالچ کی پتلی بن جاؤ۔ میرا مقصد یہ ہے کہ بے وقوفی قسم کی جذباتیت کو اپنی زندگی پر حاوی مت ہونے دو۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والے کام مت کرو۔ کوئی بھی قدم اٹھاتے وقت اپنا برا بھلا ضرور سوچو... اور یہ وہم سے نکال دو کہ میں .... یا اس گھر میں رہنے والا کوئی بھی اور فرد تمہارا بدخواہ یا دشمن ہے۔"

وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بس ... مجھے یہی کہنا تھا۔ ہو سکے تو میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔"

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور ندیا بھی اپنے کمرے میں آکر بستر پر ڈھیر ہو گئی فریدہ کے الفاظ کی بازگشت اب بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی اور وہ واقعی

کے بارے میں غور کرنا چاہتی تھی مگر اس کا ذہن شل تھا۔ وہ اپنے آپ کو کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں پا رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے بسی کے عالم میں اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا... اور پھر روتے روتے ہی اسے نیند آ گئی۔

دوسرے روز دوسری شفٹ میں اس کی شوٹنگ تھی اور ارمان کے ساتھ ہی اس کا سین تھا۔ فریدہ شوٹنگ کے لیے تیار ہو کر اس کے کمرے میں آئی تو ندیا تیار نہیں تھی۔ وہ سر درد کی دو گولیاں کھا کر بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

فریدہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئی اور پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"شوٹنگ پر نہیں چلنا ہے؟ یاد دہانی کے لئے رازی صاحب کے اسسٹنٹ کا فون آ چکا ہے۔"

"میں ارمان کے ساتھ کام نہیں کروں گی۔" ندیا نے فیصلہ سنا دیا۔

فریدہ اس پر جھکتے ہوئے محبت سے مسکرائی۔ "میری جان! ابھی تم اتنی بڑی ہیروئن نہیں بنی ہو کہ بیان دے سکو' میں فلاں کے ساتھ کام کروں گی اور فلاں کے ساتھ نہیں کروں گی۔ بلکہ بڑی ہیروئن تو کیا... ابھی تم سرے سے ہیروئن ہی نہیں بنی ہو۔"

"مجھے نہیں بننا ہے ہیروئن ... میں فلموں میں کام ہی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ تقریباً" چلا اٹھی۔

فریدہ بڑے تحمل سے بولی: "ٹھیک ہے... فلموں میں کام مت کرو ہم زبردستی تو تم سے ایکٹنگ نہیں کرا سکتے۔ تم اگر مارے باندھے کیمرے کے سامنے چلی بھی جاؤ گی لیکن بری ایکٹنگ کرو گی تو ویسے ہی ڈائریکٹر ہاتھ جوڑ کر تمہیں رخصت کر دیں گے۔ یہ کام کسی سے زبردستی تو کرایا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن ایک بات پر تمہیں ضرور غور کرنا ہوگا۔"

ندیا نے کوئی سوال نہیں کیا۔ خفگی آمیز نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھتی رہی۔

فریدہ بولی۔ "یہ تمہارا اعتراف شکست ہوگا۔ اس میں ارمان کی نہیں، تمہاری تذلیل ہے۔ اس نے تمہارے خلوص، تمہاری معصوم محبت اور تمہارے اچھوتے جذبات کی توہین کی، تم سے جھوٹ بولا، تمہیں دھوکا دیا، تمہیں کھلونا بنانا چاہا۔ اس کا جواب یہ نہیں کہ تم ایک شکستہ گڑیا کی طرح ایک کونے میں جا گرو۔ رفتہ رفتہ تم پر فراموشی کی دھول جمتی جائے۔ زمانہ تمہیں صحیح طور پر جاننے سے پہلے ہی بھول جائے۔ تم اپنی دل شکستگی کو اپنے ساتھ ہی لئے خاموشی سے وقت کی قبر میں دفن ہو جاؤ۔ میرے خیال میں تو یہ انتہائی بے وقوفی ہوگی۔"

فریدہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "ایسے لوگوں کو جواب دینے کا زیادہ صحیح طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تم ظاہر کرو، تمہاری جوتی کو بھی ان کی پروا نہیں ہے۔ اگر اسے تمہارے اصل جذبے کی قدر نہیں تھی، اور وہ تمہارے سامنے بے نقاب ہو ہی گیا ہے تو اب تم بھی یہی ظاہر کرو کہ تمہیں اس کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ وہ تمہارے نزدیک ایک بے وقعت انسان ہے اور تم اس کی وجہ سے اپنی زندگی کو گھن نہیں لگا سکتیں۔ میرے نزدیک ایک انا پرست اور خود دار انسان کا جواب تو یہی ہونا چاہئے۔ تم اگر شکست خوردہ انداز میں افق سے غائب ہو جاؤ گی تو یہ ایک طرح سے ارمان کی کامیابی ہوگی ... یعنی وہ تمہیں اپنے دل بہلاوے کے لیے کھلونا تو نہیں بنا سکا لیکن اس نے بہرحال تمہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔"

ندیا خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔ فریدہ جھک کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے بوجھل سے لہجے میں بولی۔ "ایک شاندار مستقبل تمہارا منتظر ہے میری جان ! اگر ساتھ کام کرنے سے کترانا بھی ہو تو ارمان کو کترانا چاہئے۔ اسے انکار کرنا چاہئے۔ وہ تو پھر بھی ایک تسلیم شدہ ہیرو ہے۔ اگر وہ ایک فلم چھوڑ دے گا تو اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تمہاری تو یہ پہلی فلم ہے۔ اس سے تمہارے مستقبل کا فیصلہ ہونا ہے۔ ویسے بھی تم آدھی سے زیادہ فلم کر چکی ہو۔ اتنی محنت کی ہے تم نے... سب اکارت چلی جائے گی۔ رازی صاحب الگ خفا ہوں گے۔ شاید وہ

ہمیں عدالت میں گھسیٹ لیں۔ ویسے بھی وہ کیا سوچیں گے؟ وہ ہمارے محسن ہیں۔ انہوں نے تمہیں ہیروئن بنا کے گویا ہم سب پہ احسان کیا تھا۔ کیا کسی کے احسان کا صلہ اس طرح دیا جاتا ہے؟ قانونی کنٹریکٹ تو اپنی جگہ ہے لیکن انسان کے زبانی وعدے کی بھی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ ارمان کی بدکرداری کی سزا رازی صاحب جیسے انسان کو دینا کہاں کی شرافت ہے؟ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر سوچو میری جان ! صرف اپنے نجی صدمے کے تحت کوئی فیصلہ مت کرو۔ جس جذباتیت سے بچنے کے لئے میں نے رات تمہیں اتنی دیر سمجھایا تھا، تم پھر اسی جذباتیت کا شکار ہو رہی ہو..."

دیر تک فریدہ اسی طرح تحمل اور رسان سے ندیا کو سمجھاتی رہی.... اس کا سر سہلاتی رہی۔ دلیل کے سامنے جذبات اکثر ہار جاتے ہیں۔ ندیا اپنے آپ کو شکست خوردہ تو پہلے ہی محسوس کر رہی تھی۔ اب اس نے اپنے آپ کو لاجواب بھی محسوس کیا۔ آخرکار وہ اپنی روح کے بوجھ کو سمیٹے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس روز پہلی بار وہ شوٹنگ پر تاخیر سے پہنچی اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ارمان اس سے پہلے سیٹ پر موجود تھا۔ تاہم اس نے ندیا سے نظر نہیں ملائی۔ اس کے چہرے کا تناؤ بتا رہا تھا کہ شب رفتہ اس کے لئے بھی خوشگوار نہیں رہی تھی لیکن اس اذیت کو محسوس کرنے کی شاید اس میں اہلیت ہی نہیں تھی جس سے ندیا گزری تھی۔

فریدہ نے رازی صاحب سے معذرت کی کہ ندیا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، اس لیے انہیں تاخیر ہو گئی۔ رازی صاحب نے اس تاخیر کا قطعاً" برا نہیں مانا اور جلد ہی شوٹنگ شروع کروا دی۔ ندیا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کیمرے کے سامنے صحیح ایکسپریشن دینے یا اپنے رومانی مکالمے بولنے میں ارمان کو کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایک آدھ لفظ بھول جانے کی وجہ سے اس کی کچھ ری ٹیکس ہوئیں لیکن یہ معمول کی بات تھی۔

شاید وہ پیدائشی اداکار تھا۔ حقیقی زندگی میں اس کے اور ندیا کے درمیان ایسی خلیج حائل ہو چکی تھی جسے اب ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں پاٹ سکتا تھا لیکن

کیمرے کے سامنے وہ اس پر مرمٹنے کی اداکاری نہایت عمدگی سے کر رہا تھا اور اس میں شاید کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ جبکہ ندیا کی وجہ سے اس روز بار اتنی ری ٹیکس ہوئیں جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

اس نے اسے خوش قسمتی محسوس کیا کہ رازی صاحب اس کی اتنی غلطیوں باوجود اس پر خفا نہیں ہوئے۔ ورنہ عام طور پر وہ زیادہ ری ٹیکس پر چڑ جاتے تھے کیو کیمرا اسٹارٹ کرانے سے پہلے وہ بہت زیادہ مغز ماری کرتے تھے شاید انہیں اندازہ ہو تھا کہ آج ندیا کی ذات کی بھول بھلیوں میں شاید کہیں ماتم بپا تھا یا پھر گزشتہ شب کسی طوفان سے گزری تھی جس کے اثرات سے اب تک نہیں سنبھلی تھی۔

ندیا کو اس روز شوٹنگ کرنا بہت ہی عجیب لگا۔ وہ اور ارمان کیمرے کے سا پہنچ کر بار بار گویا مختلف انسان بن جاتے۔ ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ سجا لی والہانہ مکالمے ادا کرتے' قربان جانے والی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے لیکن جو وہ کیمرے کے سامنے سے ہٹتے' ان کے چہرے پتھرا سے جاتے۔ وہ الگ الگ جگہوں جا بیٹھتے۔ ندیا' فریدہ کے پاس آ بیٹھتی اور ارمان اپنے کچھ جاننے والوں کے حلقے میں جاتا اور دونوں ایک دوسرے کی طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہ دیکھتے۔

"کیسی منافقت کی دنیا ہے یہ بھی.... !" ندیا نے دل ہی دل میں اپنے آپ کہا لیکن کچھ دیر بعد گویا خودبخود ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی کہ نجی اور فلمی زندگی بہرحال دو الگ الگ چیزیں تھیں۔ فلم میں کام کرنا محض ایک کام تھا۔ ضرور نہیں تھا کہ نجی زندگی سے اس کا تعلق باندھا جاتا۔

آنے والے دنوں میں دھیرے دھیرے اس کی بے قراری کو قرار آتا گیا واردات قلب کا پہلا زخم مندمل ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے محسوسات کی دنیا میں اپنی فلمی نجی زندگی کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگئی وہ ایک معمول مطابق اپنے ذہن کو سپاٹ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرح اسٹوڈیو پہنچتی طرح دوسرے سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر جاتے تھے۔ کوئی دکان پر جاتا تھا' کوئی د

تھا' کوئی فیکٹری جاتا تھا!

بالکل اسی طرح ندیا بھی اسٹوڈیو جاتی تھی اور کیمرے کے سامنے اپنے حصے کا کام کر کے خاموشی سے واپس آجاتی۔ وہ بھولنے کی کوشش کرتی تھی کہ آج اس نے اسٹوڈیو میں کیا کیا تھا' کس نے اس سے کیا کہا تھا۔ اس نے کیا جواب دیا تھا۔ وہ اسٹوڈیو کی کوئی بات یاد رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

اب ارمان کو دیکھ کر بھی اس کے دل میں کوئی کسک' کوئی ٹیس نہیں ابھرتی تھی۔ اب اسے ارمان پر غصہ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ ساتھ کام ضرور کرتے تھے لیکن وہ گویا اس کے لئے ایک غیر متعلق فرد ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ارمان کی صحت پر شاید اس واقعے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ہر فلمی لڑکی سے اس کی پینگیں بڑھانے کی کوششیں جاری رہتی تھیں۔ وہ زندگی سے گویا ہر لذت کشید کرنے کے لئے سرگرداں رہتا تھا۔ ندیا کو اب واقعی خود پر افسوس ہوتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اس کے چکر میں کیوں الجھ گئی تھی۔

فلم دھیرے دھیرے تکمیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

☆

رازی صاحب وقت کے بہت پابند تھے اور اپنے اداکاروں وغیرہ سے بھی وقت کی پابندی کرواتے تھے۔ انہیں کوئی مالی مسئلہ بھی در پیش نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کی فلم ایک سال میں جا کر مکمل ہوئی۔ اس کے بعد دو تین ماہ اس کے دوسرے چھوٹے موٹے کاموں اور سنسر وغیرہ میں لگ گئے۔

آخر کار فلم کی نمائش کا دن بھی آ پہنچا۔

ندیا نے خود اپنی فلم کے رش پرنٹس دیکھے تھے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی یہ پرنٹس دکھائے گئے تھے۔ سب نے اس کے کام کی بہت تعریف کی تھی۔ پھر بھی اسے یقین نہیں تھا کہ اس نے اچھا کام کیا تھا اور نہ ہی اسے اس سلسلے میں اندازے قائم کرنے سے دلچسپی تھی۔

اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو بطور ہیروئن پہلی فلم ریلیز ہونے پر اس کے جوش و خروش' ہیجان اور اضطراب کا نہ جانے کیا عالم ہوتا مگر وہ بالکل پر سکون اور لاتعلق سی تھی جیسے یہ اس کا معاملہ ہی نہ ہو۔

گناہ گاروں کو بھی آڑے وقت میں صرف خدا ہی یاد آتا ہے۔ اس روز فریدہ بھی سجدے میں پڑی تھی اور فلم کی کامیابی کی دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس عمل کو کیا نام دے۔ اسٹوڈیو میں ایک بار اسے یہ سن کر بھی بے حد حیرانی ہوئی تھی کہ بعض فلمساز فلمیں مکمل ہونے کے بعد ان کے ڈبے اٹھا کر مزاروں پر جاتے تھے۔ ڈبوں کو مزار کے گرد گھماتے' تھے اور گڑگڑا کر دعائیں مانگتے تھے کہ پیر صاحب کی نوازشوں کے صدقے فلم کامیاب ہو جائے۔

عجیب تماشا گاہ تھی دنیا--! ندیا حیرت سے سوچتی۔

فلمی لوگوں کو فلم کے پہلے تین شو چلتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ فلم ہٹ جائے گی درمیانی رہے گی یا فلاپ ہو جائے گی۔ فریدہ کو بھی دوسرے روز ہی خبر مل گئی کہ فلم نے تہلکہ مچا دیا تھا اور اس کا سپرہٹ جانا یقینی تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پر گھنٹی بج رہی تھی۔ مبارکباد کے پیغام آرہے تھے۔ مستقبل کے ارادوں کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ فریدہ' ندیا کی بلائیں لیتے تھک رہی تھی۔

دن پہ دن گزرتے چلے گئے مگر فلم نے سینماؤں سے اترنے کا نام نہیں لیا اسے پہلے دو سرکٹوں میں ریلیز کیا گیا تھا۔ جلد ہی مزید پرنٹ بنوا کر باقی دو سرکٹوں میں بھی ریلیز کر دیا گیا اور وہاں بھی ہر شہر میں سینماؤں پر زبردست ہجوم لگ گیا۔

ندیا کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ راتوں رات کسی دوسری دنیا کی مخلوق بن گئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے آخر ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا تھا جس کی وجہ سے ہر طرف اس کا چرچا تھا۔ تاہم اب یہ ضرور اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ لوگ کیوں فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کے لئے دیوانے ہوئے رہتے تھے۔ یہاں واقعی قسمت کی دیوی کسی کو راتوں رات فرش سے عرش کی طرف لے جاتی تھی۔ یہ معجزات کی

تھی۔

فلمساز تھے کہ قطار در قطار اسے سائن کرنے کے لئے چلے آ رہے تھے۔ ہر کوئی اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیا کیا خواب دکھا رہا تھا۔ ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں میں ہر قبیل کے لوگ تھے۔ ندیا خاموشی سے فریدہ کے پہلو میں دبکی بیٹھی رہتی اور بھانت بھانت کے لوگوں کی عجیب عجیب باتیں سنتی رہتی۔

فریدہ کی منظوری کے بعد اس نے تھوڑے سے دنوں میں اٹھارہ بیس فلموں کے معاہدوں پر دستخط کر دیئے تھے۔ فریدہ نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ان میں سے بعض انہیں فصلی بٹیروں کی تھیں۔ فلمی دنیا کی اصطلاح میں "فصلی بٹیرے" ان فلمسازوں کو کہا جاتا تھا جن کے صحیح پس منظر کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔ وہ باقاعدہ اور پیشہ ور فلمساز نہیں ہوتے تھے۔

ان میں سے بعض محض فلمی دنیا کی چمک دمک اور رنگینیوں کی کشش میں چلے آتے تھے۔ بعض سنجیدگی سے راتوں رات اپنا مقدر بدلنے کی فکر میں ہوتے تھے مگر انہیں فلمسازی کی ابجد کا بھی علم نہیں ہوتا تھا۔ بعض کے پاس بہت روپیہ ہوتا تھا اور وہ کھلے دل سے خرچ کرتے تھے۔ بعض کے پاس محدود سی رقم ہوتی تھی اور وہ اسی امید پر ہوتے تھے کہ کام چلتا نظر آئے تو وہ کھینچ تان کر اور رقم کا بندوبست کرلیں گے۔

بعض کے ذرائع آمدنی مشکوک ہوتے تھے۔ بعض جائز کمائی لے آتے تھے اور فلمسازی کو مزید ایک اضافی بزنس سمجھ کر اپنانا چاہتے تھے۔ بعض کالے دھن کو سفید بنانے آتے تھے۔ فلمی دنیا واقعی ایک رنگا رنگ دنیا تھی۔ ہر طرح کا آدمی موجود تھا۔ ان میں سے کسی کو اتفاقیہ کامیابی بھی حاصل ہوجاتی تھی اور اس لائن میں بطور پروڈیوسر اس کی حیثیت مستحکم ہوجاتی تھی۔

فریدہ بلا کی مردم شناس تھی۔ ایسے بہت سے فلمسازوں کے بارے میں اس نے پیشگوئی کردی تھی کہ چند شوٹنگز کے بعد ان کی فلمیں ڈبوں میں چلی جائیں گی۔ اس

کے باوجود اس نے ان سے ایڈوانس کی رقمیں وصول کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔

چند دن بعد ہی ندیا نے شوٹنگز پر جانا شروع کر دیا۔ کئی فلمسازوں میں تو گویا دوڑ شروع ہوگئی تھی کہ ان میں سے کون سب سے پہلے ندیا کو ہیروئن لے کر اس کی فلم ریلیز کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پہلے فریدہ سے ایڈوانس کی رقمیں سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ اب وہ ہر شوٹنگ پر اپنا پرس نوٹوں اور چیکوں سے بھر کر لاتی۔ اکثر فلمساز معاوضہ شوٹنگز کے ساتھ ساتھ قسطوں میں ادا کرتے تھے۔

ملک بھر کے فلمی اور نیم فلمی صحافی ندیا سے انٹرویو کرنے کے لئے دوڑے چلے آرہے تھے۔ ہر فلمی رسالے کے سرورق پر اور اخباروں کے فلمی ایڈیشنوں میں اس کی رنگین تصویریں چھپ رہی تھیں۔ بڑے بڑے لوگ جن کا شمار معززین اور روسا میں ہوتا تھا اور جو دن کی روشنی میں فلمی عورتوں کا ذکر کرتے وقت ناک سکیڑتے تھے اپنی شاموں کی تقریبات کے لئے اسے دعوت نامے بھیجتے تھے۔ صرف یہی نہیں وہ ادھر ادھر سے سفارش بھی کرواتے تھے کہ ندیا ان کی تقریبات میں ضرور شرکت کرے۔

فریدہ اب اسے اپنے آنکھ کا تارہ کہتی تھی۔ اسے چھینک بھی آ جاتی تو کئی کئی ڈاکٹر دوڑے آتے لیکن اب فریدہ نے بالکل ہی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ ندیا کسی سے ہنس کر بات بھی کر لیتی تو فریدہ فوراً بیچ میں آجاتی اور کسی نہ کسی بہانے ندیا کو اس شخص سے دور لے جاتی۔

اب ندیا کے صرف فلمیں سائن کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہی فریدہ نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے سونے جاگنے کے اوقات کا تعین بھی وہی کرتی تھی۔ وہی اسے ہدایت دیتی تھی کہ اسے کب اور کس سے کس طرح بات کرنی چاہئے۔ کس سے رکھائی اختیار کرنی چاہئے۔ کس سے خوش دلی سے ملنا چاہئے۔ غرضیکہ اس کے منہ میں بات اپنی نہیں تھی دن اپنا نہیں تھا رات اپنی نہیں تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کا رہن سہن بھی یوں بدلا کہ ندیا کو سب کچھ ایک خواب

جیسے وقت کچھ زیادہ ہی تیزی سے گزرنے لگا اور اس دوران ندیا کو کچھ یوں لگا جیسے چراغ الہ دین کا جن آیا اور راتوں رات ان کے لئے ایک عمدہ کوٹھی تعمیر کر گیا۔ اس کے پورچ میں نئی گاڑی چھوڑ گیا اور اس کی الماریوں کو رنگا رنگ ملبوسات زیورات وغیرہ سے بھر گیا۔

روپیہ پیسہ' گھر کا انتظام' نوکروں کو رکھنا نکالنا سب کچھ فریدہ کے ہاتھ میں تھا۔ جو رقم چیکوں کی صورت میں ملتی تھی وہ جوائنٹ اکاونٹ میں جمع ہوتی تھی۔ جوائنٹ اکاؤنٹ میں دستخط ندیا اور فریدہ دونوں کے تھے اور کسی ایک کے دستخط سے رقم نکالی جا سکتی تھی لیکن چونکہ چیک بک سارا حساب کتاب اور تمام متعلقہ چیزیں فریدہ ہی کے پاس رہتی تھیں۔ اس لئے ندیا کو کبھی چیک کاٹنے یا اپنے ہاتھ سے کسی کو کچھ دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔

تاہم اتنا ضرور تھا کہ ندیا کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ کسی چیز کی طرف اس کے اشارہ کرنے کی دیر ہوتی تھی وہ اس کے لئے حاضر کر دی جاتی تھی۔ دولت مند لوگوں سے اس کے دوستی کرنے اور مراسم بڑھانے پر فریدہ کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس کے لیے تو وہ ندیا کو اکساتی تھی مگر جوان اور خوبرو مردوں سے اس کا مسکرا کر بات کرنا بھی گھر میں کسی کو پسند نہیں تھا۔ شیر خان اور احسان علی کو بھی نہیں۔

شمیم اور رقیہ کی حیثیت تو اب اس کے سامنے خادماؤں کی سی ہوگئی تھی۔ ویسے بھی ان کی حالت اجڑے چمن سے مشابہ ہوچلی تھی۔ ناروا مشقتوں اور بکی ہوئی راتوں نے انہیں وقت سے پہلے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ندیا کامیابیوں کے راستے پر طوفانی رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی مگر اس کا معاملہ عجیب تھا۔

اس کی زندگی میں جتنی گہما گہمی' شور شرابا' چکا چوند روپے پیسے کی ریل پیل' شہرت مقبولیت اور مصروفیت جتنی بڑھتی جا رہی تھی اس کے دل کا نگر اتنا ہی سونا ہوتا جا رہا تھا۔

فلم کی شوٹنگ کے دوران وہ کسی ہیرو سے جیون بھر ساتھ نبھانے کی قسم کھاتی اور ہیرو اس کے لئے آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے وعدے کرتا لیکن شوٹنگ ختم ہوتے ہیں وہ کسی دوسرے سیٹ پر کسی دوسرے ہیرو کے ساتھ کچھ اسی قسم کے مکالمے ادا کرنے چلی جاتی اور ہیرو بھی کسی اور سیٹ پر جاکر کسی اور ہیروئن کی زلفوں کے سائے میں پناہ لے لیتا۔

یوں تو اس کی نظر کرم کے طالب بہت سے تھے۔ وہ جدھر چلی جاتی لوگ اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے مگر اسے کوئی بھی اچھا نہ لگتا۔ اسے کسی کی بات پر اعتبار نہ آتا۔ ہر ایک کے الفاظ اسے کھوکھلے جھوٹے اور بے معنی لگتے۔ وہ گویا ایک مصنوعی دنیا میں رہ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف تصنع کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ارمان والے صرف ایک ہی تجربے نے دنیا پر' انسانوں پر' جذبات پر' غرضیکہ ہر چیز پر اس کا اعتبار متزلزل کر دیا تھا۔ فریدہ کی پناہ میں واقعی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ زیادہ مضبوط محسوس کرتی تھی۔

کبھی کبھی احساس تنہائی زہر بن کر اس کی رگوں میں پھیل جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس بیکراں دنیا میں ہو کسی کی نہیں تھی اور کوئی اس کا نہیں تھا۔ ہر ایک کو اس سے کوئی نہ کوئی غرض ہوتی تھی اور ہر ایک سے اسے کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا تھا۔ اس کا انتظار کرنے والے بہت تھے مگر ہر ایک کا اپنا کوئی مقصد ہوتا تھا۔

اس کے چاہنے والے بہت تھے مگر ندیا کو یہ احساس رہتا تھا کہ کسی کی چاہت بے غرض نہیں تھی۔ ہر کوئی اسے اپنی خواہشوں کی سولی پر مصلوب کرنا چاہتا تھا ہر کوئی اسے اپنی سناتا تھا۔ کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کیا چاہتی تھی؟ اس کے دل کے اندھیروں میں جو ایک دنیا آباد تھی اس میں کوئی جھانک کر نہیں دیکھتا تھا۔ اس سے کسی کو کوئی غرض نہیں تھی۔ لوگ اسے بہت سطحی سے لگتے تھے۔ ان کی سوچ سطحی تھی۔ کوئی اس کی سوچ کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

کبھی کبھی کسی فلم میں وہ وفا شعار بیوی کا کردار ادا کرتی۔ ہارڈ بورڈ کی دیواروں

والے مکان کا سیٹ لگا ہوتا اور وہ اپنے فرضی شوہر کے کوٹ میں پلاسٹک کا پھول لگاتے ہوئے مصنوعی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔ "سرتاج! آج جلدی گھر آ جائیے گا۔"

اس لمحے اس کا دل چاہتا کہ کاش یہ سب کچھ حقیقی ہوتا۔ یہ دیواریں ہارڈ بورڈ کی نہ ہوتیں۔ پھول پلاسٹک کا نہ ہوتا۔ اس کی مسکراہٹ مصنوعی نہ ہوتی اس کا شوہر فرضی نہ ہوتا اور اسے کسی دوسرے سیٹ پر پہنچنے کی جلدی نہ ہوتی اور اس کے مکالمے کسی اور کے لکھے نہ ہوتے۔ الفاظ کا دھارا اس کے اپنے دل سے آبشار کی طرح پھوٹتا۔

تاہم جب بھی اسے ذرا زیادہ دیر سونے کا موقع ملتا تو عام طور پر وہ درختوں میں گھرے ایک خوبصورت گھر کا خواب دیکھتی جس کے لان میں اس کے تخیل کا شہزادہ ٹہل رہا ہوتا تھا مگر اس کی صورت کبھی واضح نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک دھندلی شبیہ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

اس کے پھول سے بچے ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے اور خوشی سے قلقاریاں مارتے دکھائی دیتے۔ وہ انہیں جی بھر کے دیکھ بھی نہ پاتی کہ فریدہ ایک چڑیل کے روپ میں آتی اور سب کچھ تہس نہس کر دیتی۔ پھر ندیا کو کچی نیند سے جگا کر بتایا جاتا کہ اسے فلاں پروڈیوسر کا کام ڈبل شفٹوں میں نمٹانا تھا۔

زندگی کچھ اتنی تیز رفتار ہو گئی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا کب اس کی عمر تیس سال سے اوپر ہو گئی۔ دل کا سونا پن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ احساس تنہائی کچھ اور شدید ہو گیا تھا لیکن شاید کسی کو اس کے محسوسات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ دنیا کے ہجوم میں وہ اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کرتی تھی۔

وہ مکمل طور پر اس سانچے میں ڈھل گئی تھی جس میں فریدہ اسے ڈھالنا چاہتی تھی۔ فریدہ اسے جس سے رسم و راہ بڑھانے کی ہدایت کرتی ندیا اس سے رسم و راہ بڑھا لیتی۔ اسے جس حد تک جانے کی ہدایت کی جاتی وہ اس حد تک چلی جاتی۔ اس دوران فریدہ کو اس شخص سے جو فائدے اٹھانے ہوتے وہ اٹھا لیتی۔ جب محسوس کیا

جاتا کہ یہ شخص کام کا نہیں رہا یا یہ اندیشہ پیدا ہونے لگتا کہ وہ گلے کا ہار نہ بن جائے اسے چلتا کر دیا جاتا۔

شادی کے موضوع پر فریدہ کبھی اسے بات بھی نہ کرنے دیتی۔ ندیا اب نادان نہیں رہی تھی۔ اسے معلوم تھا وہ سونے کی چڑیا تھی اور فریدہ بھلا کب گوارا کر سکتی تھی کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے اڑ جائے۔

صحافی خواتین یا حضرات اب ندیا سے انٹرویو کرنے کے لیے گھر پر تو کم ہی آتے تھے کیونکہ وہ گھر پہ پائی ہی کم جاتی تھی۔ عام طور پر وہ اسے اسٹوڈیو میں ہی پکڑتے جہاں فریدہ سائے کی طرح اس کے ساتھ موجود ہوتی۔ عموماً یہ سوال انٹرویو کا لازمی حصہ ہوتا تھا۔ "آپ شادی کب اور کس طرح کے آدمی سے کرنا پسند کریں گی؟"

اس مرحلے پر فریدہ بات اچک لیتی۔ ندیا کے بجائے وہ جواب دیتی۔ "ابھی بچی کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو اسے شادی کے بارے میں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے شادی بڑا ذمے داری کا کام ہے اور ندیا ابھی اپنی تمام تر توجہ فن پر مرکوز رکھنا چاہتی ہے۔ بہرحال جب بھی ندیا کا شادی کا ارادہ ہوا' مجھے یقین ہے کہ یہ اپنے ساتھی میں خلوص شرافت اور ایمانداری دیکھنا پسند کرے گی بے شک وہ غریب ہو۔ روپیہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اصل اہمیت کردار کی ہوتی ہے۔"

جبکہ حقیقی زندگی میں صورت حال یہ تھی کہ کسی غریب آدمی کو تو وہ ندیا کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ وہ غربت کو ایک طرح کی نحوست سمجھتی تھی اور چاہتی تھی کہ ان پر کسی کی نحوست کا سایہ پڑے۔ خلوص' شرافت اور ایمانداری کی بھی اس کے ہاں صرف زبانی طور پر ہی اہمیت تھی۔

ندیا کی ایک مجبوری یہ تھی کہ اس کا سماج صرف فلمی دنیا تک محدود تھا۔ دنیا میں اس کے ہم پلہ مرد صرف فلمی ہیرو یا دو تین ہدایت کار ہی تھے۔ فلم کے ہی شعبوں میں قابل ذکر یا ذرا نمایاں مردوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور یہ تھا کہ ان میں سے بیشتر شادی شدہ تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ جو شادی شدہ

بھی وہ بھی فلمی عورت سے شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ فلمی عورت کے پاؤں چاٹ سکتے تھے مگر اس سے شادی نہیں کر سکتے تھے۔

جن جاگیرداروں' صنعت کاروں' کاروباری شخصیتوں یا خاندانی دولت مندوں سے اس نے فریدہ کی ہدایت پر تعلقات بڑھائے تھے وہ بھی شادی شدہ ہی تھے۔ ندیا کو معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی اس کے ساتھ دوسری شادی کے بندھن میں بندھنے کو مشکل سے ہی تیار ہوتا اور اگر کوئی تیار ہو بھی جاتا تو فریدہ اس کی اجازت نہ دیتی۔ اگر ندیا اس سے بغاوت کر کے کسی کی دوسری بیوی بننے کا کڑوا گھونٹ بھر بھی لیتی تب بھی اسے کسی اچھے مستقبل کی ضمانت نہیں مل سکتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی شادیوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا تھا۔ دنیا میں اس کے طلب گار جتنے زیادہ تھے شادی اس کے لیے اتنا ہی زیادہ مشکل مسئلہ تھا۔ وہ عجیب مخمصے میں تھی۔

ندیا اب دنیا کی اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک روز گلیمر سے بھرپور یہ سارا ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔ وقت کا سیلاب اسے بہا کر لے جائے گا۔ کوئی اور ابھرتی ہوئی لڑکی اس کی جگہ لے لے گی۔ جس طرح خود اس نے دوسروں کی جگہ لی تھی۔ اس کے دروازے پر فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی قطار مختصر ہوتے ہوتے آخر کار غائب ہو جائے گی۔ فلم کے پردے پر وہ کسی نئے ہیرو یا ہیروئن کی ماں کے روپ میں نظر آنے لگے گی۔ شاید اسے "ملکہ جذبات" وغیرہ کا خطاب دے کر بہلائے رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر ایک وقت آئے گا جب اس رول کے لئے بھی اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔

رفتہ رفتہ اس کے پرستار اسے بھول جائیں گے اور خط لکھنا چھوڑ دیں گے۔ فلمی دنیا ایک نچی ہوئی ہڈی کی طرح اسے دور پھینک دے گی۔ فریدہ بے شک اس وقت اس سے زیادہ بوڑھی ہو گی مگر اس کی دنیا داری کی ہوس بدستور جوان ہو گی۔ شاید وہ کسی اور نئی نویلی لڑکی کو لے کر اسٹوڈیو جانے لگے گی۔ اسے شاید یاد بھی نہیں رہا کرے گا کہ گھر کے کسی گوشے میں ندیا بھی پڑی ہے۔ کوئی اس کے سرہانے بیٹھ کر یہ

پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ "ندیا! تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیسے ہیں؟"

اس وقت کے تصور سے ندیا پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔

کام کی یلغار اور مستقبل کے خوف سے اس کے اعصاب چٹخنے جا رہے تھے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی گوشہ تنہائی میں منہ چھپا لینا چاہتی تھی مگر فریدہ اور اس پالے ہوئے محافظ پیر تسمہ پا کی طرح اس کی گردن پر سوار تھے۔

ایک بار تو اس نے سرسری لہجے میں فریدہ سے کہہ بھی دیا۔ "میرا خیال مجھے اب شادی کر لینی چاہیے۔"

فریدہ نے فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی فکر مندی کو چھپاتے ہو شگفتہ لہجے میں بولی۔ "تمہیں شادی کی طلب ہونی تو نہیں چاہئے۔" اس نے معنی انداز میں اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔

"شادی صرف جسمانی ضرورت نہیں۔ انسان کو روحانی طور پر بھی اس کی طل رہتی ہے۔"

ندیا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"میں تمہیں پہلے بھی بارہا بتا چکی ہوں کہ ہماری دنیا میں فلسفہ نہیں چلتا۔" ف قدرے بیزاری سے بولی۔ "اس قسم کے فلسفے اور سستی سی جذباتیت ہم لوگ صر اسکرین پر بیچتے ہیں۔ اسکرین پر تماشائی ہم اداکاروں کے منہ سے اس قسم کے مکا سن کر تالیاں بجاتے ہیں لیکن نجی زندگی میں اس قسم کے فلسفوں اور جذباتیت کو م گھسنے دو۔ دنیا میں ..... اور خصوصاً ہماری دنیا میں۔ دو اور دو' چار کے اصول کے تح زندگی گزاری جاتی ہے۔ فلسفے انسان کو صرف بھٹکاتے ہیں۔ اس کی زندگی کو پیچیدہ بنا ہیں۔

"مجھے پڑھانے کی ضرورت نہیں جاہل عورت!" ندیا یک لخت ہی پھٹ پڑی برسوں سے رگ وپے میں بل کھاتی ہوئی نفرتوں نے ایک لمحے کے لئے راستہ ڈھونڈ تھا۔ "مجھے معلوم ہے تم لوگ مجھے اپنے چنگل سے نکلتے نہیں دیکھ سکتے۔ تم چاہتی

یں عمر بھر تمہارے اشاروں پر ناچتی رہوں۔ زندگی میری ہے لیکن اسے بسر تم لوگ کر رہے ہو۔"

فریدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے گویا یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے بہت سے آتش بداماں الفاظ ہمیشہ گم صم رہنے والی اس عورت کے منہ سے نکلے تھے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی حیرت تھی جیسے اس کے کسی انتہائی وفادار پالتو جانور نے اچانک پلٹ کر اسے کاٹ لیا ہو۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "اس میں چنگل میں پھنسنے والی کون سی بات ہے؟ تم اپنی مرضی سے سوتی ہو' اپنی مرضی سے جاگتی ہو۔ جو آسائش تم چاہتی ہو' تمہیں فراہم کی جاتی ہے۔ اور تو اور .... تمہاری دل بستگی کی خاطر ہم تو یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ نت نئے لوگوں سے تمہاری ملاقات ہوتی رہے۔ تمہارا دل بہلا رہے۔"

"ہاں۔ صرف ان لوگوں سے ملنے کے لیے میں آزاد ہوں جن سے تمہیں بڑے بڑے فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ خواہ وہ مجھے پسند ہوں یا نہ ہوں۔" ندیا زہریلے لہجے میں بولی "لیکن ایسے کسی شخص سے میری رسم و راہ بڑھنے نہیں دی جاتی جس کے بارے میں اندیشہ ہوتا ہے کہ میں اسے پسند کرنے لگوں گی۔ مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے یا تو اسے مجھ سے بدظن کر دیا جاتا ہے یا مجھے دوسرے کاموں میں الجھا دیا جاتا ہے۔ تمہارا خیال ہے میں اب بھی ان باتوں کو نہیں سمجھتی؟"

"چلو مان لیا کہ تم ان باتوں کو سمجھنے لگی ہو بہت سمجھ دار ہو گئی ہو' لیکن اب تم کیا چاہتی ہو؟"

فریدہ کی آواز میں ہلکی سی سختی در آئی۔

"میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میرا مستقبل کیا ہو گا؟" ندیا یوں ہانپ رہی تھی جیسے اس نے بے تکان کوئی لمبی تقریر کی ہو۔

"تم ابھی جوان ہو' صحت مند ہو' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابھی سے تمہیں

اپنے مستقبل کی فکر کیوں پڑگئی ہے ؟ تمہاری عمر میں اور تمہارے جیسے عروج کے زمانے میں ایکٹریسوں کو ایسی باتیں سوچنے کا ہوش بھی نہیں ہوتا۔ مستقبل کی فکر تو وہ ڈھلتی عمر میں کرتی ہیں اور میری یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں تکلیف کیا ہے؟ تم میری بیٹی ہو اور میں نے ہر طرح تمہارے آرام و آسائش کا خیال رکھا ہے۔ کبھی تمہیں۔"

"مجھے معلوم ہے تم ماؤں والے مکالمے بول کر بڑی آسانی سے ٹسوے بہا سکتی ہو لیکن میں اب ان فریب کاریوں سے بہلنے والی نہیں۔"

پھر وہ ایک سسکی سی لے کر بولی۔ "میں اب اپنی ماں کا چہرہ بھول چکی ہوں۔ اپنا گاؤں اور اس کی گلیاں بھی یاد نہیں مگر مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں۔

فریدہ ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر رسان سے بولی۔ "چلو اگر تم میری بیٹی نہیں ہو تب بھی میں نے تمہارے ساتھ کیا برا کیا ہے ؟ تمہاری ماں نے تمہیں پالا ہوتا تو تمہاری شادی نہ جانے کتنے برس پہلے کسی مزدور کوچبان یا گدھا گاڑی والے سے ہوچکی ہوتی۔ اب تک آٹھ دس بچوں کی قطار تمہارے پیچھے ہوتی جن میں سے کسی کے تن پر قمیض نہ ہوتی تو کسی کے پاؤں جوتیوں سے محروم ہوتے۔ عین ممکن ہے کہ تمہارا میاں نشے باز بھی ہوتا۔ ہر روز گھر آ کر تمہیں دھمادھم پیٹا بھی کرتا۔ دن بھر چوٹیں سہلاتی تم گھر کا کام کاج کیا کرتیں ؟"

فریدہ کے لہجے میں تندی آ چلی تھی۔ تیز سی سانس لے کر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"اسے بھی چھوڑو جس جگہ تم ہمیں کھڑی ملی تھیں فرض کرو وہاں سے تم کسی خرکار یا کسی اور جرائم پیشہ کے ہتھے چڑھ جاتیں تو تمہارا کیا حشر ہوتا معلوم نہیں آج تم کس روپ میں زندہ ہوتیں۔"

ایک لمحے کے لیے ندیا کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس امکان کی طرف تو

رانی آج تک اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

فریدہ کے لہجے میں مزید تیزی آگئی۔ "میں نے تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔ میری اگر کوئی اولاد ہوتی تو میں اُسے بھی اسی طرح پالتی جس طرح میں نے تمہیں پالا ہے یہ ہماری ہی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج تم اس ملک کی سپر اسٹار ہو۔ ملک کے گوشے گوشے میں تمہارے مداح' تمہارے پرستار' تمہارے چاہنے والے بکھرے ہوئے ہیں۔

"اس سے مجھے کیا حاصل ؟" ندیا برہمی سے بولی۔

"تم ناشکری ہو۔" فریدہ گرجی۔ "تمہیں ان چیزوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں۔ لوگ اس مقام کو پانے کے لیے ایڑیاں رگڑتے مرجاتے ہیں۔ عام لوگ تمہاری ایک جھلک دیکھنا اعزاز سمجھتے ہیں اور خاص لوگ تمہاری ایک مسکراہٹ پر جانے کیا کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اخباروں رسالوں والے کس تزک واحتشام سے تمہاری خبریں اور تصویریں چھاپتے ہیں۔ تمہیں چھینک بھی آجائے تو خبر بن جاتی ہے۔ تم جدھر بھی نکل جاتی ہو' لوگ تمہاری راہوں میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کس کی وجہ سے ہے ؟ میری وجہ سے۔!" فریدہ نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "میں نے تمہیں اس قابل بنایا ہے۔"

"اس کی قیمت بھی تو خوب وصول کی ہے۔" ندیا چلائی لیکن اب اس کی آواز میں لرزش آچکی تھی۔ وہ کمزور پڑچکی تھی۔

اس میں بغاوت کا حوصلہ ہی کہاں تھا؟ بچپن سے اب تک وہ ایک نادیدہ شکنجے میں پھنسی رہی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرات ہی اس میں پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ یہ تو آج محسوسات کی خاموش جھیل میں نہ جانے کہاں سے کوئی پتھر آن پڑا تھا کہ چند لہریں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ یہ لہریں معدوم ہو جائیں' ندیا اس معمولی سے تلاطم کے سہارے کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ آج پہلی بار اُس کے دل میں فیصلے کی قوت امنڈ کر آرہی تھی۔

بے ترتیب سی سانسوں کے درمیان ندیا نے بات جاری رکھی۔ "میری جدوجہد کا ثمر تم سب ہی تو کھا رہے ہو۔ معلوم نہیں کون کون؟ اس گھر میں پڑا اینڈتا رہتا ہے۔ معلوم نہیں میرا کمایا ہوا روپیہ کہاں جاتا ہے۔ میں تو بس تم سب کے لئے روپیہ کمانے کی مشین ہوں۔ تمہارے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی ہوں۔"

فریدہ کے چہرے پر پتھریلا پن سا نمودار ہو گیا اور آنکھوں میں سفاکی در آئی۔ وہ کچھ بدلے بدلے سے لہجے میں بولی۔ "تمہارے لہجے میں آج جتنی غیریت ہے اتنی پہلے کبھی نہیں آئی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس لہجے میں بھی بات کر سکتی ہو۔ تمہارے منہ میں کسی اور کی زبان تو نہیں بول رہی؟"

"تم مجھے اتنا موقع ہی کب دیتی ہو کہ میں کسی کے اتنا قریب جا سکوں جو میرے منہ میں اس کی زبان بولنے لگے۔" ندیا زہریلے لہجے میں بولی۔

اس دوران بحث و تکرار کی تیز آوازیں سن کر شمیم، رقیہ اور استاد مکرم بھی کمرے میں آچکے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ استاد مکرم نے دروازہ احتیاط سے بند کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کی آواز نوکروں وغیرہ تک نہ جائے۔ اخبار والے ہر وقت ٹوہ میں رہتے تھے۔ گھر کے ملازموں وغیرہ تک سے اندر کی خبریں معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہیں لالچ دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے لیکن ندیا کو اس وقت جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کے اندر گویا کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ وہ ہر بات چیخ کر کر رہی تھی۔

فریدہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "جب ہم دولت مند نہیں تھے تب بھی اکٹھے رہتے تھے اور آج بھی اکٹھے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ تخصیص نہیں تھی کہ کماتا کون ہے۔ اور آج بھی تخصیص نہیں ہو سکتی۔ اس وقت بھی سب کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ آج بھی ہوتی ہیں اور اسی طرح ہونا چاہئے۔ گھر کا نظام اسی طرح چلنا چاہئے۔ سب سے زیادہ تمہارے ہی آرام کا خیال رکھتے ہیں۔"

"لیکن مجھے یہ عیش و آرام نہیں چاہیے۔" ندیا چلائی۔ "مجھے تمہاری مہربانیوں کی محبتوں اور شفقتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس سنہری قفس سے نجات چاہئے۔ میں اس گھر سے جانا چاہتی ہوں۔ دم گھٹنے لگا ہے۔ اس گھر میں میرا۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

دفعتہ" دروازہ نہایت آہستگی سے کھلا اور شیر خان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی سی نال کا ایک پستول تھا!

شیر خان نہایت خاموشی سے ایک کونے میں کھڑا ہوگیا اس کے پستول کا رخ ندیا کی طرف رہا۔ وہ گویا کسی کے حکم کا منتظر تھا۔

ندیا کو اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ آج سے پہلے وہ شیر خان اور اشرف علی کو خالی ہاتھ دیکھ کر بھی ڈر جاتی تھی۔ وہ دونوں اسے بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتے تھے' لیکن آج اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی جرات عود کر آئی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر بھی مرعوب نہ ہوئی۔

اس کے اندر گویا کوئی آتش فشاں پھٹ بڑا۔

پستول شیر خان کے ہاتھ میں تھا لیکن ندیا نے فریدہ کی طرف دیکھ کر چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے پستول دکھا کر خوفزدہ کرنے کی کوشش مت کرو۔" مجھے اس گھر میں میری مرضی کے خلاف نہیں رکھا جا سکتا۔ تم لوگ مجھے قیدی نہیں بنا سکتے۔"

فریدہ نہایت ملائمت سے بولی۔ "تمہیں کون اس گھر میں تمہاری مرضی کے خلاف رکھنا چاہتا ہے؟ کون تمہیں قیدی بنانا چاہتا ہے؟ تم تو اس گھر کی مالکن ہو' سربراہ ہو میرے بعد تمہی کو اس گھر کا نظام سنبھالنا ہے۔ اب بھی بہت سے معاملات میں نے صرف اس لیے اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں کہ تم ذرا جزباتی ہو' نا سمجھ ہو اور بہرحال مجھ سے کم تجربہ کار ہو۔ یوں سمجھو کہ ابھی تمہاری کچھ تربیت باقی ہے۔ جس دن میں سمجھوں گی کہ تم سب کچھ سنبھالنے کے قابل ہوگئی ہو اس دن ہر چیز گھر کا سارا نظام تمہارے ہاتھ میں آ جائے گا۔"

"مجھے نہیں چاہئے اس گھر کا نظام!" ندیا ایک بار پھر چیخی۔ "اور نہ ہی میں ساری چیزیں سنبھالنے کی بات کر رہی ہوں۔ مجھے میری زندگی لوٹا دو میری آزادی لوٹا دو۔"

"خدا کی پناہ" فریدہ رخسار پر انگلی رکھ کر حیرت سے بولی۔ "کبھی کبھی تو تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں شبہ ہونے لگتا ہے تمہاری کھوپڑی کا کوئی پرزہ کہیں گر گیا ہے۔ تم اچھی بھلی زندہ ہو' تمہاری زندگی تمہارے اپنے پاس ہی ہے' کس نے چھین لی ہے تمہاری زندگی؟ جہاں تک آزادی کا سوال ہے۔ بلکہ تمہیں تو اتنی زیادہ آزادی حاصل ہے جس کا کسی عام اور گھریلو عورت نے شاید تصور بھی نہ کیا ہوگا۔"

پھر جیسے فریدہ کو کچھ خیال آیا اور وہ پینترا سا بدلتے ہوئے بولی "دیکھو۔ اگر بات روپے پیسے کی ہے تو میں یہ مسئلہ بھی تمہیں سمجھا دوں۔" ہمارے بے شمار اخراجات ہیں ان اخراجات کے بعد بھی بہرحال بہت سا روپیہ بچ رہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ فاضل روپیہ ہمارے پاس ہے لیکن جیسا وہ تمہارے پاس ہوتا' ویسا ہی سمجھو ہمارے پاس ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس پر کس کا اختیار ہے؟ ہم نے آج تک تمہاری کوئی ضرورت پوری کرنے سے انکار نہیں کیا۔ تمہاری کوئی فرمائش رد نہیں کی۔ تمہیں سب سے زیادہ عیش و آرام سے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا یہ آج اچانک تمہیں کیوں اس قدر شور مچانے کا شوق چرایا ہے تمہارا روپیہ یوں سمجھو کہ میرے پاس امانت ہی ہے۔ میں جب محسوس کروں گی کہ تم ان معاملات کو سنبھالنے کے قابل ہوگئی ہو تو ہم بیٹھ کر حساب کتاب کرلیں گے۔ جو کچھ تمہارے سپرد کرنا ضروری ہوگا' وہ کر دیا جائے گا۔ اطمینان رکھو بے صبری مت دکھاؤ۔"

آخری الفاظ اس نے بہت ٹھہر ٹھہر کر اور گویا بہت سوچ سمجھ کر ادا کئے تھے۔

اس کا یہ کہنا بلاشبہ درست ہی تھا کہ ندیا اس کے گھر میں سب سے زیادہ آرام و آسائش سے رہتی تھی اور اس کی ضروریات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کی کوئی فرمائش رد نہیں کی جاتی تھی لیکن جو بات وہ کہنا چاہتی تھی' وہ درحقیقت کہنے کی بھی

نہیں صرف محسوس کرنے کی تھی اور محسوسات کا اس گھر میں قطعاً" عمل دخل نہ تھا۔

"میں .... میں سونے کی چڑیا ہوں نا! ندیا کے لہجے میں یک لخت ہی شکست خوردگی سی در آئی اور اس کی آواز بھرا گئی "ظاہر ہے اسی لئے مجھے شایان شان پنجرے میں رکھا جاتا ہے۔ مجھے آرام و آسائش مہیا کر کے تم میرے محسوسات تو نہیں بدل سکتیں نا؟ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں ایک غلام ہوں ایک کٹھ پتلی ہوں۔"

"محسوسات پر تو اب کسی کا اختیار نہیں ..... بات تو دلیل سے ہوتی ہے۔" فریدہ قدرے بیزاری سے بولی۔ "محسوس کرنے کا کیا ہے' اب اگر کوئی انسان راہ چلتے محسوس کرنے لگے کہ اس کے پیچھے بندر کی طرح دم نکل آئی ہے' تو اس کا علاج کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی سرجن اس کی دم کو کاٹ کر اس کے جسم سے علیحدہ کر سکتا ہے۔"

اس کا لہجہ بظاہر نرم تھا لیکن اس میں چھپی ہوئی تضحیک کو ندیا ہی محسوس کر سکتی تھی۔ فریدہ بظاہر ایک موٹی اور ان پڑھ سی عورت نظر آتی تھی لیکن نہ صرف اردو اور پنجابی مشاقی و مہارت سے بول سکتی تھی بلکہ اچھی محفلوں میں تھوڑی بہت انگریزی بول کر بھی کام چلا لیتی تھی ضرورت پڑنے پر غضب کا طنز بھی کر سکتی تھی اور وہ اس سے چوکتی نہیں تھی۔ وہ جب بولتی تھی تو اس کی زبان اس کی شخصیت سے کم ہی میل کھاتی تھی۔

"میرا مذاق اڑانے کی کوشش مت کرو۔ ندیا ایک بار پھر بپھر گئی مجھے کمزور یا حقیر بھی مت سمجھو۔ تمہارا خیال ہے میں تمہارے اس قفس کو توڑ نہیں سکتی۔ تم نے میرے پر کاٹ دیئے ہیں تو میں اڑنا بھول گئی ہوں؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں اب بھی آزاد فضاؤں میں اڑ سکتی ہوں۔ یہ صرف آنکھ کی شرم ہے جو مجھے تمہارے پاس قید رکھے ہوئے ہے۔

ایک لمحے کے لئے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ شیر خان کے ہاتھ میں پستول اب بھی ساکت تھا۔ وقفے وقفے سے وہ سرسری نگاہ سے فریدہ کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ اب

بھی گویا کسی اشارے کا منتظر تھا۔ اس کے موٹے موٹے سرخ ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے سامنے گویا کوئی ڈراما چل رہا تھا۔ اپنی باری آنے پر اسے اپنا کردار ادا کرنا تھا۔

اس دوران احسان علی کمرے میں آ چکا تھا۔ وہ یوں دبے قدموں آ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا جیسے کوشش کر رہا ہو کہ کسی کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ وہ خاموشی سے اپنے چوڑے چوڑے مضبوط ہاتھوں کی لکیروں کو تک رہا تھا گویا ان کے پیچ و خم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

گزرے برسوں میں شیر خان اور احسان علی کے بالوں میں نہایت معمولی سفیدی نمودار ہوئی تھی جب کہ چہرے کی سرخی بڑھ گئی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ قوی ہیکل نظر آنے لگے تھے۔ ندیا کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے پاس صرف پستول ہی نہیں اور بھی بہت کچھ موجود تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ فریدہ کے اشارے پر وہ کیا کچھ کر سکتے تھے۔

شمیم اور رقیہ دروازے کے قریب ہی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور اجڑے چہروں کی ویرانی کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ بہت خوفزدہ نظر آ رہی تھیں۔

فریدہ نے ندیا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

اچھا مان لیا کہ تم بے چاری ایک نہایت مظلوم لڑکی ہو اور غلامی کی زندگی گزار رہی ہو۔ اس غلامی سے آزاد ہونے کے لئے تم کیا کرو گی؟

"کچھ بھی نہیں"

ندیا گہری سانس لے کر بولی۔

"مجھے صرف اتنا کہنا پڑے گا کہ اس گھر میں مجھے میری مرضی کے خلاف رکھا جا رہا ہے اور میرا ان لوگوں سے کوئی حقیقی رشتہ نہیں۔ لوگ مجھے خود ہی تمہاری قید سے آزاد کرا لیں گے۔"

فریدہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ وہ گویا کسی

معقول دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے تم سپر اسٹار ہو۔ اس ملک م
تمہارے ہمدرد' خیر خواہ اور چاہنے والے بے شمار ہوں گے۔ تمہارے ایک اشار
لوگ نہ جانے کس کس انداز میں تمہاری مدد پر کمربستہ ہو جائیں۔ تم ایک مشہو
شخصیت ہو اور پھر ایک خوبصورت عورت بھی ہو۔ جس محکمے میں بھی جاؤ گی وہا
تمہاری خوب سنی جائے گی۔ اخبار والے بھی تمہاری پکار پر لبیک کہیں گے۔ اور اگ
ہم تمہارے ساتھ کوئی زیادتی زبردستی کرنے کی کوشش کریں تو شاید ہم سب اند
ہوجائیں۔ یہ سب باتیں مجھے معلوم بھی ہیں اور تسلیم بھی ہیں۔"

اس نے شیر خان اور احسان علی کی طرف ایک نظر ڈالی اور پر سکون انداز م
بولی تم نے گو کہ ہمارے درمیان پرورش پائی ہے لیکن تمہیں ہمارے متعلق بہت
باتیں معلوم نہیں ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ ہماری دنیا اس گھر کی چار دیواری تک مح
ہے؟ تمہیں قطعاً" اندازہ نہیں ہے کہ ہماری جڑیں اور ہماری شاخیں کہاں تک پ
ہوئی ہیں۔"

وہ بڑی طمانیت و خود اعتمادی سے مسکرائی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "
اتنے محدود لوگ نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں اور ہم اس کو کبھی معاف نہیں کرتے
بلا وجہ ہمیں چھوڑ کر چلا جائے' ہمیں ٹھکرائے' ہماری دل آزاری کرے ہمیں نہ
پہچانے کی کوشش کرے یا اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہوئے ہمیں کچلنے کی کوشش کرے
کسی بھی وقت کسی بھی جگہ کسی بھی انداز میں ہمارے انتقام کا نشانہ بن سکتا ہے۔ چا
اس وقت ہم سب جیل میں ہی کیوں نہ ہوں۔"

پھر جیسے اسے کوئی پر لطف قصہ یاد آگیا۔ اس کے شاطر چہرے پر مسکراہٹ گہ
ہو گئی لیکن یہ مسکراہٹ ایسی ہی تھی جیسے کسی سفاک اور اذیت پسند انسان کو کوئی ا
منظر دیکھنے کو مل گیا ہو جو اس کی مکروہ فطرت کے لئے تسکین کا باعث ہو۔

وہ دروازے پر کھڑی شمیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ جو اپنی
ہے نا نوجوانی میں یکایک ہی اسے ہم بہت برے لگنے لگے تھے۔ اس پر عشق کا بھو

یار ہوگیا تھا۔ ایک بینک آفیسر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ دونوں نے شادی کرلی
تھی۔ ہماری رضامندی حاصل کرنے کی اس نے ذرا بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

اس نے تمسخرانہ سی نظروں سے شمیم کی طرف دیکھا اور سلسلہ کلام جوڑا اگر یہ
ہم سے پوچھ کر شادی کرتی تو ہم کوئی اس کے حق میں برا تھوڑا ہی کرتے۔ ہم بات
کرتے کوئی معاملہ کرتے اس کی بہتری کے سو طریقے سوچتے۔ یہ اس وقت جوان تھی۔
شکل صورت کی بھی اچھی تھی۔ ہم اس کا مستقبل محفوظ کردیتے مگر اس نے خود ہی
اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ ذرا اسی سے پوچھو کہ اس کے ساتھ پھر کیا ہوا تھا۔"

اس نے کچوکا لگانے والی نظر سے شمیم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "شمیم! ذرا ندیا
کو بتاؤ نا.... کیا ہوا تھا۔"

شمیم نے سر جھکا لیا اور خاموش رہی۔ تب فریدہ کے لہجے میں ایک تحکم در آیا
جسے عام آدمی محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ شمیم بتاؤ کیا ہوا تھا۔

شمیم نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں کھنڈروں کی سی ویرانی تھی۔ ہونٹوں پر
زبان پھیر کر وہ سرگوشی کے سے لہجے میں بولی۔ "میرا شوہر موٹر سائیکل پر جا رہا تھا کہ
ایک ٹرک اُسے کچلتا ہوا گزر گیا۔ سنسان سڑک پر حادثہ پیش آیا تھا ٹرک کا نمبر بھی
نہیں دیکھا جا سکا۔"

"اور یہ حادثہ یہاں سے سیکڑوں میل دور پشاور کے نواح میں پیش آیا تھا۔ بڑا
افسوسناک حادثہ تھا۔ بے چاری شمیم کو پھر ہمارے پاس واپس آنا پڑا۔" فریدہ نے گویا
کہانی مکمل کی۔ لفظ "حادثہ" پر اس نے بڑا زور دیا تھا۔

ندیا کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس نے کچھ بولنا چاہا مگر یک لخت ہی
اس کے پاس جیسے لفظوں کا ذخیرہ ختم ہوگیا۔ طغیانی کی ایک لہر سی جیسے آکر گزر گئی تھی
اور اب امیدوں کے ساحل پر ایک بار پھر گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ اس کی ہمیشہ کی بزدلی عود
کر آئی تھی۔

کمرے میں دیگر بتیوں کے علاوہ اس کی ایک پوری دیوار پر ڈریسنگ ٹیبل پھیلی

ہوئی تھی اور اس پر بھی طاقتور قمقمے روشن تھے۔ کمرے میں دن کا سا سماں تھا۔ گویا وہ جیسے دھیرے دھیرے اندھیرے کے سمندر میں اتر رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں سے جان سی نکل گئی اور وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گھومنے والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

اسی لمحے بت بنے ہوئے شیر خان نے اپنی جگہ سے حرکت کی ۔ شاید اسے وہ سگنل مل گیا تھا جس کا وہ منتظر تھا۔ وہ ندیا کے قریب آگیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں اب بھی پستول موجود تھا۔ بایاں ہاتھ اس نے مشفقانہ سے انداز میں ندیا کے سر پر پھیرتے ہوئے اچانک اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔

ندیا کا سر ایک جھٹکے سے اس کی طرف اٹھ گیا اور تکلیف سے اس کے چہرے کے عضلات کھنچ کر رہ گئے۔ شیر خان کی شکل اس وقت اسے کسی دیو سے مشابہ محسوس ہوئی۔ بچپن سے اس کے ذہن میں شیر خان کا خوف بیٹھا ہوا تھا وہ خوف ذہن کے تاریک نہاں خانوں سے عود کر آیا۔

شیر خان دھیمے لیکن غرانے کے سے انداز میں بولا۔ ”ندیا بیگم! زندگی کو زندگی کی طرح گزارو۔ قصے کہانیوں والی باتیں چھوڑو فائدے میں رہوگی۔ خود بھی مزے میں رہو دوسروں کا بھی سکون خراب مت کرو۔ جو انسان شیر خان کی بات پیار سے سمجھ لیتا ہے وہ فائدے میں رہتا ہے۔ کچھ آیا سمجھ میں؟“

ندیا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکلی۔ شیر خان اس کے بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولا۔ ”تم کہیں نہیں جا رہی ہو ندیا بیگم! تم یہیں رہو گی اور آرام سے رہو گی آرام سے اپنا کام کرو گی۔ سب اسی طرح آرام سے اپنا اپنا کام کرتے رہیں گے۔ ہم آئندہ اس گھر میں کوئی جھگڑا سننا نہیں چاہتا۔ آیا سمجھ میں؟“

دھیرے دھیرے اس نے ندیا کے بال چھوڑ دیئے۔ فریدہ اور احسان علی یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کوئی گھریلو محفل برخاست ہوئی ہو۔ برسوں سے شیر خان نے ندیا سے اس لہجے اور اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ بے بسی، اہانت اور بے وقعتی کے

احساس سے اس کے دل میں آنسوؤں کا سمندر ابل رہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی لوگ سمجھتے ہوں گے کہ اس کے ایک اشارے پر دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی ہوگی۔ اس کی جنبش ابرو ایک حکم کا درجہ رکھتی ہوگی اور کوئی اس کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرنے کی جرات نہیں کرتا ہوگا اس کے بارے میں اس قسم کے تصورات رکھنے والے اگر اس کی حقیقی زندگی میں جھانک سکتے تو کیا سوچتے؟ کیا انہیں یقین آتا کہ اس کی حیثیت کسی قفس میں پھڑپھڑانے والے بے بس پنچھی سے بڑھ کر نہیں تھی؟

سب ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ بستر پر اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسری صبح شوٹنگ پر پہنچنے کے لیے اس کا علی الصباح اٹھنا ضروری تھا مگر وہ نہیں اٹھی۔ فریدہ اسے اٹھانے آئی تو اس نے ہٹیلے لہجے میں اعلان کردیا کہ وہ شوٹنگ پر نہیں جائے گی۔ فریدہ نے کوئی اعتراض یا اصرار نہیں کیا۔ خاموشی سے واپس چلی گئی اور اس کا ناشتہ کمرے میں بھجوا دیا۔

بعد میں ندیا اس کی آواز سنتی رہی۔ وہ ہال میں رکھے ہوئے ٹیلیفونوں پر ہدایت کاروں کی کالز کے جواب میں سب کو تسلیاں دے رہی تھی۔

”آج بے بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوسکے تو آپ آج کی ڈیٹ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرلیں۔ کل انشاء اللہ بے بی دونوں شفٹوں میں کام کرکے آج کی کسرپوری کروے گی آپ بالکل فکر نہ کریں ہم آپ کا نقصان نہیں ہونے دیں گے۔“ وہ کم و بیش سب سے یہی باتیں کررہی تھی۔

ندیا کے لیے آنے والے تمام فون فریدہ ہی سنتی تھی اور تمام جواب طلب باتوں کے جواب وہ خود ہی دیتی تھی۔ بہت کم ایسی نوبت آتی تھی کہ ندیا کو خود کسی سے بات کرنا پڑتی۔ فریدہ ہی اس کی طرف سے تمام معاملات طے کرتی۔ ہر ایک کو تاریخیں وغیرہ دیتی معاوضے طے کرتی حتیٰ کہ ندیا کی طرف سے اسکرپٹ اور کرداروں وغیرہ پر

اعتراضات بھی وہی کرتی۔

"بے بی کا کہنا ہے کہ اس اسکرپٹ میں رائٹر نے سائڈ ہیروئن کو اس سے بڑھا دیا ہے۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہیں ہے۔ آپ کو کچھ سین دوبارہ لکھوانے پڑیں گے۔" وہ کہتی۔ حالانکہ ندیا نے ایسا کوئی اعتراض نہیں کیا ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو اس نے وہ اسکرپٹ پڑھا بھی نہیں ہوتا تھا جس کی بات ہو رہی ہوتی تھی۔

اس کی طرف سے دوسروں کو فون بھی وہی کرتی تھی۔ آج بھی وہ ندیا سے پوچھے بغیر کتنے یقین سے سب کو فون پر جواب دے رہی تھی کہ ندیا کل شوٹنگ پر ضرور آئے گی اور اگر دوسروں سے ڈیٹس ایڈ جسٹ ہوگئیں تو وہ آج کے کام کی کسر کل پوری کر دے گی۔

زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ندیا کو معلوم تھا فریدہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہی ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آج اس کا احساس بے بسی عروج پر تھا۔ آج اسے زیادہ شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اپنے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں تھا اسے تو بہت سے فلم سازوں کے فون نمبر تک معلوم نہیں تھے۔

پچھلی رات جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد تو اس کی نظر میں اپنا مقام کچھ اور واضح ہوگیا تھا۔ وہ اب جذباتیت اور جھنجلاہٹ سے بچتے ہوئے اپنی آئندہ زندگی کے لئے کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی۔ اسے احساس ہوچکا تھا کہ محض جذباتیت کے ذریعے وہ فریدہ سے کوئی جنگ نہیں جیت سکتی تھی۔

آج اسے پہلی بار یہ احساس بھی ہوا تھا کہ زندہ رہنے کے لئے آزادی اور خود مختاری کا احساس کتنا ضروری تھا۔ لباس خوراک اور رہائش کی طرح یہ احساس بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل تھا۔ آج اسے احساس ہوا تھا کہ ان لوگوں کی زندگی کتنی ادھوری ہوتی تھی جو نادیدہ پنجروں میں غیر مرئی بندشوں میں اور ان کی پابندیوں میں زندگی گزارتے تھے۔

ایک بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ فریدہ سے اس گھر سے اور یہاں

کے ماحول سے نجات پانے کے لئے اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی لیکن بس دنیا میں اس کے دن گزرتے تھے اس میں مضبوط سہارے نایاب تھے۔ رفیقان شب بہت تھے۔ پل دو پل کے ساتھی بہت تھے لیکن زندگی بھر ساتھ نبھانے والے اور کسی کے لیے زمانے بھر سے لڑنے والے اس نے کم ہی دیکھے تھے اور وہ قسمت والوں کو ہی ملتے تھے جبکہ وہ اپنے آپ کو کچھ زیادہ خوش قسمت نہیں سمجھتی تھی۔

دوسرے روز بھی وہ کسل مندی کے ساتھ بستر پر ہی کروٹیں بدلتی رہی۔ ایک بار اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ بھان متی کے اس کنبے کو ستانے کے لیے وہ عدم تعاون کی پالیسی اپنا لے۔

اتنی بڑی ہیروئن ہونے کے باوجود اس نے کبھی کام کے معاملے میں نخرے نہیں دکھائے تھے۔ وقت کی پابندی اور وعدہ پورا کرنے کے معاملے میں اسٹوڈیوز میں اس کی شہرت بہت اچھی تھی۔

وہ چاہتی تو اب اپنی اس شہرت کو تباہ کرسکتی تھی۔ بری ایکٹنگ کرکے اپنے کیرئیر کو داؤ پہ لگا سکتی تھی۔ فلم سازوں کے لیے درد سر بن سکتی تھی یوں اسے بہت جلد زوال آجاتا جس کے بعد فریدہ دونوں ہاتھوں سے دولت نہیں سمیٹ سکتی تھی۔

ندیا نے یہ سب کچھ سوچا مگر اپنے اس خیال کو خود ہی مسترد کردیا۔ ان اقدامات کا کوئی دور رس فائدہ نہیں تھا بلکہ اگر ان سے دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا تھا تو خود اسے بھی پہنچ سکتا تھا۔ جتنی جلدی اسے زوال آتا اتنی ہی جلدی گھر میں اس کی قدر و قیمت کم ہوجاتی۔ کوئی بھی اس کے ناز نہ اٹھاتا کوئی بھی اس کے آرام و آسائش کا خیال نہ رکھتا۔ اس کی اہمیت شاید شمیم اور رقیہ سے بھی کم ہو جاتی۔

لوگ اداکاروں کے کام کو شاید کوئی کام ہی نہیں سمجھتے تھے مگر ندیا کو ہی معلوم تھا کہ یہ کیسا جاں سوزی کا کام تھا۔ نہ جانے کتنی ہی ایسی راتیں اس نے تیز قمقموں کی تپتی دھوپ میں گزاری تھیں جب اس کا رواں رواں آرام کے لیے فریاد کررہا تھا۔ کتنی ہی بار اس نے ایسے معقوں پر کیمرے کے سامنے کھنک دار قہقہے لگائے تھے جب

اس کا دل بے تحاشا رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس نے اداکاری میں بلاشبہ بڑا خون دل جلایا تھا۔

اگر اس کے محسوسات سے قطع نظر صرف اس کی جسمانی مشقت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تب بھی اس کے کام کو آسان نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس نے اتنی مشقت کی تھی جس میں اچھے بھلے تندرست و توانا اور مضبوط مردوں کے بھی اعصاب چیخ جاتے تھے۔ وہ شراب اور نہ جانے کن کن منشیات کا سہارا لینے پر مجبور ہوجاتے تھے۔

وہ اپنے خیالات میں غلطاں تھی کہ فریدہ خود اس کے لیے ناشتے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی اور برتن تپائی پر سجاتے ہوئے ملائمت سے بولی۔

"امید ہے اب تمہاری طبیعت ٹھیک ہوگی۔ آج تو ہمیں بہرحال شوٹنگ پر جانا ہی چاہئے لوگوں کا کروڑں روپیہ فلموں میں لگا ہوتا ہے۔ ہمیں ان کا خیال تو کرنا ہی چاہئے نا' اگر ہماری بے پروائی طول کھینچے گی تو جھگڑے ہوں گے' باتیں بنیں گی' نہ جانے کیا کچھ سننا پڑے گا۔"

ندیا خاموش تھی۔ فریدہ اس کے قریب بیٹھ کر محبت بھرے انداز میں اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔ "نقصان ہونے پر بعض پروڈیوسر عدالت میں بھی چلے جاتے ہیں۔ اخباروں کو قصے کہانیاں بنانے کا موقع ملتا ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ اچھا لگے گا؟ یہ باتیں بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ انسان کا سکون تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ان چکروں میں کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ یہ فلم انڈسٹری بھی بڑی عبرت کی جگہ ہے۔ پل میں کچھ... پل میں کچھ ... زوال آتے یہاں پتا نہیں چلتا۔"

ندیا کو رازی صاحب کی کہی ہوئی ایک بات یاد آگئی۔ رازی صاحب اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ دل کے دورے کے باعث ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن ان کی باتیں ندیا کو اکثر یاد آتی تھیں۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کی باتوں سے بڑے نایاب تجربات جھلکتے تھے۔

ندیا تلخ لہجے میں بولی۔ ایک فلم انڈسٹری ہی کیا... پوری دنیا ہی عبرت کی جگہ ہے

میڈم فریدہ! جو کچھ فلمی دنیا میں ہوتا ہے وہ تقریباً" ہر شعبے میں ہی ہوتا ہے۔ فلم انڈسٹری کی تو خواہ مخواہ ہی مثالیں دی جاتی ہیں۔"

"ہاں ... تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔" فریدہ سرہلاتے ہوئے بغور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ندیا اٹھی اور برش کرنے چلی گئی۔ ناشتے کے بعد وہ کسی کے کہے بغیر خاموشی سے اسٹوڈیو جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

☆

ندیا نے فلور نمبر چار پر شوٹنگ ختم کرلی تھی۔ اس کے بعد فلور نمبر سات پر اس کی شوٹنگ تھی لیکن کسی وجہ سے وہاں سیٹ لگنے میں دیر ہو گئی تھی جس پر ڈائریکٹر نے اس سے ہزار بار معذرت کی تھی اور تھوڑی سی مہلت مانگی تھی لیکن ندیا وہاں انتظار کرنے کے بجائے فریدہ کے ساتھ علی احمد صاحب کے دفتر میں آن بیٹھی تھی۔

علی احمد ایک ادھیڑ عمر فلم ساز تھے۔ انہیں پاکستان آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پہلے بمبئی میں ہوتے تھے۔ وہاں ایک آدھ بہت اچھی اور چند ایک درمیانے درجے کی فلمیں بنائی تھیں۔ اب مستقلاً" پاکستان آ گئے تھے اور یہیں فلم سازی شروع کردی تھی۔

ان کی ایک فلم نمائش کے لیے پیش ہو چکی تھی جس نے اچھا کاروبار کیا تھا۔ دوسری فلم زیر تکمیل تھی۔ دونوں کی ہیروئن ندیا تھی۔ فرصت کے لمحات اگر کبھی میسر آتے تھے تو ندیا کو علی احمد صاحب سے گپ شپ کر کے بڑا لطف آتا تھا۔ ان کا شعری اور ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ بے تحاشا پان چباتے تھے اور بے تحاشا ہی گفتگو کرتے تھے۔

اس روز بھی گو کہ ایک فلم کا موضوع زیر بحث تھا لیکن بیچ بیچ میں فقرے بازیاں بھی جاری تھیں۔ مزے مزے کی باتوں کے پیوند لگ رہے تھے تاہم ندیا کو گفتگو میں اتنا لطف نہیں آ رہا تھا جتنا پہلے آیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علی احمد صاحب

کے دفتر میں لکڑی کے پارٹیشن وغیرہ بن رہے تھے۔ بڑھئی ٹھونک پیٹ میں مصروف تھے۔ ہر لمحے ٹھک ٹھک کی زوردار آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی بمشکل چند سیکنڈ کے لیے بند ہوتی تھیں۔ وہیں ایک کیبن میں یہ محفل جمی ہوئی تھی۔

ندیا کو یہ محسوس کر کے حیرت ہو رہی تھی کہ اب وہ ذرا سا شور بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے خیال میں یہ اعصابی کمزوری کی نشانی تھی۔ ہتھوڑی کی ہر ضرب گویا اس کی کنپٹی پر پڑ رہی تھی۔

وہ گپ شپ کے شوق میں آ کر بیٹھ تو گئی تھی لیکن اب درحقیقت اٹھ کر بھاگنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ علی احمد صاحب ٹھک ٹھک سے بے نیاز اپنی داستان گوئی میں مصروف تھے۔ انہیں گویا شور کا قطعاً" احساس نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ یہ ان کا اپنا کام تھا۔

دفعتاً" دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور پختہ عمر کے ایک دراز قد شخص نے علی احمد صاحب کے کمرے میں جھانکا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا وہ چوڑی کاٹھی کا ایک طویل قامت شخص تھا جس کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے' وہ بیش قیمت لیکن شکن آلود سی پتلون قمیض میں ملبوس تھا' بادامی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی اور انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہی تھی۔

وہ دروازے پر ہی تن کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ سے علی احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "مسٹر علی احمد! تمہیں کس الو کے پٹھے نے مشورہ دیا تھا کہ تم انڈیا سے یہاں آ جاؤ؟"

ایک لمحے کے لئے تو علی احمد صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ ان سے اس قدر جارحانہ اور گستاخانہ لہجے میں بھی بات کر سکتا تھا۔ وہ کچھ سنبھل کر اپنی ریوالونگ چیئر پر سیدھا ہوتے ہوئے بولے۔ "کیا ہوا اعجاز صاحب؟"

"دو گھنٹے سے آپ کے دفتر میں ٹھک ٹھک ہو رہی ہے۔" وہ شخص پہلے سے

زیادہ برہمی سے بولا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے اور میرے دفتر کی درمیانی دیوار ایک ہی ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے تھا کہ میں کوئی انگوٹھا چھاپ ڈائریکٹر نہیں ہوں جنہیں دنیا بھر کے شور شرابے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں' کہانی کار ہوں۔ میں آج کل ایک کہانی پر کام کر رہا ہوں اور آپ کی اس ٹھک ٹھک نے پچھلے دو گھنٹے سے مجھے ایک مکالمہ بھی مکمل کرنے نہیں دیا۔"

اس کی آواز میں لمحہ بہ لمحہ تندی آتی جا رہی تھی۔ "آپ جیسے لوگوں نے اسٹوڈیوز کو چنڈو خانے بنا دیا ہے۔ اسٹوڈیوز' تخلیقی کام کرنے والوں کے ٹھکانے ہوتے ہیں' مگر آپ کو یہ بات شاید کسی نے نہیں بتائی۔ کس گدھے نے آپ کو ڈائریکٹر بنا دیا ہے؟ اگر آپ کو شور شرابے والا کوئی کام کرنا ہی ہو تو اخلاقاً" کم از کم پڑوسیوں سے اجازت تو لے لینی چاہئے تھی کہ ان کے کسی کام میں ڈسٹربنس تو نہیں ہوگی۔"

"میں کس وقت یہ کام کراؤں؟ آخر یہ بھی تو ضروری ہے۔" نووارد کے تمام تر اکھڑپن کے باوجود علی احمد صاحب نہایت رسان سے بولے۔ وہ بہت ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے... یا پھر شاید ان کے خیال میں اعجاز حامد کے سامنے مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

"آپ آدھی رات کے بعد یہ کام کرائیں جب میں یہاں نہیں ہوتا۔" اعجاز حامد غرایا۔

"اور اگر میں ایسا نہ کروں؟ میرے لئے اگر آج شام تک ہی یہ کام مکمل کرانا ضروری ہو تو...؟" علی احمد صاحب گویا جرات سے کام لیتے ہوئے بولے۔

"تو میں آپ کے ان کام کرنے والوں کو اٹھوا کر باہر پھینکوا دوں گا۔" اعجاز حامد غصے میں دیوار پر الٹا ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

پھر وہ جانے کے لیے تیزی سے گھوم گیا لیکن دروازے سے ایک قدم نکالنے کے بعد رکتے ہوئے مڑ کر بولا۔ "اور یہ میری کسی فلم کا مکالمہ نہیں ہے۔ اب کام شروع کراؤ تو ذرا سوچ سمجھ کر کرانا۔ میں صرف قلم چلانا ہی نہیں جانتا۔" اس نے جملہ

تشنہ سا چھوڑ دیا۔

وہ جا چکا تو علی احمد صاحب گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔ "یہ شخص بہت ہی اکھڑ اور بددماغ ہے۔ میں نے ایک پڑوسی کے طور پر اس سے دوستی استوار کرنے کی بہت کوشش کی مگر یہ تو گویا کسی اور ہی دنیا میں رہتا ہے، کسی سے گھلتا ملتا ہی نہیں۔"

پھر انہوں نے آواز دے کر کاریگروں کو کام کرنے سے روک دیا اور ساتھ ہی گویا فریدہ اور ندیا کے سامنے وضاحت پیش کی۔ "میں اس قسم کے بے مقصد سے معاملات میں لڑائی جھگڑے کا قائل نہیں ہوں۔ انسان لڑے تو کسی اہم مقصد کے لیے لڑے۔"

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "ویسے اعجاز حامد کی یہ خوبی مجھے پسند ہے کہ جو کہتا ہے، عموماً کر گزرتا ہے۔ دبنگ آدمی ہے، اثر و رسوخ والا بھی ہے، بہرحال میں بھی چاہوں تو اڑ سکتا ہوں۔ اس کی دھمکی کے باوجود کام جاری رکھ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے کسی ہنگامے سے نمٹنے کا بندوبست کرنا ہوگا۔ وقت ضائع ہوگا انرجی ضائع ہوگی، بدمزگی ہوگی، اسٹوڈیو کا ماحول خراب ہوگا... اور میں اب بوڑھا ہو چلا ہوں۔ میں اب دل سے نہیں دماغ سے سوچتا ہوں۔ میں اب اپنی توانائی صرف اہم کاموں میں استعمال کرتا ہوں فضول کاموں میں ضائع نہیں کرتا۔" وہ خوش دلی سے ہنسنے لگے۔

ندیا کو معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ محض اپنے آپ کو تسلیاں دینے والی بات نہیں تھی۔ وہ کچھ ایسے بے دست و پا بھی نہیں تھے، بات واقعی یہی تھی کہ وہ بڑے معقولیت پسند اور غیر جذباتی آدمی تھے۔

اعجاز حامد کو ندیا معمولی حد تک جانتی تھی۔ چند سال قبل اس نے ایک مکالمہ نگار کے طور پر فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا اور اس کے مکالموں نے دھوم مچادی تھی۔ اس نے فلمی مکالمہ نگاری کو بلاشبہ ایک نیا اسلوب دیا تھا۔ مکالمہ نگاری کے بعد اس نے چند فلموں کی مکمل کہانیاں بھی لکھیں۔ اس کے بعد اسے ہدایت کاری کے میدان

میں قدم رکھنے کا موقع ملا اور مزید کچھ عرصے بعد وہ خود فلم ساز بن گیا۔

اب تک اس کی صرف دو فلمیں پیش ہوئی تھیں جن میں سے ایک بے حد کامیاب ہو گئی تھی اور دوسری ناکام ہو گئی تھی۔ بہرحال انڈسٹری میں اس کا نام بڑا بھی تھا اور معتبر بھی، اس کے بارے میں عام رائے یہی تھی کہ اسے اپنے بارے میں بڑا زعم ہے۔ لوگ اس بات سے تھوڑا سا چڑتے بھی تھے لیکن اس سے مرعوب بھی رہتے تھے۔

عجیب بات یہ تھی کہ فلم انڈسٹری میں ہی رہتے ہوئے اور اپنے اپنے شعبے کی ممتاز شخصیتیں ہوتے ہوئے بھی اس کی اور ندیا کی کبھی ایک دوسرے سے باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بس یونہی کبھی کسی فلمی تقریب میں یا اسٹوڈیوز میں آتے جاتے ان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے صورت آشنا اور نام سے اچھی طرح واقف تھے۔ خوش خلقی سے ایک دوسرے کو سلام کر لیتے تھے اور بس...!

اعجاز حامد نے اپنی دونوں فلموں میں شہلا کو ہیروئن لیا تھا جو ندیا ہی کی طرح پراسرار تھی۔ اعجاز حامد کبھی اپنی کسی آئندہ فلم کے بارے میں سرسری بات چیت کرنے کے لئے بھی ندیا کے پاس نہیں آیا تھا اور ندیا کو کبھی اس بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ کس پروڈیوسر یا ڈائریکٹر نے اسے اپنی فلم میں شامل کیا تھا اور کس نے نہیں۔ پہلی بار فلم ہٹ ہونے کے بعد سے اب تک اس کے پاس ہمیشہ اتنی فلمیں رہی تھیں کہ اسے سونے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا۔

آج ندیا نے اعجاز حامد کے اکھڑپن کا مظاہرہ پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں سے اس کے افسانے سنے تھے کہ وہ خودپسند ہے، متکبر ہے۔ اس کی گردن ہر وقت تنی رہتی ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، خود کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ندیا کو کبھی ان باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک اعجاز بس ایک ہدایت کار، کہانی نویس اور ڈائریکٹر تھا، بالکل اسی طرح جس طرح

دوسرے بہت سے لوگ تھے۔ آج وہ اس قدر غصے میں علی احمد صاحب کے دفتر میں تھا کہ ندیا اور فریدہ کی طرف اس کی توجہ ہی نہیں گئی تھی۔ سلام دعا تک نہیں ہو تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ ندیا کو اس کا یہ غصہ' یہ طنطنہ' یہ اکڑ' یہ جارحیت اچھ لگی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس شخص کے اندر ایک جرات مند اور بے خو انسان چھپا ہوا تھا۔ اس کے انداز و اطوار میں ضد' سرکشی اور خودسری تھی۔ ندیا کو خصوصیات یکایک ہی اچھی لگنے لگی تھیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے تح الشعور کے اندھیروں میں یہ تغیر گزشتہ رات ہی آیا تھا یا اس احساس کی جڑیں وہاں پ سے موجود تھیں۔

اعجاز کی گونجیلی آواز کی بازگشت سے اس کا دل ابھی تک لذت آمیز انداز م دھڑک رہا تھا۔ وہ شخص تیز و تند لہجے میں اسے بتا گیا تھا کہ وہ اپنے لئے لڑ سکتا تھا اور شاید کسی دوسرے کے لئے بھی!

وہ جا چکا تھا مگر ندیا ابھی تک کھوئے کھوئے سے انداز میں دروازے کی طر دیکھ رہی تھی۔ فریدہ نے اسے چونکا دیا۔ وہ اٹھ کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"چلو ندیا! شریف صاحب کا سیٹ لگ گیا ہے۔ ان کا اسسٹنٹ بلانے آیا ہے۔"

ندیا کو علم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ کب انٹر کام کی گھنٹی بجی تھی' کب علی اح صاحب کو اطلاع ملی تھی کہ باہر کوئی اسسٹنٹ بلانے آیا ہے اور کب انہوں نے یہ پیغا فریدہ کو دیا تھا۔ ندیا وہیں بیٹھے ہوئے بھی کچھ نہیں سن سکی تھی۔ زندگی میں پہلی بار یوں اپنے آپ سے اور اپنے گردوپیش سے بے خبر ہوئی تھی۔

اسے کیا ہوگیا تھا؟ اپنے آپ سے بھی اسے اس سوال کا جواب نہ ملا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور علی احمد صاحب کو خدا حافظ کہہ کر دفتر سے نکل آئی اس کے قدم کچھ عجیب سے انداز میں اٹھ رہے تھے جیسے حسن اتفاق سے وہ خوابوں ک راہ گزر پر نکل آئی ہو' سپنوں کے دیس کو جانے والی کسی ان دیکھی انجانی پگڈنڈی پ

پاؤں پڑ گیا ہو۔

اس روز وہ رات گئے گھر پہنچی تو تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ تیز شنیوں کے اثر سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور جلد گویا چیخ رہی تھی۔ ایمونیا حلول کی مدد سے اس نے اپنا گہرا فلمی میک اپ اتارا پھر چہرہ' کلائیاں اور گردن و خاص حفاظتی کریم سے تر کرکے لیٹ گئی۔ وہ فوراً سوجانا چاہتی تھی مگر دو بادامی ھیں سوچ کے افق سے مسلسل جھانک رہی تھیں۔ اور وہ اسے سونے نہیں دے تھیں۔

اس نے فلم کے پردے پر حسن و عشق کے پیچ و خم میں الجھے ہوئے ان گنت لے بولے تھے' نہ جانے کتنی مرتبہ تو اقرار محبت کیا تھا اور نہ جانے کتنے ایسے رومانی ظر عکس بند کروائے تھے جنہیں دیکھ کر محبت کرنے والوں کی شکستہ امیدوں کو نیا ل مل جاتا تھا مگر ایک ناقابل یقین سی حقیقت یہ تھی کہ اسے آج تک علم نہیں کا تھا کہ محبت کسے کہتے ہیں؟ اسے نہیں معلوم تھا کہ رگ و پے میں وہ سرور کیسے ا تھا جس کا اس نے آج تک صرف تذکرہ ہی سنا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ں میں رت جگوں کی لذت کیا تھی؟

مردوں میں اس کا دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ قدم قدم پر لوگوں کو نذرانہ دل راہوں میں کھڑے دیکھتی تھی مگر آج تک کسی کو دیکھ کر اس کا دل یوں نہیں دھڑکا ۔ حتیٰ کہ اعجاز حامد کو بھی اس نے بارہا اسٹوڈیوز میں دیکھا تھا مگر آج سے پہلے کبھی کی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔

شاید دل کے صحرا میں کلیاں چٹکنے اور شگوفے پھوٹنے کا بھی کوئی خاص موسم' خاص لمحہ ہوتا ہے' اس نے سوچا۔

شاید آج اس نے اعجاز کی شخصیت کا ایک ایسا روپ دیکھا تھا جو اسے بھا گیا تھا۔ کی شخصیت میں گھن گرج تھی مضبوطی تھی اود عورت شاید محبت میں بھی تحفظ کرتی ہے یا پھر وہ تحفظ میں محبت ڈھونڈتی ہے۔ شاید یہ صرف اس جیسے حالات

میں پھنسی ہوئی عورت کا مسئلہ تھا۔ آج تک ہر مرد اسے بڑا کھوکھلا اور غرض کا بندہ
تھا' لیکن آج یکایک ہی دل میں جیسے کچھ اتھل پتھل سی ہو گئی تھی۔

پہلی نظر میں محبت ہو جانے والی بات اسے ہمیشہ بڑی احمقانہ اور فضول لگی تھی اسے کبھی بھی اس پر یقین نہیں رہا تھا لیکن آج اسے تسلیم کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ مخصوص چہرے ہوتے ہیں جو کسی مخصوص لمحے میں اچانک ہی دل کا چور دروازہ کھول کر اندر آن بستے ہیں اور انسان یوں انہیں دامن خیال میں چھپا لیتا ہے جیسے یہی عمر کا حاصل ہو۔

حیرت اسے اس بات پر بھی ہو رہی تھی کہ لکھنے لکھانے والے لوگ تو اسے بھی پہلے کبھی زیادہ پرکشش نہیں لگے تھے۔ ان کی تحریروں اور شخصیتوں کے درمیان اسے عموماً ایک خلیج سی حائل نظر آئی تھی۔

پنجابی فلموں کے ایک مشہور اور مقبول مصنف سعید اقبال سے مل کر تو وہ رہ گئی تھی ۔ وہ بہت کامیاب مصنف تھا۔ اس کی لکھی ہوئی فلمیں عموماً ڈائمنڈ مناتی تھیں۔ اس کے ہیرو کے ہاتھ میں لاٹھی ' بندوق یا گنڈا سا ہوتا تھا اور وہ کشتوں کے پشتے لگا دیتا تھا لیکن اس کرخت اور ناقابل شکست ہیرو کا کردار تخلیق کرنے مصنف بذات خود نہایت دبلا پتلا اور مرنجان مرنج قسم کی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا ہیرو دہاڑتا تھا مگر وہ خود نہایت دھیمے لہجے میں میٹھی میٹھی گفتگو کرتا تھا۔

ندیا اس کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ "آپ کی فلموں کا ہیرو اس قدر دبنگ ' جنگجو اور تقریباً مافوق الفطرت ہوتا ہے لیکن آپ خود حلیم الطبع اور دھیمے آدمی ہیں۔ یہ تضاد عجیب نہیں ؟"

"پہلی بات تو یہ کہ ایک لوہار جس نے زندگی میں صرف تلواریں بنانا ہی سیکھا ہو' ضروری نہیں کہ وہ خود بھی بہت بڑا شمشیرزن ہو۔"

ندیا مسکرا دی۔ سعید اقبال نے بات جاری رکھی : تحریر اور شخصیت کے تضاد پر ہمیں اتنا حیران نہیں ہونا چاہیے۔ لکھنے والے دراصل اپنے تشنہ تعبیر خواب لکھتے

ہیں۔ زندگی کے وجود پر پڑے ہوئے زخموں کو چھپانے کے لئے اپنے اور دنیا کے درمیان کہانیوں کی دیوار کھڑی کر لیتے ہیں۔ اپنی کہانیوں کی اوٹ میں چھپ جاتے ہیں... پناہ لے لیتے ہیں۔"

ندیا مسکرائی اور بولی۔ "میری امی کہتی ہیں میں فلسفہ بہت بولتی ہوں۔ آپ تو مجھ سے بھی گاڑھا فلسفہ بولتے ہیں۔"

سعید اقبال سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر مربیانہ لہجے میں بولا۔ " اس میں فلسفے والی تو کوئی بات نہیں... ویسے 'فلسفہ بھی کوئی الجبرا یا ٹرگنومیٹری کا پیچیدہ سوال نہیں ہوتا۔ وہ بھی محض کوئی خیال ہوتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں کوئی نظریہ حیات ہوتا ہے' زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں کوئی اظہار خیال ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیوں تاثر بن گیا ہے کہ کسی بہت پیچیدہ الجھی ہوئی اور لا حاصل سی بات کو فلسفہ کہا جاتا ہے۔"

"خیر... آپ کہانی اور کہانی کار کی بات کر رہے تھے۔" ندیا نے یاد دلایا۔

"ہاں..." سعید اقبال اصل موضوع پر لوٹ آیا۔ "کہانی کار کی اپنی زندگی میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے 'کہانیوں میں وہ اسی کے بارے میں خوب لکھ لکھ کر اپنے دل کو غیر شعوری طور پر تسکین پہنچاتا ہے۔ شاید کوئی احساس محرومی ہی انسان کو فن کار بناتا ہے۔ کم رو قلم کار کی تحریر میں بڑا حسن ہوتا ہے اور محبت سے محروم ادیب کی تحریروں میں محبت ہی بکھری ہوتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی' عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "بالکل اسی طرح جیسے میں ایک کمزور آدمی ہوں' آسانی سے مکھی بھی نہیں مار سکتا' میں نے کبھی ہڈی کاٹنے کی چھری بھی صحیح طور پر نہیں پکڑی ... لیکن میرا ہیرو گنڈاسے یا کلاشنکوف سے کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے۔"

پھر اسے جیسے کچھ خیال آیا اور وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ " اس معاملے کا ایک پہلو کاروباری بھی ہے۔ میں ایک پیشہ ور مصنف ہوں' لکھنا میرا ذریعہ معاش ہے۔

مجھے پرڈیوسر معاوضہ دیتا ہے اور پروڈیوسر کاروبار کے لیے فلم انڈسٹری میں آتا ہے میں اس کے لیے وہی کچھ لکھوں گا جسے فلماکر وہ نہ صرف اپنی لگائی ہوئی رقم کو بچائے بلکہ اس پر منافع بھی کما سکے۔ اس لیے میں وہی لکھتا ہوں جسے تماشائیوں کی اکثریت پسند کرے۔"

"اس کا مطلب ہے کل لوگ آپ سے اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور مانگنے لگیں تو آپ اپنی کہانیوں میں وہ بھی دے دیں گے ؟" ندیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ " آپ کا اپنا کوئی تخیل ' کوئی معیار نہیں ؟"

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" سعید اقبال رسان سے بولا۔ " میں تو شاید اس سے بڑھ کر وہ کچھ نہ دوں جو لوگ مجھ سے طلب کرسکتے ہیں لیکن شاید کوئی دوسرا مصنف ' کوئی دوسرا ڈائریکٹر یہ بھی کر گزرے۔ دنیا ہر طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی ہے اور آپ نے جو اپنے تخیل اور اپنے معیار کی بات کی ہے تو میں اپنے تیسرے جواب میں اسی کی وضاحت کرنے لگا تھا۔"

اس نے سگریٹ کا ایک اور طویل کش لیا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے پان چباتے ہوئے وہ بولا۔ " میں یہ کہنے لگا تھا کہ میں جو کچھ پیش کرتا ہوں ' شاید وہی میرا تخیل ہو ' میرا معیار ہو۔ ہیرو کو اپنا آئیڈیل کہنے میں کوئی عار نہیں۔"

وہ ندیا کے تاثرات دیکھ کر گویا محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ " میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں ' میں پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں کہ میں ایک کمزور اور ناتواں آدمی ہوں۔ میرا ہیرو میری محرومیوں کا عکس ہے ' اسے تخلیق کرکے میری محرومیوں کی تسکین ہوتی ہے۔"

پھر سعید اقبال نے مزید وضاحت کی۔ " شاید جو کچھ میں لاشعوری طور پر کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کرسکا ' وہ میں اس ہیرو کے ذریعے کرواتا ہوں۔ میری فلموں کا جاگیردار اس معاشرے کے مطلق العنان اور جابر طبقوں کا سمبل ہے میں خود ان طبقوں کے

خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا لیکن میرا ہیرو ان سے ٹکراتا ہے اور انہیں نیچا دکھاتا ہے۔"

اس کا سگریٹ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک نیا سگریٹ سلگایا اور سلسلہ کلام جوڑا۔ " میرا ہیرو جو کچھ کرتا ہے وہ انہونی سی باتیں ہیں لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ یہ سب کچھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ' کہانیوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ غیر معمولی اور ناقابل یقین طاقتیں رکھنے والے ہیرو کی کہانیاں لوگوں کی اکثریت بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہے۔ دراصل یہ سب لوگ ... یا یوں کہئے کہ ہم سب لوگ ' کسی نہ کسی چہرے کے سامنے سرنگوں ہیں ' کسی نہ کسی اعتبار سے کمزور ہیں۔ وہ ایک فرضی دنیا میں ہم سب کی محرومیوں کا مداوا کرتا ہے۔"

سعید اقبال نے بڑی فراخدلی اور بالغ نظری سے اپنا نقطہ نظرواضح کردیا تھا۔ ندیا کو اس کی باتوں میں بڑا وزن محسوس ہوا تھا۔ وہ ایک معقول انسان تھا۔ اتنا مجہول اور کم فہم نہیں تھا جتنا بظاہر نظر آتا تھا۔

مگر ' سعید اقبال کی صرف باتوں سے ہی ندیا متاثر ہوئی تھی جبکہ اعجاز حامد کی بات ہی کچھ اور تھی!

ندیا نے اس کی دونوں فلمیں دیکھی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے جن فلموں کی کہانیاں یا مکالمے لکھی تھے ' ندیا نے وہ بھی دیکھی تھیں۔ فلمیں دیکھتے رہنا اور ان کے بارے میں تمام ضروری معلومات رکھنا اس کے پیشے کا ایک حصہ تھا۔ اعجاز حامد کی بیشتر فلمیں حریت اور جذبہ آزادی کے موضوع پر تھیں۔

اس قسم کے موضوعات پر کامیاب فلمیں بنانا بہت مشکل تھا لیکن اعجاز نے نہایت ڈرامائی پروڈکشنز کی ذریعے یہ کام کر دکھایا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ ترین موضوع معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مکالموں میں بھی ایک عجیب گھن گرج ' ایک تڑپ محسوس ہوتی تھی جیسے ہر کردار کے سینے میں جوش و خروش اور بغاوت کا ایک آتش فشاں مچل رہا ہو۔ اسی لئے اس کے مکالمے سینما گھروں میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے تھے

اور ان پر تالیاں بجتی تھیں۔

آج ندیا کو اندازہ ہوا تھا کہ حقیقی زندگی میں بھی اعجاز حامد کے وجود میں ایک با، سرکش اور جوشیلی روح مقید تھی۔ وہ جھکنے ، سرنگوں ہونے اور شکست تسلیم کر والا آدمی نہیں تھا۔

ندیا ان دو بادامی آنکھوں کو تصور میں بسائے بالآخر سو گئی جن میں غیظ و غضب کے شعلے رقصاں تھے۔

دوسرے روز اسے آوٹ ڈور شوٹنگ پر جانا پڑا ورنہ اس کا خیال تھا کہ کسی کسی بہانے اعجاز حامد سے ضرور ملے گی۔ آوٹ ڈور شوٹنگ مسلسل تین دن چلنا تھ اور یہ تین دن ندیا نے صرف اسی فلم کے لیے دیئے ہوئے تھے۔ ان تین دونوں کے دوران اسے اسٹوڈیو جانا ہی نہیں تھا۔

لاہور کے نواح میں ایک ایسے علاقے میں شوٹنگ جاری تھی جسے فلم میں صحرا علاقہ دکھایا جاسکتا تھا۔ تین دن تک اس کی مصروفیت یہی رہی کہ وہ صبح لوکیشن پر پہنچ اور شام ڈھلے تھکی ہاری واپس آجاتی۔ اسے اپنے آپ پر حیرت تھی کہ اس دورا اعجاز حامد کا تصور ایک لمحے کے لئے بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا۔

اس دوران اس نے کچھ ایسی فضا تیار کرلی تھی کہ اگر وہ اعجاز حامد سے ملاقا کرتی تو فریدہ چونکی نہ ہوتی۔ اب ندیا کو بھی تھوڑی بہت دنیاداری اور کچھ چالاکیاں آ جارہی تھیں۔

آوٹ ڈور شوٹنگ کے دوران ایک روز اس نے فریدہ سے کہا۔ کیوں نہ رفتہ رفتہ ہم پروڈکشن کی طرف بھی آنے کی کوشش کریں؟ انسان کے پلے چار پیسے ہوں انہیں زیادہ سے زیادہ منافع بخش کاموں میں لگانے کی کوشش کرنی چاہئے... اور فلم لائ تو ہماری اپنی لائن ہے ، یہاں تو ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہیں۔ باہر سے آ والوں کے مقابلے میں فلم بنا سکتے ہیں ۔ ہیروئن میں خود ہوں۔"

ندیا کو معلوم تھا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنا شاید فریدہ کی زندگی کا واحد

شعور تھا۔ اس لئے اس نے اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

"اپنی پروڈکشن ...؟" فریدہ کچھ الجھن زدہ سے لہجے میں بولی۔ شاید اس نے آج تک اس پہلو پر سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے خیال میں فلموں میں کام کرنا آسان تھا لیکن خود فلم بنانا بہت مشکل تھا۔ شاید اسے ندیا کے منہ سے کاروباری بات سن کر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تو یہی تھا کہ فلم انڈسٹری میں رہ کر بھی ندیا کاروباری طور طریقے نہیں سیکھ سکی تھی اور نہ ہی اسے نفع نقصان کے معاملات سنبھالنے کا سلیقہ تھا۔ وہ تو بس سر جھکا کر کام کرنا جانتی تھی۔

"ہاں۔" ندیا نے منجھے ہوئے کاروباری لوگوں کا سا لہجہ اختیار کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس روز علی احمد صاحب کے آفس میں اعجاز حامد کو دیکھ کر اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا کہ اگر ہم اس جیسے مصنف ، ڈائریکٹر اور خواجہ ارشاد صاحب جیسے میوزک ڈائریکٹر کو لے کر فلم بنانے کی کوشش کریں تو سپرہٹ پروڈکشن دے سکتے ہیں فلم سیٹ پر ہی بک جائے گی ... اور اچھی فلموں کی کمائی تو انسان عمر بھر کھا سکتا ہے۔"

فریدہ کو یہ تجویز شاید پر خطر محسوس ہوئی۔ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ "ارے چھوڑو۔ ہمیں کیا پڑی ہے اتنا روپیہ پھنسانے اور اتنا درد سری مول لینے کی ، ہیروئن کے طور پر جب تمہاری مارکیٹ ویلیو ختم ہو جائے گی تب ذاتی پروڈکشن کا سوچیں گے۔"

"زیادہ روپیہ کہاں پھنسے گا۔" ندیا سمجھانے لگی۔ "بہت ہوا تو تین چار لاکھ روپیہ لگانا پڑے گا۔ پروڈکشن میں بڑے بڑے نام شامل ہوں تو چند شوٹنگز کے بعد ہی ڈسٹری بیوٹر رقمیں لے کر دوڑے آئیں گے۔ ہم چاہیں تو سارا کھیل ہی پرائے پیسے سے چلا سکتے ہیں۔ اپنے نام اور مقام سے فائدہ اٹھانے کا یہی تو وقت ہے۔ ہیروئن کے طور پر میری مارکیٹ ویلیو ختم ہوئی تو پھر لوگ ہم سے بات بھی تو ذرا اونچے ہو کر کریں گے ، ان کے لئے ہم ایک عام پارٹی ہو جائیں گے۔"

وہ یوں سنجیدگی سے دلیلیں دے رہی تھی جیسے اس نے واقعی سنجیدگی سے فلمیں

بنانے کا تہیہ کر لیا ہو حالانکہ اس کے ذہن میں دور دور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔

"خیر' سوچیں گے۔" فریدہ بے دلی سے بولی "ویسے میں نے سنا ہے آج کل اعجاز حامد کسی اور کے لئے کام نہیں کر رہا۔ اس نے اپنی صلاحیتیں صرف اپنے ادارے کے لیے وقف کر دی ہیں' حالانکہ اس کے پاس کئی آفرز تھیں لیکن پچھلے ایک سال سے اس نے کسی پارٹی کے لیے کام نہیں کیا۔ پچھلے دنوں اس کی نئی فلم بہت نرم گئی ہے۔ ایک آدھ فلم اور اڑ گئی تو پھر اپنی اوقات پر آ جائے گا۔ دوسروں کے لئے بھی کام کرنے لگے گا۔"

ندیا نے گفتگو وہیں ختم کر دی تھی۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اتنی سنجیدہ بات چیت کے بعد وہ اعجاز حامد سے ملنے کی کوشش کرے گی تو فریدہ نہ تو چونکے گی اور نہ ہی اسے کوئی شک ہو گا۔

چوتھے دن اسٹوڈیو میں اس کی صرف ایک ہی فلم کی شوٹنگ تھی جو ہیرو کی بیماری کی وجہ سے منسوخ ہو گئی اور اس روز بھی وہ کسی اسٹوڈیو نہ جا سکی اس نے موقع غنیمت جانا اور سارا دن آرام کرنے میں گزارا۔

شام کو وہ اٹھی تو بے حد تازہ دم تھی۔ غسل کرنے کے بعد وہ ہلکا سا میک اپ کر رہی تھی کہ فریدہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور لہجے میں بڑی مٹھاس لئے بولی۔ "سیٹھ اقبال تم سے ملنے آئے ہیں۔"

ندیا غائبانہ طور پر سیٹھ اقبال سے واقف تھی۔ باتوں باتوں میں بارہا اس کا تذکرہ آ چکا تھا۔ بہت دولت مند آدمی تھا' کئی کارخانوں کا مالک تھا اور ان دنوں شہر میں ایک فور اسٹار ہوٹل تعمیر کرا رہا تھا۔

"کیوں ... ؟ مجھ سے ملنے کیوں آئے ہیں ؟ کیا وہ بھی کوئی فلم بنا رہے ہیں ؟" ندیا نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں فریدہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں' وہ فلم کے جھنجٹ میں پڑنے والے آدمی نہیں ہیں۔" فریدہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں' یا پھر شاید ہچکچاہٹ کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ "وہ تو

تمہارے بہت بڑے پرستار ہیں' کہہ رہے تھے اگر ندیا مہینے میں تین چار مرتبہ ہمارے گھر آ جایا کریں تو کیا حرج ہے ؟ بہت بڑی رقم ماہانہ دینے کی بات کر رہے تھے ؟"

ندیا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے فریدہ کو دیکھنے لگی۔ اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

☆

فریدہ کو گویا اس کی حیرت پر حیرانی تھی۔ وہ تعجب سے ندیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آخر اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟ تم تو کچھ اس طرح میری طرف دیکھ رہی ہو جیسے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس قسم کی بات کی ہے یا تمہارے لئے یہ کوئی نیا قصہ ہے۔''

ندیا گویا کسی جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''نہیں... یہ بات نئی تو نہیں ہے' اب تو ہم اس میدان کے خاصے پرانے کھلاڑی ہو چکے ہیں' پھر بھی میرا خیال تھا کہ آپ اس کھیل کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی معیار برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سے پہلے آپ نے جس سیٹھ کی بھی سفارش کی وہ ادھیڑ عمری کی سرحدوں سے پیچھے پیچھے ہی تھا۔ شکل صورت کا بھی برا نہیں تھا... تھوڑا بہت پڑھا لکھا اور باذوق بھی لگتا تھا۔''

''وہ تو اتفاق تھا کہ ہمیں ایسے لوگ ملتے رہے۔'' فریدہ دھیمے لہجے میں بولی۔

ندیا گویا اپنی دھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''سیٹھ اقبال تو ادھیڑ عمری کی حد بھی پھلانگ چکا ہے... سنا ہے اس کی بیویاں بھی دو ہیں ... اور ... اور آپ نے شکل دیکھی ہے اس کی ؟ اللہ معاف کرے... شکل صورت اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ ہمیں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہئے لیکن پھر بھی .... آپ کو کچھ تو سوچنا چاہئے تھا۔''

''کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔'' فریدہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں نے تمہاری اتنی تربیت کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانویت ابھی تک تمہارے دماغ

سے پوری طرح نہیں نکلی۔ اری بنو ! ہماری لائن میں یہ چیزیں کب دیکھی جاتی ہیں ؟ ہماری لائن میں جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں وہ بینک بیلنس، جائیداد، [illegible] وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آدمی زیادہ چالاک تو نہیں ؟ کہیں موقع پا کر ہمارے ہی کان تو نہیں کتر لے گا؟ آدمی جتنا زیادہ بے وقوف ہو' ہمارے لئے وہ اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ یہ شکل ... عمر... تعلیم... ذوق... یہ بھلا کوئی ہمارے دیکھنے کی چیزیں ہیں ؟ ہمیں کیا اس نگوڑ مارے کو فلم میں ہیرو لینا ہے جو اس کی شکل دیکھیں یا کاروبار میں پارٹنر بنانا ہے جو اس کی تعلیم پر غور کریں یا پھر ہم اس سے کوئی لمبا رشتہ جوڑنے جا رہے ہیں جو اس قسم کی دوسری خصوصیات پر غور کریں ؟''

ندیا خاموش تھی لیکن بدستور ناگواری سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فریدہ نے گویا محسوس کیا کہ وہ کچھ قائل ہو رہی تھی۔ وہ اور بھی زیادہ شیریں لہجے میں سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ''بلکہ میں تمہیں تجربے کی بات بتاؤں ... اس عمر اور اس شکل و صورت کے لوگ زیادہ اچھا شکار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بے چارے زیادہ فرماں بردار رہتے ہیں۔ زیادہ ناز اٹھاتے ہیں۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ سیٹھ اقبال کتنا دولت مند آدمی ہے تو تمہاری آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی۔ تمہیں اس کی اصل شکل نظر آنا بند ہو جائے گی۔ تم اس کی تعلیم' ذوق اور ایسی تمام دوسری فضول خصوصیات کے بارے میں سوچنا بھول جاؤ گی۔''

ندیا کہنا چاہتی تھی کہ یہی تو وہ فن تھا جو وہ ابھی تک نہیں سیکھ سکی تھی لیکن بس طوعاً'' و کرہاً'' فریدہ کی ہدایت پر وقتاً'' فوقتاً'' عمل کرتی رہتی تھی۔ اس کا جسم فریدہ کی دنیا میں تھا لیکن اس کی روح کہیں اور بھٹک رہی تھی۔ اس روح کو وہ ابھی تک فریدہ کی دنیا میں نہیں بسا سکی تھی۔

فریدہ کے لہجے میں کچھ اور مٹھاس آ گئی : ''تم تو پتا نہیں کس دنیا میں رہتی ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ ہیروئن تو سیٹھ اقبال جیسی آسامیاں تلاش کرتی ہیں۔ جن دنوں کوئی ہیروئن کسی مخصوص فرد سے وابستہ نہیں ہوتی' ان دنوں وہ خود سیٹھ اقبال کے گرد

منڈلاتی رہتی ہے۔ اسے اپنے ہاں پارٹیوں وغیرہ کے بہانے مدعو کرتی رہتی ہے۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ وہ خود چل کر تمہیں مدعو کرنے آیا ہے اور سراپا اشتیاق بنا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ تم سے ملنے کے تصور سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔"

پھر وہ گویا خود بھی قدرے متعجب ہوتے ہوئے بولی۔ "معلوم نہیں وہ کیوں اتنا ریشہ خطمی ہوا جا رہا ہے حالانکہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ قریب قریب سبھی ہیروئنوں سے کسی نہ کسی دور میں کچھ نہ کچھ عرصے کے لئے اس کے مراسم رہ چکے ہیں' ایک تم ہی بچی تھیں۔"

"اور اب وہ یہ آخری قلعہ بھی فتح کرلینا چاہتا ہے۔" ندیا بات کاٹتے ہوئے تلخی سے بولی۔

"ہٹ پگلی! اس طرح نہیں سوچتے۔" فریدہ نے لاڈ سے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "خوش قسمتی خود چل کر تمہارے دروازے تک آئی ہے۔ تمہیں لپک کر دیکھنا چاہئے کہ اس کے دامن میں تمہارے لیے کون کون سے تحفے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آج کل بھی پشتو فلموں کی ایک ابھرتی ہوئی خوش شکل ہیروئن اس کے گرد منڈلا رہی ہے۔"

"کاش وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوتی!" ندیا نے استہزائیہ سے انداز میں زیر لب کہا جسے فریدہ نہیں سن سکی۔ وہ اس وقت خوش کن خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

ندیا کو ان خیالات کی نوعیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کے قائل ہونے کی امید پر ہی فریدہ اسے اتنے پیار اور ملائمت سے سمجھا رہی تھی۔ اگر اسے یقین ہو جاتا کہ ندیا سمجھائے سے نہیں سمجھے گی اور آخرکار اس کی تجویز پر سر تسلیم خم نہیں کرے گی تو اس کا رویہ قطعی بدل جائے گا۔ اس کی زبان سے زہر میں بجھے الفاظ نکلنے لگیں گے اور اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں گی۔ وہ ان نادیدہ بندشوں

کو کسنے کے لیے تیزی سے حرکت میں آ جائے گی۔ جنہوں نے ہر طرف سے ندیا کو گرفت میں لیا ہوا تھا۔ جن کی وجہ سے ندیا ہمیشہ اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتی تھی۔

"ٹھیک ہے! میں اس سے مل تو لیتی ہوں ... لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس قسم کے کام مجھے پہلے بھی اچھے نہیں لگتے تھے' اب بھی نہیں لگتے جن لوگوں سے آپ مجھے ملوانے کے لئے بڑے ذوق و شوق سے اصرار کرتی ہیں' وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے لیکن میں ... بس بادل نخواستہ مل لیتی ہوں' میں اب ان چکروں سے تھکتی جا رہی ہوں۔"

"ارے... ابھی سے...؟" فریدہ نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔ "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ تمہارے مقام پر پہنچ جانے والی اداکارئیں تو بڑھاپے تک اپنی شہرت کا پھل کھاتی رہتی ہیں۔ چاہنے والوں کی قطار مختصر ضرور ہو جاتی ہے لیکن غائب کبھی نہیں ہونے پاتی' تھکن کا لفظ تو کبھی ان کی زبان پر نہیں آتا۔ تم اس بھری جوانی میں تھکنے کی بات کرتی ہو۔ بھلا کوئی چاہے جانے سے بھی تھکتا ہے؟"

"چاہے جانا؟" ندیا استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "واہ واہ فریدہ بیگم! یہ لوگ جن لذیذ خواہشوں کے پشتارے کندھوں پر لادے ہمارے دروازے پر آتے ہیں' آپ انہیں چاہت کہتی ہیں۔"

فریدہ گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ندیا! میری جان! اک عمر گزر گئی تمہیں سمجھاتے ہوئے کہ ہمیں حقائق کی اسی دنیا میں' انہی دنیادار لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ ہمیں انہی کے طور طریقوں کے مطابق چلنا ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہماری کیا بلکہ سب کی مجبوری ہے تم جس افسانوی دنیا میں رہتی ہو' وہ صرف تمہارے ذہن میں آباد ہے۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ ہم جا کر اس میں نہیں رہ سکتے۔ دنیا داروں کی محبت یہی ہے ہمیں اسی پر قناعت کرنا پڑے گی۔"

"میں تو ایک عرصے سے آپ کے فلسفہ حیات کے مطابق ہی جی رہی ہوں۔

اپنے فلسفہ حیات کا تو میں نے ایک مدت پہلے ہی گلا گھونٹ دیا تھا۔"

ندیا شکست خوردہ سے لہجے میں بولی۔ "پھر بھی اب ہمیں یہ طور طریقے چھوڑنے چاہئیں۔ ہم یہ کام تیسرے درجے کی اداکاراؤں کے لیے چھوڑ دیتے تو اچھا تھا۔ ہمارے پاس اب روپے پیسے کی کمی ہے؟"

"اری بنو! ہم تو اس دنیا کے سمندر میں ایک حقیر سے قطرے کی طرح ہیں' یہاں نہ جانے کیسے کیسے مگرمچھ پڑے ہیں۔ میرا مطلب ہے' اس دنیا میں نہ جانے کتنے لوگوں کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ ہم جیسے لوگوں خرید کر ایک ردی اخبار کی طرح کونے میں پھینک دیں۔ لیکن تم ان کے منہ سے بھی نہیں سنو گی کہ ان کے پاس اتنا روپیہ پیسہ ہوگیا ہے کہ اب انہیں مزید کی ضرورت نہیں۔ انہیں بھی تم مزید دولت کے پیچھے بھاگتے ہی دیکھو گی... اور یہ تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ دولت خود چل کر ان کے دروازے پر آئے اور وہ اسے لات مار کر واپس کردیں۔ وہ تو دونوں بازو والہانہ انداز میں پھیلائے' اس کے استقبال کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ ہماری بھلا کیا اوقات ہے کہ دولت کی دیوی کو دھکے دے کر واپس بھیجیں اور یہ کہیں کہ ہمارے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔" فریدہ بولتی چلی گئی تھی۔

ندیا طویل سانس لے کر رہ گئی۔ ایک بار پھر اسے احساس ہوا کہ وہ فریدہ کو دلیل سے اس کی مرضی کے خلاف کسی بات پر قائل نہیں کرسکتی تھی... اور طاقت اس کے پاس تھی نہیں... جسے استعمال کرکے وہ فرید سے اپنی بات منوا سکتی۔

"اچھا... آپ جا کر ذرا سیٹھ اقبال کو اپنی لچھے دار باتوں سے بہلائیں۔ میں تیار ہوکر آتی ہوں۔" اس نے گویا قطعی طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ فریدہ جیسے خوشی سے نہال ہوگئی۔ قربان جانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی: "...ہاں... تم آرام سے تیار ہوکر آؤ' آدھ پون گھنٹہ اطمینان سے میک اپ وغیرہ میں لگا دو۔ وہ تمہارا طلب گار ہے۔ اسے کم از کم اتنا انتظار کرانا تو تمہارا حق بنتا ہے... اور صرف یہی نہیں... تم ایک سپر اسٹار بھی ہو۔"

اس نے ندیا کی پیشانی چومی اور اپنی لالچی آنکھوں میں کتنے ہی خواب لئے کمرے سے رخصت ہوگئی۔ ندیا نے نہایت آہستگی اور بے دلی سے اپنا میک اپ مکمل کیا۔ کھڑے ہوکر ہر زاویئے سے تنقیدی انداز میں اپنا جائزہ لیا۔ اسے احساس تھا کہ ہر انسان کو اپنا آپ بھلا لگتا تھا' ہر شخص اپنی ذات میں کچھ نہ کچھ خود پرست تھا... لیکن وہ اس خود پرستی سے بچتے ہوئے اپنا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ شہرت اور اسکرین کے گلیمر کے علاوہ بھی بہرحال اس کی شخصیت میں ایک مقناطیسیت موجود تھی۔ دیکھنے والے یونہی تو اس کی طرف کھنچے نہیں آتے تھے۔ وہ بھرے بھرے بدن کی ایک سروقد عورت تھی جس کی چال قدم قدم پر فتنے جگاتی تھی... اور اس میں اس کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا۔

وہ تو اکثر اپنے آپ سے بیگانہ ہی رہتی تھی۔ وہ چلتی پھرتی تھی تو اکثر اپنے گردوپیش سے بے خبر ہوتی تھی۔ اس کی روح پر تو افسردگی اور اداسی کی خفیف سی دھند چھائی رہتی تھی۔ اس کی آنکھیں گویا شکستہ خوابوں کی کرچیوں سے مجروح سی رہتی تھیں مگر اپنی اس کیفیت کے باعث وہ دوسروں کو اور بھی پرکشش لگتی تھی۔ اس کے سراپا میں پراسراریت تھی۔

بالآخر' وہ اپنی اس شخصیت کو فریدہ کے دیئے ہوئے خول میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچی تو سیٹھ اقبال فریدہ سے بات کررہا تھا مگر اس کی نظریں اندرونی دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ندیا کو دیکھ کر تو وہ گویا بات کرنا بھول گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

ندیا نے اپنی تربیت کے بھولے بسرے سے نکتوں کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے جھک کر ایک ادائے خاص سے سیٹھ اقبال کو آداب کیا تو وہ گویا چونک کر کسی اور دنیا سے واپس آیا اور سنبھل کر اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آداب... آداب ندیا بیگم...!" وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ اس کے پیلے پیلے دانت ہونٹوں کے عقب سے جھانکنے لگے۔

ندیا کو حیرت ہوئی۔ وہ اتنا دولت مند آدمی تھا کیا اسے کوئی اچھی سی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کو بھی توفیق نہیں ہوتی تھی؟ پھر اسے خیال آیا کہ بعض لوگوں کا یہ میل کچیلا پن بہت ہی پختہ ہوتا تھا۔ دولت کے جادو اثر لوازمات بھی اسے دور کرنے میں ناکام رہتے تھے۔

وہ بہت قیمتی کپڑے کے سوٹ میں تھا جسے یقیناً کسی مہنگی دکان سے سلوایا گیا ہو گا لیکن وہ اس کی شخصیت کے بے ڈھنگے پن کو نہیں چھپا سکا تھا۔ وہ سانولے رنگ کا ایک بھاری بھرکم شخص تھا۔ اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی توند تھی تاہم ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس نے اپنے بالوں کی سفیدی کو ہیئر کلر سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دولت نے اسے کم از کم اتنی خود اعتمادی تو بخشی تھی کہ اس نے مصنوعی سہاروں کے ذریعے اپنی جاتی جوانی کا تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

ندیا اس کے برابر دوسرے صوفے پر جا بیٹھی اور مسکراتے ہوئے مخمور نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سیٹھ اقبال کو گویا سانس لینے میں دقت پیش آنے لگی۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔ ”آج پہلی بار آپ کو اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں ندیا بیگم! آپ کے ساتھ تو الٹا ہی معاملہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“ ندیا نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”اکثر ہیروئنیں اسکرین پر خوبصورت نظر آتی ہیں لیکن حقیقی زندگی میں انہیں دیکھ کر کافی مایوسی ہوتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے ایک جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ ”لیکن آج آپ کو اتنے قریب سے دیکھ کر اندازہ ہوا ہے کہ آپ میں جو بات ہے اسے تو کوئی کیمرہ، فلم کی اسکرین تک پہنچا ہی نہیں سکتا۔“

”لگتا ہے آپ عورتوں کو خوش کرنے والی گفتگو کے فن سے خوب واقف ہیں اقبال صاحب!“ ندیا نے ترچھی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”سب عورتوں کی بات چھوڑیئے ندیا جی! میں اگر عمر بھر بولتا رہوں اور آپ

میری کسی ایک بات سے بھی خوش ہو جائیں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“

اب وہ حسن و دلکشی کے پہلے حملے سے سنبھل چکا تھا اور پوری طرح ایک گھاگ شکاری نظر آ رہا تھا۔ اس کے لہجے سے شہد ٹپک رہا تھا اور آنکھوں سے خواہشیں جھانک رہی تھیں۔

اس کا لہجہ جھٹکے دار ضرور تھا مگر اردو اچھی خاصی بول لیتا تھا اور موقع محل کے اعتبار سے بات کرنا جانتا تھا ورنہ ندیا کو ایسے دولت مندوں سے بھی واسطہ پڑا تھا کہ وہ جو جملے بولتے تھے تو طبیعت مکدر ہو جاتی تھی لیکن لوگ ان کی باتوں پر سر دھنتے تھے۔ دولت ہر جگہ عجب معجزے دکھاتی تھی۔

کمرے میں ندیا کی آمد سے پہلے ہی سیٹھ اقبال کی خاطر مدارات وغیرہ کے مرحلے طے ہو چکے تھے۔ ندیا نپی تلی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اچھا... یہ محض دل بہلانے والی باتیں چھوڑیئے اور کام کی بات کیجیے۔ یہ بتایئے کیسے آنا ہوا؟ کس سلسلے میں زحمت کی؟“

”ندیا بیگم! یوں تو کام کی باتیں بھی ہزاروں ہیں۔“ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”ایک بار شروع ہو گئیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی لیکن یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا... بات آگے بڑھے گی تو بات سے بات نکلے گی۔ فی الحال تو ایک چھوٹی سی گزارش لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔“

”ارشاد...“ ندیا نے متانت سے کہا۔

سیٹھ اقبال نے اپنا بریف کیس گھٹنوں پر رکھ کر کھولا۔ اس میں ایک سنہری لفافہ تھا اور گویا بہت زیادہ عزت و احترام کے اظہار کے لیے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر، سر کو جھکاتے ہوئے اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ کے اس خادم نے مال پر ایک چھوٹا سا ہوٹل بنایا ہے۔ ہوٹل کیا ہے بس غریب خانہ ہے۔“ وہ عاجزی و انکساری کا نہ جانے کون سا ریکارڈ توڑنے پر تلا ہوا تھا۔

ندیا کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے فور اسٹار ہوٹل بنایا تھا اور مال پر، فور اسٹار ہوٹل بنانا

کوئی معمولی بات نہیں تھی مگر وہ اسے بھٹیار خانہ کہہ رہا تھا۔ خاکساری بھی بعض دولت مندوں کی ایک ادا ہوتی تھی۔ ندیا مسکرادی۔

سیٹھ اقبال نے بات جاری رکھی۔ "میں محض رسماً" اپنے ہوٹل کو بھٹیار خانہ نہیں کہہ رہا۔ وہ واقعی میری نظر میں بھٹیار خانہ ہے لیکن اگر اس کے افتتاح کے موقع پر آپ تشریف لے آئیں گی تو میری نظر میں وہ دنیا کا سب سے بڑا... سب سے اعلیٰ ہوٹل ہوجائے گا۔"

"تاریخ کیا ہے افتتاح کی؟" ندیا نے قدرے بے اعتنائی سے لفافہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

سیٹھ اقبال تاریخ بتاتے ہوئے بولا۔ "میں نے فریدہ بیگم سے تصدیق کرلی ہے۔ اس روز شام میں آپ کی کوئی شوٹنگ نہیں ہے۔ اس لئے کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔"

"اوہ... آپ تو پہلے ہی پکا بندوبست کئے بیٹھے ہیں۔" ندیا نے ایک نظر دعوت نامے کو اور پھر ترچھی نظر سے سیٹھ اقبال کو دیکھا۔ "آپ نے تو دعوت نامے میں "متوقع شرکا" میں میرا نام دے رکھا ہے۔"

"فریدہ بیگم سے پوچھ کر دیا تھا۔" سیٹھ اقبال فوراً صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا پھر اس کا لہجہ کچھ فخریہ سا ہوگیا۔ "ہم دراصل ہر مسئلے کی جڑ کو پکڑتے ہیں... شاخوں سے نہیں الجھتے۔ ہمیں معلوم ہے آپ کی جڑ کہاں ہے۔"

اس نے معنی خیز سی مسکراہٹ کے ساتھ فریدہ کی طرف دیکھا۔ فریدہ بڑے پرسکون انداز میں بیٹھی پان چبا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی جس سے ہرکوئی اپنی مرضی کا مفہوم اخذ کرسکتا تھا۔

ہاں... تم نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا ہے سیٹھ اقبال! ندیا نے افسردگی سے دل ہی دل میں سوچا۔ آخر تم ایک بڑے کاروباری آدمی ہو۔ تمہارا اندازہ کیسے غلط ہوسکتا ہے؟ اندازے تو مجھ جیسے افسانویت زدہ لوگوں کے غلط ہوتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ ہر جگہ غلط ہاتھ ڈالتے ہیں۔

کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں ہر شخص کاروباری تھا اور وہ اس دنیا کے لئے بالکل ناموزوں تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر کہاں جاتی۔

"ٹھیک ہے اقبال صاحب" یک لخت ہی اس کے لہجے میں اس کی ازلی تھکن در آئی۔ "جب آپ امی سے ساری بات کرہی چکے ہیں تو میں کیسے انکار کرسکتی ہوں؟ میں آجاؤں گی۔"

"آپ نے میرا مان بڑھایا ہے ندیا جی! آپ نے میری عزت رکھ لی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

شدت جذبات سے سیٹھ اقبال کی آواز مرتعش سی ہوگئی۔

اس نے ایک بار پھر بریف کیس کھولا۔ اس بار اس کے ہاتھ بریف کیس سے باہر آئے تو ان میں مخملیں ڈبہ تھا۔ ڈبہ بھی اس نے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر پہلے سے زیادہ انداز میں ندیا کی طرف بڑھایا۔

ندیا نے ڈبا نہیں تھاما۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ کیا چیز تھی اور اس کی طرف کیوں بڑھائی جا رہی تھی۔ فریدہ نے جب دیکھا کہ ندیا ہاتھ نہیں بڑھا رہی ہے تو اس نے خود اٹھ کر ڈبا سیٹھ اقبال کے ہاتھ سے لے لیا۔

اپنی جگہ پر واپس پہنچ کر اس نے ڈبا کھولا اور کمرے کا وہ گوشہ گویا جگمگا اٹھا۔ ڈبے میں جگمگ جگمگ کرتا ایک نیکلس موجود تھا۔ نیکلس کو دیکھ کر نیکلس سے زیادہ چمک دمک فریدہ کے چہرے پر آگئی۔

"آپ کے ذوق کی ہم نے بڑی تعریف سنی تھی اقبال صاحب!" فریدہ گویا نظروں ہی نظروں میں سیٹھ اقبال پر قربان ہوتے ہوئے بولی۔ "آج اپنی آنکھوں سے اس کا ثبوت بھی دیکھ لیا۔ کیا چیز چھانٹ کر لائے ہیں آپ... واہ...؟"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی۔" سیٹھ اقبال مصنوعی انکسار سے بولا۔ "یہ دھات اور پتھر کا ایک حقیر سا مجموعہ ہے لیکن ندیا بیگم اسے پسند کریں گی اور قبول کرلیں گی تو یہ

ہیروں اور سونے سے زیادہ قیمتی ہوجائے گا۔"

"کیوں نہیں... کیوں نہیں... ندیا کو تو یقیناً یہ بہت پسند آئے گا یہ تو خود کئی دن سے مجھ سے اسی قسم کا ایک نیکلس خریدنے کی باتیں کر رہی تھی۔"

اس نے ایک خاص نظر سے ندیا کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں ایک تنبیہہ پنہاں تھی۔

ندیا نے جلدی سے ایک مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے سیٹھ اقبال کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

فریدہ ایک بار پھر بغور نیکلس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "ڈیڑھ دو لاکھ کا تو ہوگا؟" وہ کسی بھی چیز کی قیمت جانے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

"دو لاکھ ساٹھ ہزار۔" سیٹھ اقبال نے ملائمت سے تصحیح کی۔ وہ بھی بہرحال بیوپاری تھا۔ کیسے گوارا کرسکتا تھا کہ اس کی چیز کی قیمت کم سمجھی جائے ایک لمحے کے توقف سے سیٹھ اقبال بولا۔

"یہ ندیا بیگم سے ہماری پہلی ملاقات کی یادگار ہے... انہوں نے افتتاح کے موقع پر آنے کی ہامی بھر کے میری جو عزت افزائی کی ہے' اس کے بعد مجھے یونہی اٹھ کر یہاں سے چلے جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"یہی وضع داریاں تو خاندانی لوگوں کی پہچان ہوتی ہیں اقبال صاحب!" فریدہ بیگم خوشامدانہ انداز میں مسکرائی۔ نیکلس کی قدر و قیمت کے بارے میں اس کا تبصرہ جاری رہا۔ "ویسے اتنا خوبصورت نیکلس دو لاکھ ساٹھ ہزار میں بھی سستا ہے۔"

"دو لاکھ ساٹھ ہزار کا صرف اس لئے ہے کہ اس کے تینوں بڑے ہیرے مصنوعی ہیں۔ اگر وہ اصلی ہوتے تو یہ دس لاکھ سے کم کا نہ ہوتا۔ میں دیانت دار بزنس مین ہوں۔ سچی بات بتائے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ نقلی ہیرے بھی اتنی عمدہ کوالٹی کے ہیں کہ جوہری کے سوا انہیں کوئی نہیں پہچان سکتا۔" سیٹھ اقبال مسکراتے ہوئے بولا۔

"تو پھر آپ کو مان لینا چاہئے کہ ہم بھی کسی جوہری سے کم نہیں۔" فریدہ

مسکراہٹ میں اس کا مخصوص شاطرانہ رنگ جھلک آیا۔

"آپ کے جوہری ہونے میں تو کسی احمق کو ہی کوئی شک ہوسکتا ہے فریدہ بیگم!" سیٹھ اقبال بولا۔

"ندیا بیگم جیسا ہیرا آپ کے پاس ہے... اور یہ ہیرا جب نا تراشیدہ حالت میں ہوگا تو آپ ہی نے اندازہ لگایا ہوگا کہ تراش کے بعد اس کی کیا صورت نکلے گی۔"

وہ دونوں مزید کچھ دیر ایک دوسرے کی چاپلوسی میں لگے رہے اور ندیا ایک بے روح سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے خاموش بیٹھی رہی۔ دو شاطر بیوپاری ایک دوسرے کو شیشے میں اتارنے میں لگے ہوئے تھے' ندیا کو ان کی منافقانہ گفتگو سے سخت کوفت ہو رہی تھی لیکن وہ کوفت کا اظہار نہیں کرسکتی تھی۔

وہ نیکلس کے بارے میں سوچنے لگی جس کا ڈبا فریدہ نے بند کرکے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ سیٹھ اقبال اگر پہلی ملاقات پر ڈھائی لاکھ سے اوپر کا نیکلس "تحفتاً" اس کی خدمت میں پیش کرسکتا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اسے دولت کے ترازو میں تول کر خریدنے کے لئے تیار بیٹھا تھا اور دولت کے پجاری جب کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے دل کھول کر رقم خرچ کرنے کے لے تیار ہوتے تھے تو اس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ ان کے دل میں اس کی طلب کی پیاس تھی۔ ندیا کا ذہن سوچ کے صحرا میں بھٹکتا ہوا بہت دور جا نکلا۔

☆

سیٹھ اقبال کا ہوٹل فوراسٹار ہوٹلوں کے ایک عالمی زنجیرے سے منسلک تھا اور باہر سے ہی اچھا خاصا شاندار دکھائی دے رہا تھا۔ ندیا کو معلوم ہوچکا تھا کہ اس ہوٹل میں سیٹھ اقبال کا کوئی شراکت دار نہیں تھا۔ اس میں زیادہ تر سرمایہ اس کا اپنا تھا یا پھر کچھ بینک کا قرضہ شامل تھا۔ اس کے دوسرے بھی کئی کاروبار تھے' دو تین کارخانے تھے' مہنگی جائیدادوں کی خرید و فروخت کا کام تھا' تعمیراتی کمپنی تھی۔ ان کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کچھ تھا۔ اس سے پہلے اتنا زیادہ دولت مند شخص ندیا کی طرف متوجہ نہیں ہوا

تھا۔

ندیا کی گاڑی جب ہوٹل کے قریب جا کر رکی تو اسے سڑک کے کنارے گاڑیو
کی قطار نظر آئی۔ اندر ڈرائیو وے اور پارکنگ لاٹ بھی گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی
ایک وفاقی وزیر کو ہوٹل کا باضابطہ افتتاح کرنا تھا' وہ بھی پہنچ چکے تھے اس لئے کچھ
سرکاری گاڑیاں اور پولیس وغیرہ کی مستعد ٹولیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

تین خواتین اور تین حضرات پر مشتمل ایک باقاعدہ استقبالیہ کمیٹی صدر دروازے
پر موجود تھی۔ انہوں نے فریدہ اور ندیا کو ہار پہنائے۔ ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور
کیں۔ کیمروں کی فلیش لائٹس کے جھماکوں سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

اندر پہنچ کر ندیا کو اندازہ ہوا کہ سیٹھ اقبال نے ہر شعبہ زندگی کے ممتاز افراد کی
اچھی خاصی تعداد جمع کرلی تھی۔ فلم اور ٹی وی کے بہت سے جانے پہچانے چہرے تھے۔
سماجی اور سیاسی شخصیات تھیں۔ جانی انجانی "بیگمات" تھیں۔ معطر ماحول میں کہیں
جگمگاتے چہرے تھے تو کہیں قہقہوں کی کھنک' کہیں شرمیلی سی ہنسی کا ترنم تھا تو کہیں
بے باک جملوں کے تبادلے۔

اخباری فوٹو گرافرز لوگوں کے درمیان چکراتے پھر رہے تھے۔ کبھی کہیں فلیش
لائٹ کا جھماکا ہوتا تو کبھی کسی اور سمت میں کسی سے پوز بنانے کی فرمائش کی جاتی۔ ندیا
جب وہاں پہنچی تو ایک لمحے کے لئے گویا چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ہر آنکھ اس کی
طرف اٹھ گئی۔ آج وہ آئی بھی تھی بڑے اہتمام سے ...ورنہ عام طور پر وہ تقریبات
میں جانے کے لئے زیادہ اہتمام نہیں کرتی تھی۔

زرق برق ساری میں اس کے خدوخال قیامت ڈھا رہے تھے۔ بڑھتی عمر' روز
روز کے گہرے میک اپ' تیز روشنیوں اور کام کی زیادتی نے اس کے روپ کو گہن
لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں اب بھی لوگوں کو
چونکاتی تھیں' دھڑکنوں کو بہکاتی تھیں۔
پختگی کی عمر کو پہنچ کر اس کا سراپا خاص طور پر ایک چلتی پھرتی سی قیامت میں ڈھل گیا

تھا۔ اس وقت وہ سلیقے کے میک اپ بہت عمدہ فال کر نرم و ملائم ساری' نہایت
خوبصورت ہیئر اسٹائل' ہلکی پھلکی لیکن بیش قیمت جیولری اور ایک مخمور سی مسکراہٹ
کے ساتھ لوگوں کے درمیان سے گزری تو بہت سی سانسیں گویا کئی لمحوں کے لئے
سینوں ہی میں مقید رہ گئیں۔ اس کی چال میں کسی ملکہ کی سی تمکنت اور ٹھہراؤ تھا۔

اپنے عقب میں سحر انگیز خوشبو کا ایک جھونکا چھوڑتی ہوئی جب وہ سیٹھ اقبال
تک پہنچی تو وہ اسے سر تاپا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مبہوت رہ گیا' پھر اس کی باچھیں
کھل گئیں۔ معلوم ہوتا تھا ہونٹوں کے گوشے کانوں تک پھیل جائیں گے۔ فلیش
لائٹس کا رخ ایک بار پھر ندیا کی طرف ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر گویا ستارے ٹوٹ
ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

ہوٹل کا رسمی افتتاح ہو چکا تھا اور سیٹھ اقبال اس وقت بھاری بھرکم سے چند
افراد کی ایک ٹولی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ سب کے سب پر اشتیاق نظروں سے ندیا کو
تکنے لگے تھے۔

سیٹھ اقبال بہت ہی خاکسارانہ لہجے میں بولا۔ "ندیا بیگم! آپ کا یہ بڑا ہی
کرم... بڑی ہی عزت افزائی ہے کہ آپ تشریف لائیں۔"

فلمی دنیا میں' عمر سے قطع نظر' جب بھی کسی خاتون کو بہت احترام سے مخاطب
کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کے نام کے ساتھ "بیگم" یا "میڈم" لگا دیا جاتا ہے۔ سیٹھ
اقبال فریدہ کی طرف دیکھ کر گردن خم دیتے ہوئے بولا۔ "آپ کا بھی بہت شکریہ فریدہ
بیگم! آپ نے وعدہ پورا کر دکھایا.... آپ واقعی ندیا بیگم کو لے آئیں' میرے ہوٹل میں
چار چاند لگ گئے ہیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میں اس وقت کتنا خوش ہوں۔"

اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی
ڈورے اور اس کے لہجے کی لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کتنا خوش تھا اور وہ یقیناً ہوٹل
کے افتتاح سے پہلے ہی اس خوشی کا جشن بھی منا آیا تھا۔

وہ جس ٹولی کے ساتھ کھڑا تھا اس میں اسی جیسے بھاری ڈیل ڈول کے ایک

گورے چٹے ادھیڑ عمر صاحب بھی تھے۔ وہ نہایت نفیس قسم کی شلوار قمیض اور واسکٹ میں تھے۔ ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور وہ سیٹھ اقبال سے بھی زیادہ دلچسپی آمیز نظروں سے ندیا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ندیا کو ان کی صورت کچھ مانوس سی لگ رہی تھی۔

سیٹھ اقبال نہایت احترام سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ندیا سے مخاطب ہوا: "یہ ہمارے منسٹر صاحب ہیں... احمد یار صاحب... بہت بڑے زمیندار ہیں۔" پھر اس نے ان کا محکمہ وغیرہ بتایا اور نہایت خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "یہ ہوٹل بس ان کی مہربانی سے بنا ہے' یہ ساتھ نہ دیتے تو اس کا بننا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے بڑے پرانے کرم فرما ہیں۔ اس وقت سے ہم پر مہربانیاں فرماتے آرہے ہیں جب یہ سیاست میں نہیں آئے تھے۔" اس کا گویا بس نہیں چل رہا تھا کہ احمد یار صاحب کے قدموں میں لوٹنے لگے۔

احمد یار صاحب مشفقانہ اور مربیانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے ندیا سے مخاطب ہوئے۔ "یہ بڑا بیبا بندہ ہے جی... یہ بھی زندگی میں بڑے عجیب عجیب موقعوں پر' بڑے عجیب عجیب طریقوں سے ہمارے کام آیا ہے۔ اس کا تو ہم کو خیال رکھنا ہی تھا لیکن ہم ویسے بھی ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کو بھی کبھی کوئی مسئلہ ہو تو اپنے اس خادم کو یاد فرمائیے گا۔"

انہوں نے اپنے قریب مودب کھڑے ہوئے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً ایک چرمی بیگ سے احمد یار صاحب کا کارڈ نکال کر ندیا کی طرف بڑھایا۔

ندیا نے گویا بادل نخواستہ کارڈ تھام لیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کہے۔ وہ صرف شکریہ ادا کرکے رہ گئی فریدہ فوراً باچھیں کھلاتے ہوئے احمد یار سے مخاطب ہوئی۔ "آپ تو اکثر اسلام آباد ہی میں رہتے ہوں گے لیکن جب کبھی تشریف لائیں اور آپ کے پاس وقت ہو تو غریب خانے پر ضرور تشریف لائیے۔ ہم غریبوں کی بھی عزت افزائی ہوگی۔ ہم بھی کسی سے کہہ سکیں گے کہ منسٹر صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے تھے۔"

منسٹر صاحب نے ایک گونجیلا سا قہقہہ لگایا: "ارے... کیسی باتیں کررہی ہیں آپ... ہم تو خادم ہیں آپ کے' بلکہ ہم تو پوری قوم کے خادم ہیں' سر کے بل چل کر آئیں گے آپ کے ہاں۔" ان کی نظریں مسلسل ندیا کے سراپا کا طواف کررہی تھیں۔

تقریب کا انتظام بینکوئٹ ہال میں کیا گیا تھا۔ سیٹھ مہمانوں کو وہیں بٹھانے کے لئے لے گیا اور معذرت کے ساتھ چند منٹ میں واپس آنے کا وعدہ کرکے دوبارہ منسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

ہال میں اچھے اور منتخب لوگوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جن کا تعلق فلم یا ٹیلی ویژن سے نہیں تھا لیکن ندیا مختلف حوالوں سے ان کی تصویریں اخبارات میں دیکھتی رہتی تھی۔

ہال میں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کی صورتیں ندیا کے لیے قطعی اجنبی تھیں لیکن ان کے حلئے' رکھ رکھاؤ اور حرکات و سکنات سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ شہر کے امراء اور معززین تھے۔ اہم شخصیات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ایک خاص قسم کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ نخوت ان کے چہروں پر لکھی تھی۔

ایسے لوگوں کی موجودگی میں ندیا کو فریدہ کی رفاقت دل ہی دل میں کچھ بوجھ سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ بچپن میں وہ عورت اسے بڑی فیشن ایبل' ماڈرن اور صاف ستھری لگتی تھی لیکن اب اس کے وجود پر جہالت کے سائے رینگتے محسوس ہوتے تھے۔ اس احساس سے اس کا دل ڈوبتا رہتا تھا کہ شاید اس عورت کا چہرہ اس کے خاندانی پس منظر کا عکس لئے ہوئے تھا۔ شاید لوگ اس کے خدوخال پر لکھی ہوئی کہانیاں سہولت سے پڑھ رہے ہوں گے۔

ان سب باتوں کے باوجود ندیا کو یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ وہ فریدہ کے ساتھ چلتی پھرتی یا کہیں بیٹھتی تھی تو اسی کی محکوم نظر آتی تھی۔ اس کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی معلوم ہوتی تھی۔ شاید دوسرے لوگ بھی اس بات کو محسوس کرلیتے ہوں۔ یہ

احساس ندیا کے لیے زیادہ تکلیف دہ تھا' اور دن بہ دن یہ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

مگر فریدہ کو اپنے بارے میں ذرا بھی احساس کمتری نہیں تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے بھاری بھرکم پرس اور بھاری بھرکم وجود کو سنبھالے ایک مخملیں نشست پر بیٹھی تھی اور جگالی کرنے کے سے انداز میں پان چباتے ہوئے سر گھما گھما کر چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک ایک شکل کو غور سے دیکھ رہی تھی گویا ذہن نشین کر رہی ہو کہ اس تقریب میں کون کون آیا تھا۔ تقریبات میں یا دوسری پر ہجوم جگہوں پر اس کا یہی انداز ہوتا تھا۔

سیٹھ اقبال کچھ دیر بعد لوٹ آیا۔ اس کی باچھیں اب بھی کھلی جا رہی تھیں۔ ندیا کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ بولا: "چلے گئے منسٹر صاحب۔"

"اتنی جلدی؟" فریدہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

"جلدی کہاں ... وہ بے چارے تو میری خاطر ڈیڑھ گھنٹہ یہاں رہے' وہ تو صرف افتتاح کے لئے آئے تھے۔ آج تو ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ وہ تو اسلام آباد سے سیدھے کراچی جا رہے تھے' وہاں انہیں ایک سرکاری تقریب میں شرکت کرنی ہے' میری خاطر بریک جرنی کر کے یہاں اترے۔"

پھر اس نے ندیا کی طرف جھکتے ہوئے قدرے رازدارانہ انداز میں اسے گویا خوشخبری سنائی۔ "مبارک ہو' منسٹر صاحب بھی آپ کو دیکھتے ہی آپ کے پروانوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے تھے... بھئی یہ تو بڑے غضب کی خاتون ہیں۔ ہماری بھی ان سے دوستی کراؤ' معلوم ہے میں نے کیا جواب دیا؟"

وہ گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے کھی کھی کرنے لگا۔ کھی کھی کا سلسلہ تھما تو بولا۔ "میں نے ان سے کہا بھئی پہلے ہماری دوستی تو ہو جانے دو۔ پھر آپ کی دوستی کے بارے میں بھی سوچیں گے۔"

وہ گویا اپنی بذلہ سنجی سے خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے ایک بار پھر زور سے ہنسا۔ ندیا نہایت سنجیدگی سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹھہرے لہجے

میں بولی۔ "لیکن میں تو ان سے دوستی کرنا نہیں چاہتی۔"

فریدہ نے اسے کہنی مارتے ہوئے ہلکی سی ڈانٹ پلائی: "تم خاموش رہو بھئی! تمہیں ان باتوں کا کچھ پتا نہیں۔"

پھر وہ پر اشتیاق انداز میں سیٹھ اقبال سے مخاطب ہوئی: "اور کیا کہہ رہے تھے منسٹر صاحب؟" سیٹھ اقبال کی طرح اس کی باچھیں بھی کھلی جا رہی تھیں۔

"بس انہیں جو کچھ کہنا تھا' ایک ہی جملے میں کہہ گئے۔ اس قسم کے لوگ پہلی ملاقات میں بھلا اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ اب تو آپ کو کچھ کہنے سننے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ کسی بھی دن آپ کے گھر پر فون کی گھنٹی بجے گی اور دوسری طرف منسٹر صاحب بول رہے ہوں گے۔"

فریدہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ دل ہی دل میں وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک پیدا ہو گئی تھی جو شاید بلی کی آنکھوں میں' بالائی سے بھرا برتن دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اس دوران وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی ندیا سے آٹوگراف لینے کے لیے چلا آتا تھا اور سیٹھ اقبال کو اپنی گفتگو روکنا پڑتی تھی۔ بالآخر آٹوگراف لینے والوں کی آمد کا سلسلہ رک گیا۔

تب سیٹھ اقبال ایک بار پھر اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئی والہانہ لہجے میں بولا۔ "ویسے آج آپ واقعی غضب ڈھا رہی ہیں' کس کس کو قتل کرنے کا ارادہ ہے؟"

"آپ کے سوا سب کو ..." ندیا افسردگی کے دھندلکے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟ ہم سے یہ دشمنی کیوں؟" سیٹھ اقبال نے ریشہ خطمی ہوتے ہوئے کہا "ہم تو سب سے پہلے آپ کی نگاہ و ناز سے قتل ہونے کے امیدوار ہیں۔"

"امید پہ دنیا قائم ہے۔ آپ بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ امیدوار رہیں۔" ندیا نے دھیمی آواز میں مشورہ دیا۔

اس دوران ہال میں ہلکا پھلکا سا ورائٹی پروگرام شروع ہو گیا جس میں اسٹیج اور ٹی وی کے کچھ فن کاروں نے خاکے اور کچھ نے گانے سنائے۔

ورائٹی پروگرام مختصر ہی تھا۔ شاید اسی لئے اسے کھانے سے پہلے رکھا گیا تھا۔ پروگرام ختم ہوا تو کھانا' بینکوئٹ ہال میں میزوں پر ہی پیش کیا گیا۔ کھانے کے بعد سیٹھ اقبال' سراپا خاکساری بنا ندیا تک آ پہنچا اور جھک کر بولا۔

"اگر پسند فرمائیں تو اپنے اس پرستار کو بھی چند لمحے عنایت ہوں۔"

"جی؟" ندیا چونک کر بولی۔

"میرا مطلب ہے' آپ کچھ دیر میرے کمرے کو بھی رونق بخشیں۔" سیٹھ اقبال کے لہجے میں لجاجت تھی۔

ندیا جانا نہ چاہتی تھی لیکن اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں فریدہ سے پیغام ملا کہ اسے سیٹھ اقبال کی فرمائش رد نہیں کرنی چاہئے۔ وہ مجبوراً" اٹھی اور وقار و تمکنت کے ساتھ اپنی ساری کا پلو سنبھالتی ہوئی سیٹھ اقبال کے ساتھ چلی گئی۔ بہت سی رشک بھری نظریں ان دونوں کی جانب اٹھ گئیں۔

سیٹھ اقبال کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچے۔ کمرے کے دروازے پر متعین باوردی محافظ نے سیٹھ اقبال کو دیکھ کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن سیٹھ اقبال نے اسے اشارے سے ایک طرف کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اپنی کمرے کا بھاری دروازہ خود کھول دیا۔ پھر اس نے تقریباً" دوہرے ہو کر ندیا سے' اندر تشریف لے جانے کی درخواست کی۔

ندیا زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

کمرہ شاہانہ انداز کا تھا۔ بڑی سی چمکیلی میز کے عقب میں نہایت آرام دہ گھومنے والی کرسی جھانک رہی تھی۔ فرش ہی نہیں' دیواریں بھی قالین سے مزین تھیں۔ ایک جانب گداز صوفے دھرے ہوئے تھے۔ دیواروں پر دنیا کے مشہور مصوروں کے فن پاروں کی غالباً" نقلیں لگی ہوئی تھیں۔ ندیا انہیں دیکھنے لگی۔

"تشریف رکھئے!"

ندیا' سیٹھ اقبال کی آواز سن کر چونک گئی۔ سیٹھ اقبال اس سے بیٹھنے کی درخواست کر رہا تھا وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کہیے کیا خاطر کی جائے؟"

"کچھ نہیں' ابھی تو کھانا کھایا ہے۔" ندیا نے بظاہر خوش اخلاقی سے کہا۔

"پھر بھی! جو کچھ آپ پینا چاہیں' حاضر کر دیا جائے گا۔"

"اسے چھوڑیں۔" ندیا کے ذہن میں سوچوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر جیسے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔

وہ دھیمے لہجے میں بولی: "یہ بتائیے کہ آپ میرے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں؟"

"بہت کچھ ... بہت کچھ بلکہ یوں کہیے کہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔"

سیٹھ اقبال کی کھلی ہوئی باچھیں کچھ اور کھل گئیں۔ "صرف ماہانہ کی بات نہیں ہے... اگر آپ پسند کریں گی تو آپ کی موجودہ کوٹھی سے زیادہ اچھی کوئی کوٹھی... آپ کی موجودہ گاڑی سے زیادہ اچھی کوئی گاڑی بھی آپ کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔"

"اتنا خرچہ کریں گے آپ؟" ندیا نے آنکھیں پھیلائیں۔

"ہم فقیروں کا ہاتھ تھامیں گی تو نہ جانے کیا کچھ آپ کے قدموں میں ڈھیر ہو گا... لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ آپ کے شایان شان تو میں کچھ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ آپ کی ایک نظر کرم کے سامنے تو سب کچھ ہیچ ہے۔ آپ تو ایک دیوی ہیں... میرے خوابوں کی شہزادی ہیں۔"

"بس ... بس ..." ندیا بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی: "اتنی لفاظی نہ کیجئے کہ کل کو ان الفاظ کی بازگشت سن کر خود کو شرم آنے لگے۔"

"آپ میرے الفاظ کو کھوکھلا اور میرے جذبات کو جھوٹا نہ سمجھیں۔" سیٹھ اقبال زور دے کر بولا۔ اس کے چہرے پر سرخی آ گئی: "آپ شاید میرے خلوص کا

اندازہ نہیں لگا پا رہی ہیں۔"

"اقبال صاحب ..." ندیا کے لہجے میں یکدم ہی بے پناہ ٹھہراؤ اور چہرے پر گہری سنجیدگی آ گئی۔ وہ اس وقت زندگی کا ایک اہم فیصلہ کرنے جا رہی تھی۔ اقبال کی منتظر نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

ندیا نے تھوک نگل کر سلسلہ کلام جوڑا۔ "جب آپ میرے لئے اتنا خرچ بھی کر سکتے ہیں' آپ جذبات کی تمام تر شدتوں کے ساتھ میرے طلب گار بھی ہیں' آپ کو میرے ساتھ مخلص ہونے کا دعوی بھی ہے ... تو ... تو پھر آپ میرے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟؟"

"شادی...؟" سیٹھ اقبال کو جیسے جھٹکا لگا۔ کھلی ہوئی باچھیں فوراً اصلی احالت پر آ گئیں اور دانت واپس ہونٹوں کے عقب میں چھپ گئے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ "مگر میں تو پہلے ہی شادی شدہ ہوں ... بلکہ کچھ زیادہ ہی شادی شدہ ہوں۔ دو بیویاں ہیں میری ... بڑے بڑے بچے ہیں میرے ..."

"تو پھر آپ اپنی دو بیویوں پر قناعت کیوں نہیں کرتے؟" ندیا کے لہجے میں قدرے رکھائی آ گئی۔

"بس ... آپ کو تو معلوم ہے... ایسا تو ہوتا ہی ہے .." سیٹھ اقبال ہکلانے لگا۔ "بیویوں سے آدمی کی بنتی ہی کہاں ہے۔" یکدم ہی وہ گویا چوکڑی بھول گیا تھا' مگر کھسیانے سے انداز میں ہنس کر پر اعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جب میں آپ کو اتنی پسند ہوں تو مجھ سے شاید آپ کی بن جائے۔ آپ ایسا کیجئے کہ تیسری شادی کر لیجئے۔ میں آپ کی تیسری بیوی بننے کے لیے بھی تیار ہوں۔" ندیا گہری سنجیدگی سے بولی۔ "آپ دولت مند آدمی ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ نے اپنی دونوں بیویوں کو بہت اچھے طریقے سے رکھا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ تیسری بیوی کو بھی اس کے شایان شان طریقے سے رکھ سکتے ہیں۔"

"اس میں بڑے مسئلے ہو جاتے ہیں' جائیداد اور وراثت کے لیے جھگڑے شروع

ہو جاتے ہیں' ساری زندگی عجیب سی رسا کشی میں گزر جاتی ہے۔ میرے دو ایک دستوں نے ایسا کیا تھا' ان کی مثالیں میرے سامنے ہیں' کچھ وقت تو اچھا گزرتا ہے' پھر پریشانی ہی پریشانی رہتی ہے۔ بڑے مسائل ہوتے ہیں۔" سیٹھ اقبال نہ جانے اس کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا یا خود کو؟

"گویا آپ کو مسائل سے پاک عورت کی ضرورت ہے؟" ندیا کے لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

سیٹھ اقبال نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس عجیب سے انداز میں ہنس کر رہ گیا' وہ اب کچھ گھبرا رہا تھا' کچھ کترا رہا تھا' نظریں چرا رہا تھا۔

ندیا گہری سنجیدگی سے بولی۔ "جس طرح کا معاملہ آپ چاہتے ہیں' اس کے لئے ھ سے ذرا نچلی سطح پر کہیں رجوع کیجئے۔ شاید آپ کی شرائط کے مطابق سودا طے پا ہائے۔ انسانوں کی کلیئرنس سیل تو ہر وقت کسی نہ کسی جگہ لگی ہی رہتی ہے۔"

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل ئی۔ سیٹھ اقبال گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "سنئے تو' ارے سنئے تو آپ تو خفا ہو ئیں۔" کہتا رہ گیا۔

بینکوئٹ ہال میں واپس آکر ندیا نے ہموار لہجے میں فریدہ کو مخاطب کیا۔ "آیئے ا چلیں۔"

فریدہ نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا مگر خاموشی سے اٹھ کر اس کے اتھ ہو لی۔ وہ اس کے موڈ کو خوب سمجھتی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی افتاد ع کے خلاف کوئی بات ہو گئی تھی یا کسی اور وجہ سے اس کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ جب وہ ا موڈ میں ہوتی تھی تو فریدہ اس سے نہیں الجھتی تھی۔ جو کچھ سمجھانا ہوتا تھا' بعد میں جھاتی تھی۔ طوفان باد و باراں گزر جانے کے بعد جب مطلع صاف ہوتا تھا تو پھر وہ اپنا ر شروع کرتی تھی۔

راستے میں ندیا کا ذہن کسی کھنڈر کی طرح ویران تھا' سائیں سائیں کر رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دل ہی دل میں وہ ہنس رہی تھی یا رو رہی تھی؟

اس رات وہ بستر پر لیٹی دیر تک چھت پر نظر جمائے جاگتی رہی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ شاید یہ رکے ہوئے آنسوؤں کی تپش تھی۔ ایک سوال اس کے ذہن کو مسلسل ڈس رہا تھا۔

کیا اتنی بڑی اداکارہ بن کر' اتنی مقبولیت دامن میں سمیٹ کر' جوان' پرکشش اور خوبصورت ہو کر بھی وہ اس قابل نہیں تھی کہ ایک ادھیڑ عمر سیٹھ اس سے شادی کے لیے تیار ہو جاتا؟ جبکہ ویسے وہ اس کی طلب میں مرا جا رہا تھا اور ندیا اس کی دو بیویوں' بڑے بڑے بچوں کے باوجود اسے قبول کرنے پر تیار تھی۔ اس کی تیسری بیوی بننے پر آمادہ تھی۔

یہ تجربہ اس کے لئے بہت عجیب تھا۔ اسے گویا کسی نے خاصی اونچی چوٹی سے دھکا دے دیا تھا۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتی آئی تھی کہ اگر وہ شادی کے ضمن میں محض اشارہ دے دے تو کوئی بھی اس اشارے پر دوڑا چلا آئے گا لیکن آج اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔

پھر اس نے خود کو سمجھایا کہ اس نے غلط جگہ بات کر کے گنوائی تھی۔ سیٹھ اقبال بے پناہ دولت مند آدمی تھا' گھاگ اور جہاندیدہ تھا' اس کے سامنے بہت سے متبادل موجود تھے۔ پہلے ہی دو شادیاں کر چکا تھا' دنیا کو دیکھے بیٹھا تھا۔ اسے تیسری شادی کا بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر بڑی اداکارہ سے شادی تو اپنے دامن میں بڑے بکھیڑے لاتی تھی۔

اگر وہ کسی ایسے شخص پر نظر کرم کرتی جو ذرا کمزور' ذرا کمتر اور ذرا کم خوشحال ہوتا تو شاید وہ سر کے بل چلا آتا... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایسا شخص فریدہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے فریدہ سے تو کوئی ایسا آدمی چھین سکتا تھا جس کے پاس دولت کی طاقت بھی ہوتی اور اثر و رسوخ کی بھی... یا پھر وہ اتنا دبنگ آدمی ہوتا کہ کسی بھی طوفان کے سامنے سینہ ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا۔

رات کے پچھلے پہر اسے نیند آئی اور نہ جانے کیوں اس وقت اعجاز حامد کا تصور اس کی آنکھوں میں تھا!

دوسرے روز اسے دو شوٹنگز کے درمیانی وقفے میں اعجاز حامد کے دفتر جانے کا موقع ملا۔ فریدہ ہر جگہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی مگر اس روز اعجاز کے دفتر کے قریب پہنچ کر ندیا نے اپنی طبیعت میں رچی ہوئی محکومیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نرمی سے اس سے کہا: "امی! آپ سامنے شاہ صاحب کے دفتر میں بیٹھئے۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

فریدہ کچھ تذبذب کے سے عالم میں بولی۔ "چندا! ابھی اعجاز سے کوئی حتمی بات مت کرنا۔ اپنی پروڈکشن شروع کرنے کے بارے میں ابھی ہم کچھ اور لوگوں سے مشورہ کریں گے۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ ندیا اس سے ذاتی فلمسازی شروع کرنے کے سلسلے میں بات کرنے جا رہی تھی۔

"آپ مطمئن رہیں امی! میں کوئی کچا قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ میں بچی نہیں ہوں۔ اب تو دنیا میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔" ندیا مربیانہ لہجے میں بولی۔ فریدہ نے قدرے طمانیت سے سر ہلایا اور پرس جھلاتی شاہ صاحب کے دفتر کی طرف چل دی۔

اعجاز حامد کے دفتر کے دروازے پر چپراسی بڑے مستعد انداز میں بیٹھا تھا لیکن ندیا کو دیکھ کر وہ مودبانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "سلام میڈم صاحبہ!"

ندیا نے مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور دروازہ کھول کر اندر جا پہنچی۔ ایئرکنڈیشنر کی خنکی اور سگار کے دھوئیں کی مہک نے اس کا استقبال کیا۔

ندیا کا خیال تھا کہ اعجاز حامد لکھ رہا ہو گا مگر وہ اس وقت گھومنے والی کرسی پر نیم دراز' ایک ٹانگ میز پر ٹکائے بڑے انہماک سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ بڑی سی میز پر دیگر اخبارات' رسالے' کتابیں' کاغذات اور فائلیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں' کئی قلم ادھر

ادھر بکھرے ہوئے تھے، ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر تازگی اور توانائی کی چمک تھی۔ شاید آج کل اس پر کام کا بوجھ زیادہ نہیں تھا۔

ندیا کی آمد کا احساس اسے ایک لمحے کی تاخیر سے ہوا۔ وہ اخبار ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ندیا نے اس کے اکھڑپن اور درشت مزاجی کے اتنے قصے سن رکھے تھے کہ اسے کسی اچھے استقبال کی توقع نہیں تھی اور وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آئی تھی مگر اسے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ اعجاز کے چہرے پر مسرت کا پرتو اور اس کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی گویا اسے ندیا کی اچانک آمد سے ایک خاص نوعیت کی دلی خوشی حاصل ہوئی ہو۔

”زہے نصیب!“ وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا: ”آج ثابت ہو گیا کہ انسان دوسرے کے بارے میں جو کچھ سوچتا ہے، اس کی مقناطیسی لہریں دوسرے انسان تک کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی ہیں جسے ٹیلی پیتھی کہتے ہیں۔ سوچوں کی طاقت زیادہ آسانی سے اپنا سفر طے کر لیتی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ ندیا قدرے حیرت سے بولی۔ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

”میں آج سوچ ہی رہا تھا کہ دو ایک دن میں آپ کے دولت کدے پر حاضری دوں گا لیکن شاید میری سوچوں کی مقناطیسی لہروں نے پہلے ہی آپ کو اس بات سے آگاہ کر دیا کہ ہمیں آپ کی ضرورت ہے اور آپ خود ہی کمال عنایت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم فقیروں کو نوازنے چلی آئیں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھتی تھی آپ صرف کاغذوں پر لفاظی کرتے ہیں لیکن آپ تو اچھا خاصا ڈراما بول بھی لیتے ہیں۔“ ندیا مسکرائی۔ ویسے اعجاز کی وضاحت سے یکدم اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ کیا واقعی انسان دوسرے کے بارے میں جو کچھ سوچتا ہے، اس کی مقناطیسی لہریں اس انسان تک پہنچ جاتی ہیں؟ شاید اس معاملے میں سوچ کا سچا ہونا یا پھر دونوں انسانوں کا غیر معمولی طور پر حساس ہونا ضروری ہوتا ہوگا۔

وہ ابھی تک میز کے دوسری طرف اعجاز کے مقابل کھڑی تھی اور اعجاز مسلسل

اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستائش تھی، پسندیدگی تھی... بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر کسی جذبے کی دھیمی آنچ تھی۔

پھر وہ چونک کر بولا۔ ”تشریف رکھیے نا۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ شائستگی تھی۔

ندیا صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل اب سنبھل چکا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس شخص کے اکھڑپن کے بارے میں لوگوں نے کیسے کیسے افسانے تراش رکھے تھے۔ شاید دوسروں کے ساتھ اس کا رویہ کھردرا ہی رہتا ہو مگر شاید اس کی نظر میں ندیا کا مقام کچھ اور تھا۔ یہ سوچ بڑی خوش کن تھی۔

وہ بیٹھ چکا تو ندیا بولی۔ ”آپ کس لئے غریب خانے پر تشریف لانا چاہتے تھے؟“

”یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا... پہلے میں بتادوں کہ میں کیوں حاضر نہیں ہو سکا تھا۔ دراصل میں اپنی شادی میں الجھ گیا تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”شادی...؟“ ندیا نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں! شاید یہ خبر آپ تک نہیں پہنچ سکی کہ چند دن پہلے میں نے خفیہ طور پر شادی کر لی ہے۔“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ گویا اس کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ندیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے قدموں تلے سے آج پھر گویا زمین کھینچ لی گئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا!

☆

ندیا کو احساس تھا کہ اعجاز حامد نے اس کی کیفیت کا اندازہ کرلیا ہوگا۔ آخر وہ مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ہدایت کار بھی تھا' تاثرات کا بیوپاری تھا' چہرے پڑھنا تو اسے آتے ہی ہوں گے۔ اس نے جلدی سے سنبھلنے کی کوشش کی۔ اسے بھلا یہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ اعجاز حامد کی شادی کی خبر سے اسے صدمہ پہنچا تھا؟ آخر وہ ایک سپراسٹار تھی۔ جانے کتنے لوگ اس سے شادی کی تمناؤں میں لئے کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہوں گے۔

وہ مسکرا دی۔ اپنے اصل محسوسات کو چھپاکر چہرے پر جھوٹے تاثرات سجانے کا فن تو اسے بھی آتا تھا بلکہ اب تو وہ اس میں ماہر ہوچکی تھی۔ یہ کام کرتے برسوں گزرگئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے یہ جان کر اسے سچ مچ اطمینان ہوا کہ اعجاز حامد نے اس کی کیفیت کو حیرت ہی پر محمول کیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ شاید اس لئے حیران ہورہی ہیں کہ فلمی برادری کی ایک اہم رکن ہوتے ہوئے آپ کو اس اہم خبر کا پتا نہیں چلا؟ میں نے عرض کیا نا کہ یہ ایک خفیہ شادی تھی...اور اتنی خفیہ تھی کہ خود مجھے بھی اس کا پتا نہیں چلا..."

"کیا مطلب؟" ندیا اب حقیقتاً حیران تھی۔

اعجاز حامد نے گویا کسی لطیفے سے محظوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا اور ایک فلمی رسالہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "اس رسالے میں میری شادی کی خبر چھپی ہے۔ اسی سے مجھے بھی پتا چلا ہے کہ میں شادی شدہ ہوگیا ہوں ورنہ شاید میں خود بھی

اپنی شادی سے بے خبر رہتا۔"

"ارے...ہاں..." ندیا رسالہ اٹھاتی ہوئے بولی: "آج صبح سیٹ پر کچھ لوگ ذکر تو کررہے تھے کہ ہفت روزہ "فلمی دنیا" کے تازہ شمارے میں آپ کے بارے میں کوئی خبر چھپی ہے۔ میں اس وقت مصروف تھی' توجہ نہیں دے سکی کہ کیا بات ہو رہی تھی۔ میں نے خود ہی فرض کرلیا تھا کہ آپ کی کسی نئی فلم وغیرہ کے بارے میں کوئی خبر ہوگی۔"

"ارے... نہیں جناب!" اعجاز حامد گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "فلمی رپورٹروں کو اس بات سے کہاں دلچسپی ہوتی ہے کہ کون کیسی فلم بنا رہا ہے' اس میں کیا نیا تجربہ کررہا ہے یا کون سا نیا موضوع سامنے لارہا ہے' ان باتوں کا تو اگر ذکر آتا بھی ہے تو نہایت سرسری اور رسمی سے انداز میں۔ رپورٹروں کو اصل دلچسپی تو اس بات سے ہوتی ہے کہ کون چھپ چھپ کر کسی سے مل رہا ہے...کس کی شادی متوقع ہے...کس کے ہاں طلاق کے آثار ہیں...جیسے کہ اس وقت میری شادی کی خبر صفحہ نمبربارہ پر موجود ہے۔"

ندیا نے وہ صفحہ نکالا۔ اعجاز اور ساحرہ کی بڑی بڑی تصویروں کے ساتھ چھوٹی سی خبر تھی کہ انہوں نے شادی کرلی ہے۔ خبر بڑے مبہم سے انداز میں بڑی ہوشیاری سے لکھی گئی تھی یعنی قانونی اعتبار سے اس پر کوئی گرفت نہیں ہوسکتی تھی۔ ساحرہ اعجاز حامد کی اپنی دونوں فلموں کی ہیروئن تھی۔

ندیا مسکراتے ہوئے بولی۔ "ہم صحافت سے تو شکوہ کرتے رہتے ہیں لیکن فلمی دنیا بھی تو کچھ کم نہیں ہے۔ یہاں ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ لوگ شادی کرکے برسوں تک اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دو دو بچے ہوجاتے ہیں پھر بھی شادی کی تردید کرتے رہتے ہیں۔ متنازعہ جوڑا ہر تھوڑے دن بعد اعلان کرتا رہتا ہے... 'ہم تو صرف اچھے دوست ہیں'...باقی سب افواہیں ہیں' اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

بظاہر وہ ایک عمومی سی بات کررہی تھی لیکن درحقیقت ایک امکان کی طرف

اشارہ کر رہی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"فلمی دنیا خاصی بڑی ہے اور اتنے بڑے کسی بھی شعبے میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ میں سب کی وکالت نہیں کرسکتا..." اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے گویا پہلے ہی ہار تسلیم کرلی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"یعنی آپ اپنے بارے میں وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی شادی نہیں ہوئی؟" ندیا مسکراتے ہوئے بولی۔

"یقیناً... میں حلفیہ بیان دے سکتا ہوں۔" وہ بے پروائی سے ہنسا۔ "کیا آپ کو خبر کے انداز سے محسوس نہیں ہوا کہ یہ محض قیاس آرائی ہے؟ رپورٹر اپنی دانست میں بڑی دور کی کوڑی لایا ہے؟ میں خود صحافت میں رہا ہوں اور مجھے خاصی شرمندگی کے ساتھ اعتراف ہے کہ کبھی کبھی محض صفحات بھرنے یا رسالے کو چٹخارے دار بنانے کے لیے بھی اس قسم کی حاشیہ آرائیاں کرنا پڑتی ہیں۔ میں بھی ایسا کرتا رہا ہوں۔ شاید اسی لئے مجھے اس خبر پر غصہ نہیں آیا۔"

"حالانکہ کبھی کبھی معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔" ندیا بدستور مسکراتے ہوئے بولی: "انسان جو حرکت دوسروں کے ساتھ کرتا رہتا ہے کبھی خود اس کے ساتھ ہوتی ہے تو اسے بڑا غصہ آتا ہے۔" "میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔" اعجاز حامد خوش دلی سے بولا۔ "دراصل میری تین فلموں میں ہیروئن ساحرہ رہی ہے۔ دو فلمیں میری ذاتی تھیں۔ ایک کسی اور پارٹی کی تھی۔ تیسری فلم کے دوران میں خاص طور پر ہمیں بہت ساتھ رہنا پڑا۔ اس فلم کے معاملات بہت الجھ کر رہ گئے تھے۔ مجھے ساحرہ کے گھر کے بہت چکر لگانے پڑے۔ رپورٹر نے شاید بارہا ساحرہ کو میرے ساتھ گاڑی میں آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا اور اپنے طور پر نتیجہ اخذ کرلیا ہوگا۔"

ندیا کا دھڑکتا دل اب پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ وہ قدرے پرجوش لہجے میں بولی۔ "آپ کو اس کی تردید کرنی چاہئے۔"

"اس خبر سے زیادہ گھبراہٹ ساحرہ کو ہوگی۔ اس بے چاری کی مارکیٹ ویلیو کا

مسئلہ ہے۔ وہ خود ہی تردید کر دے گی اور اگر وہ عقلمند ہوئی تو اس خبر کو اہمیت نہیں دے گی۔ وقت اور حالات خود ہی اس کی تردید کردیں گے۔"

اعجاز حامد لاپروائی سے بولا۔ "میں اس کی تردید میں وقت ضائع نہیں کروں گا کیونکہ اس طرح اخبارات ورسائل کو ایک گرماگرم موضوع ہاتھ آجائے گا اور ایک عجیب ہی سلسلہ چل نکلے گا۔ اخباری لوگ سمجھیں گے ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ آپ بھی کہہ چکی ہیں کہ شادیاں کرکے تردیدیں کرتے رہنا فلمی دنیا والوں کی روایت ہے۔ اخبار والے بھی اسی نظریئے کے تحت سوچیں گے۔"

ندیا نے آہستگی سے اثبات میں سرہلایا اور رسالہ واپس میز پر رکھ دیا۔ چپراسی کافی لے آیا تھا۔ اعجاز اسے کافی پیش کرنے کے بعد نیا سگار سلگاتے ہوئے بولا۔ "میری کوشش یہ ہے کہ میں فلمی لوگوں کی اچھی عادتیں اپناؤں اور بے کار عادتوں کو نظر انداز کردوں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا: "میری قطعا خواہش نہیں ہے کہ شادی کروں تو اسے راز میں رکھوں۔ میں جب مفلس و گمنام تھا تو فلمی دنیا کے لوگوں کے بارے میں حیرت اور رشک سے سوچا کرتا تھا۔ کیسے ہوتے ہیں وہ لوگ... جن کی ہر ادا، ہر خطا، ہر جفا اور ہر حرکت خبر بن جاتی ہے۔ بات بات پر ان کی تصویریں چھپتی ہیں..."

کسی یاد میں الجھتے ہوئے وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "میں بھی ایسا ہی بننا چاہتا تھا لیکن شکر ہے مجھ پر اداکاری کا بھوت سوار نہیں ہوا اور میں نے اپنے لئے وہ لائن منتخب کی جس کی مجھ میں قدرتی طور پر صلاحیت تھی۔ آج میں معروف ہوں اور ذرا آسودہ حال بھی ہوں تو میں شادی گناہ کی طرح چپ چپاتے نہیں کرنا چاہوں گا۔ میں شادی دھوم دھام سے کروں گا۔ جتنے زیادہ لوگ جمع ہوں گے اور جتنے زیادہ اخباروں، رسالوں میں تصویریں چھپیں گی، اتنی ہی زیادہ مجھے خوشی ہوگی۔"

"اور آپ کی بیوی ایکٹریس ہوئی اور اس نے شادی کے لیے شرط یہی رکھ دی

کہ اسے خفیہ رکھا جائے ؟ یعنی وہی مارکیٹ ویلیو وغیرہ کا مسئلہ ہوا تو ..." ندیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو میں اسے سمجھا لوں گا ... قائل کر لوں گا کہ اللہ کی بندی ! اگر مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہونا مقدر میں ہی لکھا ہو تو پھر کوئی اسے اپ نہیں کر سکتا اور اگر ستارہ عروج پر ہے تو پھر شادی تو کیا ... طلاق سے بھی نیچے نہیں آ سکتا۔ یہ خواہ مخواہ بعض ایکٹریسوں کا وہم ہوتا ہے کہ شادی سے مارکیٹ ویلیو پر کوئی اثر پڑتا ہے ... مارکیٹ ویلیو ... عروج و زوال .... یہ تو کچھ اور ہی طرح کے پراسرار کھیل تماشے ہیں اور اوپر والے کے ہاتھ میں ان کی ڈور ہے۔"

"ہاں ... یہ تو درست ہے۔" ندیا نے دھیمے لہجے میں تائید کی پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ ایک بار پھر اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "ویسے اگر آپ اداکار بھی ہوتے تو برے نہ ہوتے ... ہیرو بھی آ سکتے تھے۔"

"یہ شکل ہے ہیرو والی ؟" اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ تو خوبرو لوگوں کا کام ہے ۔"

"ہمارے ماضی یا حال کے کیا سارے ہیرو خوبرو ہیں ؟" ندیا بولی۔

"سارے نہ سہی ... زیادہ تر تو ہیں۔" اعجاز بولا اور ندیا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا۔

"مقصد یہی ہوا نا کہ اداکاری اور خوبروئی کوئی لازم و ملزوم نہیں ہیں؟" ندیا نے تصدیق چاہی۔

"بے شک ... " اعجاز بولا : "مغرب میں بڑے بڑے بدصورت لوگ پائے کے اداکار ہیں۔ فلموں میں ہیرو آتے ہیں ... ہمارے ہاں بھی ہیں۔ میں اصل میں یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ اس خاکسار کے پاس نہ تو اچھی شکل صورت ہے اور نہ ہی اداکاری کی صلاحیت ... دونوں میں سے کوئی ایک چیز تو ہونی چاہئے۔"

"آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔" ندیا بولی۔

"یہ آپ کا حسن نظر ہے کہ آپ اسے کسر نفسی سمجھ رہی ہیں۔" وہ دھیرے سے بولا پھر اس نے سگار کا کش لیتے ہوئے کرسی کو تھوڑا سا گھمایا' چھت کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "ان صحافیوں کو میرے بارے میں ایک اور بات معلوم نہیں ہے۔"

"وہ کیا؟" ندیا نے تجسّس سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ شاید میں کسی ایکٹریس سے شادی کبھی نہ کروں۔" وہ بلا تامل بولا۔

ندیا کے دل پر جیسے گھونسا سا لگا ... کیا ایکٹریس اتنی ہی بری مخلوق ہے کہ کوئی بھی اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا' اس نے کرب سے سوچا۔

پھر خیالوں کی رو بھٹکتی چلی گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ انسان جنہیں دل میں بسا لیتا ہے۔ بسا اوقات ان سے ملنا بھی ایک آزمائش ہی ہوتا ہے۔ ایک لمحے میں ان کی کوئی بات رگ و پے میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ دوسرے لمحے میں ان کا کوئی جملہ دل کا خون کر دیتا ہے۔ ان سے ملنا خوشی کی بات سہی مگر ان سے ملتے وقت پل پل جینے اور پل پل مرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہئے۔

"کیوں ؟ ایکٹریس سے شادی کیوں نہیں کی جا سکتی ؟ عموماً" اس کا خاندانی پس منظر اچھا نہیں ہوتا... کیا اس لیے ؟" ندیا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے مدافعانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ... ! خاندانی پس منظر کی میری نظر میں زیادہ اہمیت نہیں۔"

"تو پھر...؟"

اعجاز نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر ملائمت سے بولا : "میں تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے خیالات بیان کر دینے کا عادی ہوں۔ اس لیے اگر میری بات بری لگے تو معاف کر دیجئے گا۔ تمام ایکٹریسوں کے لئے میرے دل میں احترام ہے لیکن اس لیے کہ ان کا فن اور محنت ہے۔ کسی اور اعتبار سے میں کسی ایکٹریس کو اتنا پسند نہیں کرتا کہ اس سے شادی کر لوں۔"

"وجہ آپ نے اب بھی بیان نہیں کی۔" ندیا کا لہجہ قدرے جارحانہ ہو گیا۔

"ایکٹریسوں میں انا اور وفا نہیں ہوتی۔" اعجاز بڑے ٹھوس لہجے میں بولا۔ "ان کی زندگی میں اہم ترین چیز دولت ہوتی ہے۔ دولت کے عوض وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ یہ انسان میں انا نہ ہونے کی نشانی ہے۔ وفا شاید اس لئے ان میں نہیں ہوتی کہ کیمرے کے سامنے دن رات محبت کا ڈراما کرتے کرتے حقیقی زندگی میں بھی محبت ان کے لیے محض ایک ڈراما بن کر رہ جاتی ہے۔ ان کی زندگی میں عشق کی اہمیت ایک فلم کی شوٹنگ سے زیادہ نہیں رہتی۔"

"اعجاز صاحب ... !" ندیا گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اسٹوڈیو میں داخل ہونے کے بعد ہم سب گویا ایک ہی خاندان کے فرد بن جاتے ہیں۔ آپ خود بھی کہہ چکے ہیں کہ ہم فلمی لوگ ایک برادری کی طرح ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا کہ جن ایکٹریسوں میں آپ کے خیال میں انا اور وفا نہیں ہے، انہی کو لے کر آپ فلمیں بناتے ہیں۔ گویا یہ ایکٹریسیں ہی آپ کی روزی کا ذریعہ ہیں۔ فلم انڈسٹری ان کے بغیر نہیں چل سکتی اور آپ فلم انڈسٹری کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں پا سکتے۔ اگر آپ فلم انڈسٹری میں نہ آئے ہوتے تو شاید ایک معمولی سے جرنلسٹ ہوتے۔"

"اس سے مجھے کب انکار ہے ؟ لیکن یہ ایک قطعی علیحدہ موضوع ہے۔ معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں، جو میں نے کی تھی۔"

وہ بڑے تحمل اور رسان سے بات کر رہا تھا۔ بدستور مسکرا رہا تھا۔ "ویسے یہ بحث بھی بہت طول کھینچ سکتی ہے کہ اگر فلاں فلم انڈسٹری میں نہ آیا ہوتا تو وہ کیا ہوتا ... لیکن میں اس بحث میں تو پڑ ہی نہیں رہا۔"

پھر وہ سرخم کرتے ہوئے بولا۔ "میں یہ تو تسلیم کر رہا ہوں کہ میری شناخت فلم انڈسٹری کے حوالے سے ہے اور ایکٹریسیں واقعی میرے ذریعہ معاش کا ایک حصہ ہیں لیکن بات صرف شادی کی ہو رہی تھی۔ شادی ایک قطعی علیحدہ مسئلہ ہے۔

جیسے ایک نرس کسی اسپتال میں کام کرتی ہے تو ایک طرح سے مریض ہی اس کی روزی کا ذریعہ ہیں مگر وہ مریض سے شادی تو نہیں کر سکتی نا ... وہ اس کی عزت کرے گی، خدمت کرے گی لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس سے شادی بھی کر لے۔"

"اگر مریض تندرست ہو جائے تو وہ شادی بھی کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔" ندیا بولی: "اور ایسا ہوتا بھی ہے۔"

"شاید ..." اس نے قدرے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ "میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، وہ میرے ذاتی خیالات اور نظریات ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ زمانے کے لیے سند ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان ایک الگ کردار ہے اور اس کی ایک الگ زندگی، ایک الگ کائنات ہے۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ آج میں یہاں بیٹھا فلسفہ بگھار رہا ہوں، عین ممکن ہے کل میں کسی ایکٹریس سے شادی کر لوں۔ انسان کسی سے ملتا رہتا ہے تو بڑے عقدے کھلتے ہیں۔ بہت سے نظریات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بہت سے انقلاب آ جاتے ہیں۔ کوئی انہونی، ہو جاتی ہے۔ انسان بیٹھا نظریات و خیالات کے قلعے تعمیر کرتا رہتا ہے لیکن وقت کی ایک ٹھوکر انہیں ریت کے گھروندوں کی طرح مسمار کر دیتی ہے۔ سب کچھ دھرا رہ جاتا ہے۔"

"اب آپ نے حقیقت پسندانہ بات کی ہے۔" ندیا نے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اعجاز نے گویا امکانات کا خانہ خالی چھوڑ دیا تھا۔ ایک اشارہ دے دیا تھا۔ ندیا کے لئے آس کی ڈور نہیں ٹوٹی تھی۔

اب یہ بھی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ لوگ اعجاز حامد کو کھردرا، منہ پھٹ اور بدلحاظ آدمی کیوں کہتے تھے۔ شاید وہ ہر ایک کے منہ پر اسی طرح سچی بات کہہ دیتا تھا اور سچ سننا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی، لیکن ندیا کو حقیقتاً اس کی کوئی بات بری نہیں لگی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید محبت کی یہ بھی ایک نشانی تھی کہ ایک انسان کو دوسرے کی کوئی بھی بات بری نہیں لگتی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ آزردہ سے لہجے میں بولی۔ "ویسے آپ کو تمام ایکٹریسوں کے بارے میں اتنے حتمی انداز میں فیصلہ صادر نہیں کرنا چاہئے کہ ان میں انا اور وفا نہیں ہوتی۔ اسی فلمی دنیا میں کئی ایسی عورتوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جنہوں نے وفا کا بھرم رکھتے ہوئے خود کو مٹی میں ملا لیا۔"

"چندا اچھی مثالیں تو برے سے برے طبقوں میں بھی ہوتی ہیں۔" وہ مضطربانہ انداز میں سگار کا کش لیتے ہوئے بولا۔ "لیکن وہ خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہیں۔ عین ممکن ہے میں اس سلسلے میں اتنا خوش نصیب ثابت نہ ہو سکوں۔"

پھر وہ گویا اس موضوع کے بوجھل پن سے خود ہی گھبرا کر بولا۔ "یہ قضیئے بڑے تفصیل طلب ہیں۔ بہت الجھی ہوئی باتیں ہیں۔ اب تو ملاقاتیں جاری رہیں گی اور بحث و مباحثہ بھی چلتا رہے گا۔ آپ یقیناً مجھ سے ان موضوعات پر بحث کرنے کے لئے نہیں آئی ہوں گی۔ ہم لوگوں کا وقت بہت قیمتی ہے۔ ہم اسے بے نتیجہ بحث و تمحیص میں ضائع نہیں کر سکتے۔ آپ یقیناً میرے پاس کسی کام سے آئی ہوں گی اور کام کی بات شروع ہی نہیں ہو سکی۔ فرمایئے ... میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" وہ سگار کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔

"میں آپ کے پاس کسی کام سے تو نہیں آئی۔ کیا ضروری ہے کہ انسان کو جب کسی سے کام پڑے تب ہی اس کے پاس جائے؟" اس نے اعجاز کی ذہین آنکھوں میں جھانکا۔ وہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ میرے پاس کسی کام سے نہیں آئیں ..." یہ بتا کر تو آپ نے میری اس خوشی کو دوچند کر دیا ہے جو آپ کی اس اچانک آمد سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔" اس نے سگار کا کش لیا۔ "لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ میں آپ کے پاس کام سے [illegible] تھا۔"

"یہ جان کر [illegible] ہوئی کہ میں بھی آپ کے کسی کام آ سکتی ہوں۔" [illegible] واقعی خوشی تھی کہ اعجاز [illegible] کرنے کا جو بہانہ اس نے سوچا تھا [illegible]

استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ قدرت کو شاید ویسے بھی ان کی ملاقات منظور تھی۔

وہ دھیمے لہجے میں بولی: "کیا میں کام کی نوعیت جان سکتی ہوں؟"

"میری تینوں فلموں میں ہیروئن ساحرہ رہی ہے حالانکہ آپ کا نام بھی اس سے بڑا ہے ... اور کام بھی ..." وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اس تعریف پر اس نے ندیا کو شکریہ ادا کرنے کی بھی مہلت نہیں دی اور بات جاری رکھی۔

"لیکن میرے مسلسل ساحرہ کو کاسٹ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میں صرف حریت پسندی اور جذبہ آزادی کو ہی اپنی فلموں کا موضوع رکھنا چاہتا تھا اور اس قسم کی فلموں کے لئے مجھے ساحرہ کی شخصیت زیادہ موزوں محسوس ہوتی تھی..."

پھر اس نے گویا وضاحت ضروری سمجھی۔ "میں صرف شخصیت کی بات کر رہا ہوں' فن کی نہیں ... آپ کا فن' آپ کی شخصیت اور آپ کے نقوش ... یہ سب کچھ سوشل فلموں کے لئے بے مثال ہے۔ یہ صرف میری ذاتی رائے ہے اور فلمی دنیا میں اب بہت کم لوگ رہ گئے ہیں جو اس قسم کی باریکیوں کا خیال رکھتے ہیں۔ اب تو یہاں صرف بھیڑ چال ہے۔ ایک ہیروئن کا نام چل رہا ہے تو اسے اٹھا کر ہر طرح کی فلم میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ آپ نے بھی ہر طرح کی فلموں میں کام کیا ہے۔ اور وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی مار دھاڑ کی فلموں نے بھی گولڈن جوبلی منائی ہے لیکن میں بہرحال باریکیوں پر قائم رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں ہر کام اپنے حساب کتاب سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"بہت خوب ..." ندیا مسکرائی۔ "شاید اسی لئے آپ کے کام میں انفرادیت نظر آتی ہے۔"

[illegible] تعریف اور کرتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا۔ "میں نے سوچا [illegible] جب [illegible] کوئی سوشل فلم بناؤں گا' اس کی [illegible] قبل از وقت باتیں

کرنے' کسی کے گھر کے چکر لگانے یا راستے میں روک کر اس کا وقت ضائع کرنے کی مجھے عادت نہیں۔ میں اپنے منصوبے کو بالکل حتمی شکل دینے کے بعد کسی سے بات کرتا ہوں۔"

"آپ کے سارے ہی طور طریقے فلمی روایات کے خلاف ہیں۔" ندیا گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔ "ورنہ یہاں تو بعض اوقات کہانی موجود نہیں ہوتی اور ہیروئن کو سائن کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اوقات پروڈیوسر کے ذہن میں صرف کیڑا کلبلاتا ہے کہ اسے ایک فلم بنانی ہے اور وہ ساری دنیا سے تبادلہ خیال شروع کر دیتا ہے۔"

"میں تو اس وقت تک کسی سے بات نہیں کرتا جب تک تمام جزئیات طے نہ کر لوں۔ اسی لئے میں نے ابھی تک آپ سے اپنے منصوبے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اور اس دوران آپ کی مصروفیات مزید بڑھ گئیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسا سبجیکٹ لے کر آپ کے پاس جاؤں کہ آپ انکار نہ کر سکیں اور اب ... مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک ایسے سبجیکٹ پر کام مکمل کر لیا ہے۔" اس نے طمانیت کی ایک گہری سانس لی۔

"سرمائے کا بندوبست ہو چکا ہے۔ بیشتر اداکاروں سے ڈیٹس مل گئی ہیں حتیٰ کہ ہیرو بھی فائنل ہو گیا ہے اور اس سے بھی ڈیٹس مل گئی ہیں۔"

"کون ہو گا ہیرو۔" ندیا نے اب واقعی قدرے تعجب سے پوچھا۔ اسے حیرت تھی کہ انڈسٹری میں اتنی خاموشی سے کام کرنے والا بھی ایک شخص موجود تھا۔

"سلیم صاحب ہیرو ہوں گے۔ اس وقت مارکیٹ میں ان کا نام بھی ہے اور مجھے ان کا کام بھی پسند ہے۔ میں بہت نخریلا آدمی ہوں۔ بہت کم لوگوں کا کام مجھے پسند آتا ہے۔" اعجاز نے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"شکر ہے میں ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں۔" ندیا مسکرائی۔

"آپ کو تو میں انکار ہی نہیں کر سکتا تھا۔" اعجاز ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"اب ذرا کچھ دل والے فائنانسر ملے ہیں تو میں نے بھی بھاری کاسٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔ حالانکہ میری تیسری فلم خاصی نرم گئی ہے لیکن مارکیٹ میں جو ساکھ بن چکی

ہے' وہ کام آ رہی ہے۔ لوگ اب بھی میرے نام پر دل کھول کر پیسہ لگانے کو تیار ہیں۔"

"اس بار بھی آپ کا سبجیکٹ حریت اور آزادی کی جدوجہد وغیرہ ہو گا؟" ندیا نے دریافت کیا۔

"نہیں... اسی لیے تو آپ سے بات کر رہا ہوں ورنہ میری ایک بار پھر کم و بیش وہی ٹیم ہوتی۔ ہیروئن کے طور پر میں ساحرہ کو سائن کرنے کے لئے دوڑا جا رہا ہوتا۔ خواہش تو میری یہی تھی کہ میرا فلمسازی کا ایک مخصوص پیٹرن بن جاتا اور وہ برقرار رہتا لیکن اس موضوع پر میری تیسری فلم ہی پٹ گئی ہے۔ پہلی دو فلموں نے دھوم مچا دی تھی۔ تیسری میں ایک دم تختہ ہو گیا۔ حریت کے موضوع پر میرے پاس فی الحال کوئی پاور فل کہانی بھی نہیں ہے اور سچی بات یہ ہے کہ پچھلے ناکام تجربے نے میری کمر توڑ دی ہے۔ میں مکمل زوال کا خطرہ مول نہیں لے سکتا اور فارغ بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ اس لیے اس بار بالکل نئے انداز سے سامنے آ رہا ہوں۔"

"نیا جال لائے پرانے شکار۔" ندیا بولی۔

"یہی سمجھ لیجئے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "میں نے کچھ عرصے کے لئے لائن بدلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اب دو تین سوشل فلمیں بناؤں گا اور میرے لئے یہ اعزاز ہو گا کہ میری کم از کم پہلی ایسی فلم کی ہیروئن آپ ہوں۔ اس کے بعد اگر آپ کی مصروفیات نے اجازت دی تو آئندہ بھی آپ کا ہمارا ساتھ رہے گا۔"

وہ پرامید نظروں سے ندیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ندیا کا دل ہولے ہولے لرزنے لگا۔ کاش وہ اسے بتا سکتی کہ وہ تو بہت لمبی رفاقت کا خواب آنکھوں میں لے کر اس کے پاس آئی تھی لیکن ابھی وہ اتنے مبہم خوابوں کا سراغ نہیں پا سکتا تھا۔

ندیا کو بار بار اس کی شائستگی' اس کے لفظوں کے چناؤ اور اس کے دھیمے پن پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ یہ تجربہ تو اسے پہلے بھی بارہا ہو چکا تھا کہ دور سے ایک شخص کا جو تاثر تھا' قریب سے دیکھنے پر وہ شخص اس سے بہت مختلف نکلا مگر آج کے تجربے

پر تو اسے بہت ہی حیرت ہو رہی تھی اور ساتھ ہی بے پناہ خوشی بھی۔

اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں اعجاز حامد سے اتنی بہت سی باتیں ہوں گی اور وہ بھی اتنے اپنائیت بھرے انداز میں! دوسرے اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ فریدہ کو مطمئن رکھتے ہوئے وہ اعجاز حامد سے ملاقاتوں کا بہانہ گھڑنے سے بچ گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ ذاتی پروڈکشن کا ڈراما رچانے کا ارادہ کئے ہوئے تھی۔ اس قسم کی ڈرامے بازیں کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے اس قسم کی جھوٹی اور کھوکھلی باتوں کا سہارا نہیں لینا پڑا تھا۔

اعجاز کہہ رہا تھا۔ "میں آپ کی اداکارانہ صلاحیتوں کا زبردست مداح ہوں۔"

ندیا گویا خیالوں کی دنیا سے واپس آتے ہوئے بولی۔ "اس ٹریڈ میں ہیروئن کو یہ مکالمہ بڑی کثرت سے سننے کو ملتا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"لیکن میں یہ مکالمہ ادا کرنے کے بعد آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ مجھ سے معاوضہ پچیس ہزار کم لے لیجئے۔" وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے اس مکالمے میں نیت کا خلوص بھی شامل ہے۔"

"روپے کی کمی بیشی سے بھی نیت کے خلوص کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ خلوص نیت کا اندازہ تو رفتہ رفتہ ہی ہوتا ہے۔" ندیا سنجیدگی سے بولی۔

"اب ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوگا تو رفتہ رفتہ آپ کو خلوص نیت کا ہی نہیں اور بھی بہت سی باتوں کا اندازہ ہو جائے گا۔" وہ اعتماد سے بولا۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی بہت سے مبہم امکانات پنہاں تھے۔

پھر اس نے گویا وضاحت بہتر سمجھی۔ "میری بڑی کوشش ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں اپنے آپ کو ایک بہتر انسان ثابت کر سکوں لیکن مجھ میں بس ایک ہی ایسی عادت [illegible] ہے کہ میں اپنے محسوسات [illegible] پردوں [illegible]

نہیں لپیٹتا۔ خواہ کسی وقت ایسا کرنا مصلحت کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔"

"میری نظر میں تو یہ بہت اچھی عادت ہے۔" ندیا بولی۔

"لیکن لوگوں کو یہ عادت اچھی نہیں لگتی اور کبھی کبھی مجھے اپنی اس عادت کی وجہ سے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، مگر میں نے ابھی تک اس عادت کو ترک نہیں کیا اور شاید کبھی نہ کروں۔ فلم انڈسٹری میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو منہ سے کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں مگر ان کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔"

"یہ فلم انڈسٹری ہی کی نہیں، آج کی پوری دنیا کی روایت ہے اعجاز صاحب!" ندیا اس کی بات کاٹتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی: "فلمی دنیا کے ہی نہیں، ہر شعبہ زندگی کے لوگ یہی کر رہے ہیں۔"

"ہاں.... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں تصحیح کا شکریہ ..." اعجاز حامد نے سر ہلایا۔ "سبھی اپنے ہونٹوں پر بے روح لفظوں کے جنازے اٹھائے پھرتے ہیں۔ لیکن میں ابھی یہ فن نہیں سیکھ سکا۔ آپ کو میری اس عادت سے سمجھوتہ کرنا ہوگا۔"

"سمجھوتہ ...؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔ "میں تو آپ کی اس عادت کو اور بھی سراہنے کی کوشش کروں گی۔"

پھر اس نے گویا ماحول میں دوبارہ سرایت کر جانے والے بوجھل پن کو کم کرنے کے لئے کہا: "موضوع کیا ہے آپ کی فلم کا؟"

"محبت کی شادی۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "اس میں فارمولا فلم والے سارے مسالے بھی موجود ہوں گے اور ہم اپنی بات کہنے کی بھی تھوڑی بہت کوشش کریں گے۔ فلم کے پہلے ہاف میں پروان چڑھتا ہوا رومانس، نہایت رومینٹک گانے ... عکس بندی ... مدھر موسیقی ... اور محبت کی شادی۔ امنگوں کی راتیں، مرادوں کے دن، چہلیں اور شرارتیں ....بیچ میں ایک کامیڈین بھی ہوگا۔ دوسرے ہاف میں [illegible] کا عفریت سر اٹھائے گا۔ چھوٹی چھوٹی چپقلشیں ... ادھورے خوابوں کی [illegible] ... دو ایک المیہ گانے ... بڑھتی ہوئی خلیج ... رونا دھونا اور علیحدگی۔ میں سوچ رہا

ہوں کہ آخر میں ایک کردار تخلیق کروں جو منطق اور اتفاقات کے سہارے اپنی ذہانت اور خلوص سے ہیرو ہیروئن کو دوبارہ ملا دے کیونکہ المیہ اختتام ہمارے ہاں پسند نہیں کیے جاتے۔ اس سلسلے میں ابھی میں نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ ویسے میرا اسکرپٹ مکمل ہی ہے۔"

"اعجاز صاحب ..." دفعتاً ندیا کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ "کبھی آپ تتلیوں کے تعاقب میں ماؤں سے بچھڑ جانے والے بچوں کے موضوع پر بھی تو فلم بنائیں۔ اس قسم کے موضوع پر آپ جیسا ذہین اور حساس ڈائریکٹر ہی فلم بنا سکتا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے اعجاز بالکل چپ رہا۔ وہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ گویا کسی مختصر خواب سے چونکتے ہوئے سر جھٹک کر بولا۔ "میں نے کسی ایکٹریس کے منہ سے آج تک ایسی خیال انگیز بات نہیں سنی۔ اس موضوع پر میں نے بھی سوچا تھا... بلکہ جب میں فلم انڈسٹری میں نہیں آیا تھا تو میں نے اس موضوع پر ایک رسالے میں کہانی بھی لکھی تھی لیکن فلمی دنیا میں آنے کے بعد اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی جرات نہیں ہو سکی۔"

"کیوں ...؟" ندیا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ اس موضوع پر فلم بنانا' فلم کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ خرکار کیمپوں کا مسئلہ بھی اسی موضوع سے متعلق ہے اور اگر میں اس موضوع پر فلم بناؤں گا تو اس میں والدین کی ناگفتنی مجبوریاں' سرکاری اداروں کی بے بسی' افسروں کی بے حسی سبھی کچھ آئے گا اور سنسر میں اس فلم کا حشر خراب ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں سنسر بورڈ میں عجیب و غریب نکات کا سہارا لے کر فلم کی جو حجامت بنتی ہے' وہ ایک الگ قصہ ہے۔ بعض اوقات ہاتھی نکل جاتا ہے' صرف دم کاٹ لی جاتی ہے اور بعض اوقات صرف دم سامنے رہ جاتی ہے' ہاتھی کہیں غیر بود ہو جاتا ہے۔ چونکہ انتہائی خلوص نیت اور محبت سے بنائی گئی فلم کا حشر خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتا اس لیے میں اس میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتا۔"

"اوہ ..." ندیا نے متاسفانہ سے انداز میں صرف اتنا کہا اور صوفے کے پشت سے ٹیک لگا لی۔

"لیکن آپ دل چھوٹا نہ کریں۔" اعجاز نے مسکراتے ہوئے گویا اسے تسلی دی۔ "وقت اور حالات نے مہلت دی تو یہ کام ... بلکہ اس جیسے اور بہت سے کام کریں گے۔ میرے بارے میں ویسے بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میں کب کیا کر گزروں۔"

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔" ندیا نے افسردہ کر دینے والی سوچوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آج تک تو میں نے اگر غیر متوقع طور پر بھی کچھ کیا ہے تو کوئی اچھا ہی کام کیا ہے۔" اعجاز مسکراتے ہوئے بولا۔

"چلیں ... پھر تو مجھے مطمئن رہنا چاہئے کہ آپ کا اب تک کا ریکارڈ تسلی بخش ہے ... ورنہ اچانک کچھ کر گزرنے والوں سے تو خوف ہی آتا ہے۔"

"کم از کم آپ کو مجھ سے خوف نہیں کھانا چاہئے۔ آپ کو مجھ سے ہمیشہ کوئی اچھی ہی خبر سننے کو ملے گی۔" اعجاز بولا۔

"اچھا...؟" ندیا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "چلئے ... دیکھیں گے ..."

"کام کی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔"

اعجاز اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "تو پھر فلم کے بارے میں کیا خیال ہے کہانی کا خاکہ تو میں نے آپ کو سنا دیا ہے۔ اس میں آپ کا رول بہت پاور فل ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ آج میں کام کی بات کرنے نہیں آئی تھی۔ یہ بات اگلی ملاقات کے لیے اٹھا رکھئے۔ سب کچھ ایک ہی ملاقات میں تو طے نہیں کر لینا چاہئے؟ وہ شرارت سے مسکرائی: "آپ گھر تشریف لائیے گا۔ میں امی سے مشورہ کر کے' ڈائری دیکھ کر آپ کو جواب دوں گی۔"

"بالکل ٹھیک ..." اعجاز اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہنسا۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ایک سپر اسٹار کو سائن کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہوتا ہے۔"

"ضروری نہیں ہے کہ کوئی اپنے آپ کو سپر اسٹار ظاہر کرنے کے لئے آپ کو گھر بلا رہا ہوں۔" ندیا دھیمے لہجے میں بولی۔ اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ کیمرے کے سامنے بھاری بھرکم رومانی مکالمے بے دھڑک بولنے والی اداکارہ کو یہ معمولی سی بات کہنے کے لئے بڑی جرات سے کام لینا پڑا تھا۔

"اچھا ... چلئے ... دیکھیں گے۔" وہ پر خیال سے انداز میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ شاید وہ کسی ان کہی کہانی کا سرا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ندیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے رخصت کرنے دروازے تک آیا اور اسے خدا حافظ کہتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کسی سے پہلی ملاقات کے آغاز پر ہی یہ کہنا کچھ زیادہ صحیح نہیں ہوتا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس لئے میں اب آپ کے رخصت ہوتے وقت یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ ندیا! ذہین اور حساس لوگوں سے مل کر مجھے ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔" اس کے لہجے میں ستائش تھی' پسندیدگی تھی۔ ندیا کا دل نہ جانے کیوں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ شاید انا مجھ میں نہ ہو۔ شاید اس خود سر جذبے کو وقت اور میری تربیت نے کہیں دفن کر دیا ہو۔ لیکن وفا مجھ میں کتنی ہے' یہ تمہیں وقت ہی بتائے گا۔ میری وفا کو تو اب تک کسی نے آزمایا ہی نہیں' مگر وہ یہ سب کچھ کہہ نہ سکی اور باہر آ گئی۔

وہ شاہ جی کے دفتر پہنچی تو فریدہ بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ وہ باتیں تو شاہ جی سے کر رہی تھی مگر اس کی آنکھیں دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔

"بہت دیر لگا دی تم نے ...." وہ شک زدہ سے لہجے میں بولی۔

"بہت لمبی باتیں چھڑ گئی تھیں۔" ندیا نے قدرے لاپروائی سے جواب دیا۔

"فلور نمبر چھ پر کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔" فریدہ نے کہا اور شاہ جی کو

خدا حافظ کہہ کر دونوں باہر نکل گئیں۔

"میں اعجاز کو سائن کرنے کے ارادے سے گئی تھی۔ اس نے الٹا مجھے سائن کر لیا۔" ندیا مسرور سے لہجے میں بولی۔

"سائن کر لیا ...؟" فریدہ کو جیسے جھٹکا سا لگا کہ ندیا نے اس کے مشورے اور رضامندی کے بغیر کیونکر فلم سائن کر دی تھی۔

"میرا مطلب ہے ابھی تو صرف بات ہوئی ہے۔" ندیا نے سنبھلتے ہوئے تصحیح کی۔ "مجھے اپنی بات کرنے کی تو مہلت ہی نہیں ملی۔"

"اوہ ... چلو اچھا ہی ہوا۔" فریدہ نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ فی الحال تو ندیا کے ذہن سے ذاتی پروڈکشن کا بھوت اتر جائے۔

پھر وہ قدرے فکر مند ہوتے ہوئے بولی۔ "تم نے اس کی فلم کے لئے ہامی بھر لی تو کروگی کیسے؟ وقت تو ہے نہیں تمہارے پاس۔"

ندیا کو معلوم تھا کہ یہ فکر مندی مصنوعی تھی دل تو فریدہ کا یہی چاہتا تھا کہ ندیا کوئی بھی فلم نہ چھوڑے خواہ اسے پوری پوری رات جاگ کر عکس بندی کرنی پڑے اور وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتی رہے۔

ندیا دھیرے سے بولی: "ابھی میں نے ہاں نہیں کی ہے۔ وہ گھر آئے گا۔ پھر بات کریں گے۔"

"اچھا... اچھا..." فریدہ نے طمانیت سے سر ہلایا۔

وہ فلور نمبر چھ پر جا پہنچیں جہاں ڈرائنگ روم کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس سیٹ پر ...ا کو ولن سے نفرت کا اظہار کرنا تھا جب کہ اس کے دل میں اس وقت محبت کے ...ے پھوٹ رہے تھے۔

"کیسا عجیب کام ہے یہ بھی..." ندیا نے زندگی میں بارہا سوچا تھا۔ "آپ کا رونے ...دل چاہ رہا ہو مگر عین ممکن ہے سیٹ پر جاکر ہنسنا پڑے۔ آپ کا دل کسی کی نفرت کی ...ے میں سلگ رہا ہو' مگر سیٹ پر جاکر شاید آپ کو کسی سے اظہار محبت کرنا پڑے اور

جب آپ کا محبت کرنے کو جی چاہ رہا ہو تو' پھر اس کی سوچ نے پلٹا کھایا ... ایک فلمی دنیا پر ہی کیا موقوف ! ساری ہی دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ شیکسپیئر نے ٹھیک کہا تھا ... یہ ساری دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم اداکار ... ! ہم سب اس نگارخانے میں اپنا اپنا منافقانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔



ندیا نے اعجاز کی فلم سائن کر لی تھی اور عکس بندی بھی شروع ہو چکی تھی۔ عکس بندی کی رفتار ست تھی۔ تاہم اگر عکس بندی نہیں ہوتی تھی تب بھی اعجاز سے دوسرے تیسرے دن ندیا کی ملاقات ضرور ہوتی تھی۔

کم از کم ندیا کو تو یہی محسوس ہونے لگا تھا جیسے اعجاز کو برسوں سے جانتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح فریدہ سے پیچھا چھڑا کر اس سے ملاقات کا موقع نکال لیتی تھی وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے' حالانکہ ندیا کے پاس ذرا بھی وقت نہیں ہوتا تھا اور اعجاز بھی کچھ کم مصروف نہیں تھا۔

ندیا جو اس سے پہلے کبھی کسی سیٹ پر تاخیر سے نہیں پہنچتی تھی اور نہ ہی دوسروں کی تاخیر برداشت کرتی تھی۔ اب اگر اسے کہیں پہنچنے میں تاخیر ہوتی تھی تو صرف اعجاز سے ملاقاتوں کی وجہ سے۔

وہ اعجاز کے ساتھ ہوتی تو اس کا دل یہی چاہتا کہ وہ بولتا رہے اور وہ سنتی رہے۔ وہ بہت علم رکھنے والا آدمی تھا۔ ہر موضوع پر بے تکان بولتا۔ سوائے محبت کے !

ان کے درمیان کبھی محبت کے موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ بولتا تو ندیا بس خاموشی سے اس کے ان گنت لفظوں میں محبت کا سراغ ڈھونڈتی۔ اس کے جملوں میں چاہت کی خوشبو تلاش کرتی اور اس کی باتوں کی ریت میں محبت کے سونے کا ایک آدھ ذرہ اسے نظر آ جاتا تو اس کا دل مسرت سے معمور ہو جاتا۔

اعجاز نے ایک بار اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانے پر مدعو کیا۔ وہ اپنی ایک عکس بندی کینسل کروا کر بہ مشکل فریدہ سے پیچھا چھڑا کر کھانے پر پہنچی۔ فریدہ کو اس

کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری مگر ندیا نے اس کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ فریدہ نے بھی شاید کسی مصلحت کے تحت فساد کھڑا نہیں کیا۔

اس ملاقات میں اعجاز نے باتوں باتوں میں کہا۔ "مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ میں پہلے آپ سے کیوں نہیں ملا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اردگرد فلم انڈسٹری ہی میں ایک اتنی نفیس عورت بھی موجود ہے۔"

ندیا کا دل نو عمر لڑکیوں کی طرح تیز تیز دھڑکنے لگا اور اس کے حواس پر ایک عجیب طرح کا خمار چھا گیا۔ اس نے کیمرے کے سامنے' کہنہ مشق مصنفوں' کے لکھے ہوئے نہ جانے کتنے خوبصورت مکالمے کیسے کیسے خوبرو ہیروز کے منہ سے سنے تھے۔

اکا دکا لوگوں کو اگر موقع میسر آیا تھا تو انہوں نے حقیقی زندگی میں بھی فریدہ کی آنکھ بچا کر اس پر عشق کے پھندے پھینکنے کی کوشش کی تھی۔

مگر کبھی اس کا دل اس طرح نہیں دھڑکا تھا۔ ہر لفظ اسے کھوکھلا محسوس ہوا تھا اور ہر جملہ خلوص سے خالی۔ مگر اعجاز کی ان کہی باتیں بھی اس کی دھڑکنیں تیز کر دیتی تھیں۔

کیا اعجاز وہی بات کہہ رہا تھا جو وہ سننا چاہتی تھی ؟ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔

وہ اعجاز کی آنکھوں میں بارہا اپنے لئے پسندیدگی کی جھلک دیکھ چکی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اسے کھوئی کھوئی نظروں سے تکنا شروع کرتا تھا تو تکتا ہی چلا جاتا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں وہ سیدھے سچے اور مختصر سے لفظوں میں وہ بات نہیں کہتا تھا جسے سننے کے لیے ندیا کی سماعت کا صحرا برسوں سے پیاسا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔" ندیا بالکل نو عمروں والی زبان میں اس سے یہ چند بڑھے سادے الفاظ سننا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان چند جادو بھرے لفظوں سے اس کی روح میں پھیلا ہوا ازلی سناٹا دور ہو جائے گا۔ ناامیدی' مایوسی اور شکست کی بے کراں رات دم توڑ دے گی اور' بے کسی کے افق سے عشق کا تارا جھلملاتا نظر آئے گا

تو وہ اپنے ساتھ ہونے والی عمر بھر کی ناانصافیاں بھول جائے گی۔ وہ اس کا نیا جنم ہوگا۔ وہ اعجاز کا ہاتھ تھام کر اس خوبصورت قفس سے رخصت ہو سکے گی جسے فریدہ "گھر" کہتی تھی جہاں اسے اپنی سانسوں پر بھی اختیار نہیں تھا۔ اعجاز کا مضبوط سہارا میسر ہوگا تو وہ بغاوت کر سکے گی۔ ایک نئی دنیا آباد کر سکے گی۔

پھر وہ نئی دنیا کے خواب دیکھنے لگتی۔ جب سے اعجاز سے اس کی ملاقات ہوئی تھی' اسے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کا مرض بڑی شدت سے لاحق ہو گیا تھا۔ وہ بارہا بڑی حیرت سے سوچتی' اعجاز میں کیا خاص بات ہے؟ کیا وہ دنیا سے انوکھا کوئی شخص ہے؟

پھر وہ سوچتی کہ انوکھا پن شاید کسی فرد میں نہیں' اپنی نظر میں ہوتا ہے۔ یہ تو دل کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے' انوکھا سمجھنا شروع کر دے... یا پھر شاید وہ اس لیے انوکھا لگتا تھا کہ اس کی باتوں میں سچ کی خوشبو تھی۔ سچ ... جو دوسروں کو بہت کڑوا لگتا تھا لیکن ندیا کو اس کے منہ سے سچ سن کر اطمینان ہوتا تھا۔

ندیا سوچتی' سچ بولنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ کھرا آدمی تھا۔ اس کی شخصیت میں دھوکا نہیں تھا۔ وہ ایک شفاف آدمی تھا۔ اس کے باطن میں جھانکا جا سکتا تھا۔ محبت پر یوں تو کسی کا اختیار نہیں تھا۔ کسی بھی لمحے' کسی سے بھی ہو سکتی تھی لیکن ندیا کو درحقیقت ایسے ہی آدمی سے محبت کرنے اور ایسے ہی آدمی سے محبت پانے کی ضرورت تھی۔

ادھر اعجاز کا عجیب عالم تھا۔ وہ دنیا بھر کی پر پیچ باتیں کرتا مگر وہ چند سادہ سے الفاظ اس کی زبان پر نہ آتے جن کے انتظار میں ندیا کے اعصاب چٹخنے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ ڈوبتے دل کے ساتھ سوچتی کہ شاید اعجاز کسی ایکٹریس کے ساتھ محبت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی تو اس کا دل اتھل پتھل ہونے لگتا۔ اس کی آنکھیں ندیا کو کسی اور ہی دنیا کا پرتو دکھاتی تھیں۔ وہ پھر سنبھل جاتی۔

آج ریستوران کے ایک گوشے میں مدھم روشنی میں وہ کسی پہرے' کسی نگرانی

کے بغیر پہلی مرتبہ ایک ایسے شخص کے ساتھ بیٹھی تھی جس کا نام فریدہ نے دل ہی دل میں یقیناً ایسے افراد کی فہرست میں درج کر رکھا ہوگا جو اس کی نظر میں "خطرناک" تھے۔

فریدہ کی نظر میں "خطرناک" لوگ وہ تھے جو ندیا کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ اسے متاثر کر سکتے تھے اور سونے کی اس چڑیا کو اڑا کر اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ فریدہ کی ساری تگ و دو ندیا کو ایسے ہی لوگوں سے بچانے کے لئے ہوتی تھی۔

مگر آج ندیا ایسے ہی ایک شخص کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ پہلی بار اپنے آپ کو قفس سے دور اور بہت ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ ایک سبک فاختہ کی طرح آسمان کی وسعتوں میں اڑنے کو اس کا جی چاہ رہا تھا۔ آج وہ اسٹوڈیوز کے سازشی گوشوں سے دور تھی۔ فریدہ سے دور تھی۔ شیر خان اور احسان علی سے دور تھی ... اور شاید اسی لیے آج وہ اپنے آپ سے قریب تھی! مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی روح کے ویرانے میں آج ان گنت شمعیں روشن تھیں۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ آج اس کے من آنگن میں اجالا تھا۔

"آپ نے مجھے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا ..." اعجاز کہہ رہا تھا۔ "یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ کو رازی صاحب نے متعارف کرایا تھا جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ...."

ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ اسے سب کچھ بتا دے۔ بچپن سے آج تک کی کہانی سنا دے۔ اعجاز پر اسے یہ تو بھروسہ تھا کہ وہ راز کو راز رکھنا جانتا ہوگا مگر پھر اسے محسوس ہوا کہ اپنی اصل کہانی سنانا یوں لگے گا جیسے وہ اعجاز کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتانا ندیا کو کچھ قبل از وقت سا محسوس ہوا... اور کچھ وہ انا کی سولی پر بھی مصلوب ہو گئی۔ اعجاز تو ویسے ہی کہتا تھا کہ طوائفوں میں انا نہیں ہوتی۔

"اکثر ایکٹریسوں کے بیک گراؤنڈ ملتے جلتے سے ہوتے ہیں۔" وہ بلیک کافی میں شکر ملاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ "کچھ چیزیں آپ کی نظر میں ہوں گی۔ کچھ ادھر ادھر سے سن رکھا ہوگا... اور کچھ اندازے بھی ہوں گے۔ بڑی بے کار سی باتیں ہیں.. کیا کریں گے سن کر۔"

اعجاز یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ وہ بھی بے حد صاف گو اور کھری ہونے کے باوجود دوسری بہت سی ایکٹریسوں کی طرح اپنے معیوب خاندانی پس منظر سے بچنا چاہتی ہوگی۔ اس نے بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔

اس رات ندیا گھر پہنچی تو فریدہ نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا' گویا سراغ لگانا چاہ رہی ہو کہ اس کے اندر کچھ تبدیلیاں تو رونما نہیں ہوئی تھیں؟ وہ بالکل چپ چپ سی تھی۔ یقیناً اسے ندیا کا تنہا اعجاز کے ساتھ کھانے پر جانا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

ندیا کو معلوم تھا کہ وہ ڈرائیور سے ساری رپورٹ بھی لے چکی ہو گی کہ وہ ہوٹل کے ریستوران میں اعجاز کے ساتھ کتنی دیر رہی تھی ... ریستوران کے علاوہ تو وہ کہیں نہیں گئے تھے ... بات چیت اور ملاقات کا انداز کیا تھا...؟ وغیرہ وغیرہ۔

ندیا جانتی تھی کہ ڈرائیور فریدہ کا جاسوس تھا۔ اگر وہ کبھی فریدہ کی نظر سے اوجھل ہوتی تھی تو ڈرائیور اس پر نظر رکھتا تھا۔ ندیا کو یقین تھا کہ جب وہ اعجاز کے ساتھ فائیو اسٹار ہوٹل کے ریستوران میں بیٹھی تھی تو ڈرائیور کسی نہ کسی کونے کھدرے سے اس کی نگرانی کر رہا ہوگا۔

ندیا کو یہ بھی توقع تھی کہ شاید ڈرائیور سے رپورٹ لینے کے بعد فریدہ آئندہ اسے اعجاز کے ساتھ تنہا کھانے پر جانے کی اجازت نہ دے لیکن سردست ندیا کو کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ اس کی روح گنگنا رہی تھی۔ وہ افسانوی محبت میں مبتلا ہو جانے والی کسی نو عمر اور نوخیز لڑکی کی طرح خوش تھی۔

دوسرے روز اسے ایک فلم کے یونٹ کے ساتھ مری روانہ ہونا پڑا' جہاں برف باری کا سیزن شروع ہو چکا تھا۔ ڈائریکٹر نے برف باری کے کچھ مناظر تو درون خانہ ہی

ریکارڈ کر لئے تھے تاکہ مری میں وقت اور اخراجات کی بچت ہو سکے۔

برف باری کی ان ڈور شوٹنگ کے لئے پسے ہوئے نمک کے دو تین ٹرک منگوا کر برف سے ڈھکی ہوئی ایک چوٹی تیار کی گئی تھی اور گانے کے کچھ مناظر عکس بند کر لیے گئے تھے مگر ڈائریکٹر کو بہرحال مری کے دلفریب علاقے کی خوب صورتیاں بھی عکس بند کرنا تھیں۔

وہ اندازاً پندرہ دن کے دورے پر جا رہے تھے۔ اگر موسم ان کا ساتھ دیتا تو کام کم دنوں میں بھی نمٹ سکتا تھا۔ ندیا کے ساتھ فریدہ کے علاوہ شیر خان اور احسان علی بھی جا رہے تھے۔ وہ دونوں اپنے خرچ پر جا رہے تھے۔

مری پہنچ کر دو دن تک عکس بندی کی نوبت ہی نہیں آ سکی اور اس طرح ڈائریکٹر نے نمک کے ٹرکوں کے ذریعے درون خانہ عکس بندی کر کے اپنی دانست میں وقت اور اخراجات کی جو بچت کی تھی وہ برابر ہوگئی۔

مری میں گوکہ ماحول عکس بندی کے لئے سازگار تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ تعطیلات اور شدید گرمی کے دن گزارنے والوں کے ہجوم چھٹ چکے تھے۔ جس ہوٹل میں وہ لوگ ٹھہرے تھے' وہاں بھی بس ان ہی کے دم سے رونق تھی۔ ان کے علاوہ پورے ہوٹل میں بس دو تین سیاح جوڑے اور برف باری دیکھنے کے لئے دو تین ہم وطن شوقین موجود تھے۔ بیشتر کمرے خالی تھے۔

اگر وہ عکس بندی کرنے نکلتے تو کوئی مخل ہونے والا نہ ہوتا اور نہ ہی مجمع لگنے کا اندیشہ ہوتا۔ پریشان کرنے والے تماشائیوں کی آمد کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ عکس بندی شروع نہ کر سکے۔ کیونکہ برف باری وقفے وقفے سے جاری تھی۔ یہ بھی کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ سارا دن اندھیرا سا چھایا رہتا۔ روشنی بہت ہی کم تھی اور عکس بندی کے لئے موزوں نہیں تھی۔

وہ بہتر موسم کا انتظار کر رہے تھے۔ دن بھر سیر سپاٹا ہوتا' گپ شپ ہوتی' تاش کی محفلیں جمتیں اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ وہ سب اس بے کاری سے

لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسی فراغت کا تصور تک نہیں تھا۔ غنیمت تھا کہ پروڈیوسر ان کے ساتھ نہیں تھا ورنہ ان بے مقصد اخراجات کا بل دیکھ کر اس کے ہوش اڑ جاتے اور اس کا ردعمل دیکھ کر سب کے لطف میں کافی کمی آ جاتی۔

تیسرے دن ندیا ابھی اپنے کمرے میں بیٹھی بستر میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی چائے کی چسکیاں بھی لیتی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر اخبار کی ایک سرخی پر پڑی اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا۔

وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی!

☆

وہ ایک مختصر، غیر نمایاں، سنگل کالم کی خبر تھی۔ ندیا کی نظر "اتفاقاً" ہی اس پر پڑ گئی تھی ورنہ وہ تو خاصے سرسری سے انداز میں اخبار دیکھنے کی عادی تھی۔ موٹی موٹی سرخیوں پر نظر ڈالتی تھی۔ صف اول کے اداکاروں کے پاس تفصیل سے اخبار پڑھنے کا وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔ اس خبر کی سرخی تھی۔

"معروف فلمی اداکارہ نائلہ کا اقدام خودکشی۔"

خبر کچھ مبہم سی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رپورٹر کو حقائق کی زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اخبار کی طرف سے یا پھر متعلقہ افراد کی طرف سے اس خبر کو دبانے کی کوشش کی گئی ہو۔

خبر میں صرف اتنا بتایا گیا کہ گزشتہ روز اداکارہ نائلہ کو نازک حالت میں اسپتال لایا گیا تھا اور ڈاکٹروں نے اس کی جان بچالی تھی۔ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اس نے زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔ تادم تحریر اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

نائلہ بھی کچھ عرصے سے سپراسٹارز میں شمار ہونے لگی تھی لیکن اس کی شہرت میں تھوڑا سا سستا پن شامل تھا۔ صاف ستھری اور گھریلو قسم کی فلمیں بنانے والے اسے کم ہی لیا کرتے تھے۔ زمانہ ابھی ایسی قیامت کی چال نہیں چلا تھا۔ معاشرے میں ٹھہراؤ کچھ رکھ رکھاؤ اور وقار تھا۔ زیادہ تر ایسی ہی فلمیں بنانے کی کوشش کی جاتی جنہیں کنبے کے سب افراد ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکیں۔

نائلہ کو اس قسم کی فلموں کے لیے موزوں نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کا ذرا مختلف قسم کا تاثر بن چکا تھا۔ اس کے علاوہ جن فلموں میں مشکل اور جذباتی مناظر ہوتے تھے، ان کے لئے بھی اسے موزوں نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جب اچھی اور منجھی ہوئی اداکارائیں دستیاب تھیں تو اس کے ساتھ زیادہ محنت کرنے اور اس کے بارے میں تاثر بدلنے کی دردسری کون مول لیتا....؟

چنانچہ جن فلموں میں کلبوں کے مناظر' نت نئے انداز کے رقص' ہنگامے' مجرموں' اسمگلروں کے گروہ وغیرہ ہوتے تھے۔ ان کی ہیروئن نائلہ ہوتی تھی' یوں کہنا زیادہ مناسب تھا کہ اس قسم کی فلمیں نائلہ کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی تھیں۔ وہ اداکاری سے زیادہ رقص کے ذریعے اسکرین پر جادو جگاتی تھی اور مخصوص مزاج کے لوگوں کے دلوں کو گرماتی تھی۔

وہ حقیقی زندگی میں بھی ایک خوش مزاج اور زندہ دل عورت تھی۔ ندیا نے اسے کئی مرتبہ سیٹ پر دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہنستی بولتی نظر آتی تھی۔ اس کے قہقہوں میں زندگی کی کھنک محسوس ہوتی تھی۔ وہ منہ بسورتے لوگوں کا مذاق اڑاتی تھی۔ حتیٰ کہ اسے زیادہ لئے دیئے رہنے والے لوگ بھی پسند نہیں تھے۔ اگر وہ ان کے منہ پر نہیں تو پیٹھ پیچھے ضرور ان کا تمسخر اڑاتی تھی۔

شاید اسی لیے ندیا کو اس کی خودکشی کی خبر سے حیرت کا زیادہ شدید جھٹکا لگا تھا۔ اس جیسی زندہ دل عورت کو خودکشی کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ ندیا نے سوچا... وہ تو زندگی سے بہت خوش معلوم ہوتی تھی۔ جہاں تک ندیا کو معلوم تھا' اس کی نجی زندگی میں بھی کوئی ایسی بڑی الجھن پنجے گاڑے نہیں بیٹھی تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھی۔ ماں باپ بھائی بہنوں کے ساتھ رہتی تھی اور ندیا کی معلومات کے مطابق وہ ایک آزاد خیال' خوش باش گھرانا تھا۔ بیشتر اداکاراؤں کی طرح وہ بھی غربت کی دلدل سے نکل کر اس مقام تک پہنچی تھی۔ اب اس کا خاندان ایک خوشحال علاقے میں اچھے سے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ سب ٹھاٹ سے زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں آپس میں کسی لڑائی

جھگڑے یا روپے پیسے کی رساکشی کی خبریں بھی کبھی سننے میں نہیں آئی تھیں۔ حتیٰ کہ سینہ گزٹ' کے ذریعے بھی کوئی ایسا مبہم سا نکتہ ندیا تک نہیں پہنچا تھا جسے وہ نائلہ کی خودکشی کی کمزور سی بنیاد سمجھ سکتی۔

پھر' اپنی اس سوچ پر ندیا کو خود ہی ہنسی سی آ گئی۔ فلم اسکرین کے پیچھے کی ساری کہانیاں تو خود فلم والوں کے علم میں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ کون جانتا ہے کہ پرسکون جھیلوں کی تہ میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ کسے معلوم ہے کہ ہنستے چہروں کے عقب میں کتنی روتی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں؟ لوگ تو شاید خود اسے بھی ایک خوش و خرم اور قابل رشک عورت سمجھتے ہوں گے' جو شاید ایک پرستان میں یا کسی الف لیلوی خواب جزیرے پر زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن اپنی زندگی سے وہ کتنی خوش تھی' یہ تو وہ خود ہی جانتی تھی۔

اس روز عکس بندی کے لیے موسم سازگار تھا۔ حسب وقت وہ لوگ عکس بندی کے لیے لوکیشن کی طرف روانہ ہوئے' اس وقت تک یونٹ کا ہر آدمی نائلہ کے بارے میں خبر سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس پر تبصرے اور حاشیہ آرائیاں جاری تھیں لیکن ندیا محسوس کر رہی تھی کہ نائلہ کے بارے میں کسی کو بھی کوئی تشویش نہیں تھی' کوئی افسوس نہیں تھا... حتیٰ کہ تجسس بھی نہیں تھا!

یہ واقعہ گویا کسی کے نزدیک نہ تو اہم یا غیر متوقع تھا' اور نہ ہی ہمدردی یا توجہ کا مستحق۔ حد تو یہ تھی کہ اخبار نے بھی اس خبر کو بالکل غیر نمایاں سے انداز میں چھاپا تھا' ورنہ اخبارات تو فلمی فن کاروں کی معمولی سی خبروں کو بھی خوب اچھالتے تھے۔ ندیا کو لوگوں کی اس بے اعتنائی پر نہ جانے کیوں رنج ہوا۔

راستے میں ڈائریکٹر احسان اللہ بولا۔

"خدا کا شکر ہے وہ میری فلم کی ہیروئن نہیں تھی۔ بیٹھے بٹھائے مصیبت پڑ [illegible]۔ بہت وقت ضائع ہوتا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ پولیس بھی تفتیش کے لئے درمیان میں کود پڑتی اور اپنی تفتیش کے ڈانڈے مجھ سے یا فلم کے ہیرو سے ملا دیتی۔"

پھر وہ ندیا سے مخاطب ہوا۔ "ندیا جی! اگر خدانخواستہ کبھی آپ کا سلیپنگ پلز وغیرہ کھانے کا ارادہ ہو تو میری آخری شوٹنگ مکمل کرا کے یہ شوق پورا کیجئے گا۔"

باقی لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ گویا احسان اللہ نے کوئی لطیفہ سنایا تھا۔ ندیا حیرت سے ان لوگوں کے چہرے تکتی رہ گئی۔ اپنی ہی برادری کی ایک عورت کی خودکشی کی کوشش ان کے لئے محض ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

کیمرہ مین ارشاد نے ڈائریکٹر کو مخاطب کیا۔ "سرجی! آپ کو وہ بی کلاس ہیروئن روبینہ یاد ہے؟"

"یاد کیوں نہیں ہوگی بھئی؟ وہ میری ہی تو دریافت تھی۔ میں نے ہی تو اسے فلم اسکرین پر انٹروڈیوس کرایا تھا۔" احسان اللہ جوش سے بولا۔

"بالکل ... بالکل سر جی! آپ کے لئے یہ کون سی نئی بات ہے۔ آپ نے بیسیوں نئی لڑکیوں کو انٹروڈیوس کرایا اور جب وہ میڈم جی' بن گئیں تو آپ ان کو بھول گئے..." کیمرہ مین نے خوشامدانہ سے لہجے میں کہا۔ اصل میں وہ اب تک اسسٹنٹ کیمرہ مین رہا تھا۔ احسان اللہ کو اس فلم کے لئے اپنی شرائط پر کوئی پرانا کیمرہ مین نہیں مل سکا تھا۔ وہ پہلی بار ارشاد کو مکمل کیمرہ مین کی حیثیت سے موقع دے رہا تھا۔

احسان اللہ نے ذرا طمانیت سے سرہلایا تو ارشاد سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔

"سرجی! میں تو آپ کو یہ یاد دلا رہا تھا کہ وہ جو روبینہ تھی۔ خودکشی کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میرا خیال ہے وہ تو میڈیکل اسٹور والوں سے ہول سیل کے حساب سے سلیپنگ پلز خریدتی تھی۔ کسی پروڈیوسر نے پیسے مار لئے تو خودکشی ... اماں نے ڈانٹ دیا تو خودکشی ... کسی ایکٹر نے کوئی وعدہ کر کے نہیں نبھایا تو خودکشی ... غرضیکہ بات بات پر خودکشی کی کوشش کرتی تھی..."

"ارے وہ سب ڈرامے بازی تھی۔" احسان اللہ بے پروائی سے بولا۔ "سارا چکر شادی کا تھا۔ من پسند جگہ پر روبینہ کی شادی ہوگئی تو سب ٹھیک ہو گیا۔"

"کوئی غیر فلمی آدمی تھا شاید ... جس سے موصوفہ نے شادی کی تھی۔" ارشاد

گویا کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں... سندھ کا ایک بڑا جاگیردار تھا۔ روبینہ بیگم کا پرانا قدر دان تھا۔" احسان اللہ نے ست رفتاری سے چلتی گاڑی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "شادی کے بعد روبینہ بیگم کی خودکشی کی عادت بھی یقیناً چھوٹ گئی ہوگی کیونکہ پھر اس سلسلے میں کوئی خبر سننے میں نہیں آئی۔ ویسے بھی وہ فلمی دنیا چھوڑ گئی تھی اور جب کوئی اداکارہ فلمی دنیا چھوڑ جاتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کے بارے میں خبریں آنا بند ہو جاتی ہیں۔"

"کیا اس کی شادی ابھی تک کامیابی سے چل رہی ہے؟" ارشاد علی نے کچھ ایسی بے یقینی اور حیرت سے پوچھا جیسے روبینہ کی شادی بھی کمزور کہانی والی کوئی فلم تھی جو اتفاق سے ہٹ ہو گئی تھی اور طویل عرصے سے سینماؤں میں چل رہی تھی۔

"چل ہی رہی ہوگی تبھی تو اس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے..." احسان اللہ بے پروائی سے بولا: "ورنہ اب تک وہ انڈسٹری میں واپس آ چکی ہوتی۔"

فلم کا ہیرو خیال بولا۔ "لگتا ہے کسی نے بے چاری نائلہ کے ساتھ کوئی زیادہ ہی سنگین زیادتی کر ڈالی۔ چھوٹی موٹی زیادتیوں سے تو وہ دل برداشتہ ہونے والی نہیں تھی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا۔ اس لمحے وہ اپنی تمام تر وجاہت کے باوجود ندیا کو بہت بدشکل محسوس ہوا۔ ندیا نے اس کراہت کو دل سے نکالنے کی کوشش کی کیونکہ کچھ دیر بعد اسے' اسی ہیرو کے ساتھ محبت بھرا گانا عکس بند کروانا تھا۔

کچھ ایکسٹرا لڑکیاں بھی گانے کی عکس بندی میں حصہ لینے کے لیے یونٹ کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اسی بڑی سی ویگن میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ لوکیشن پر پہنچ کر وہ گاڑی سے اتریں تو ان میں سے ایک نے کنکھیوں سے ندیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ ایکسٹراؤں کی زندگی ہی قابل رحم ہوتی ہے لیکن اب پتا چلا کہ بڑی ہیروئنوں کے غم بھی کافی شدید ہو سکتے ہیں۔"

اس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھوں کے کھنڈروں کی ویرانی

کچھ اور بڑھ گئی۔ دوسری ایکسٹرا لڑکیاں بھی اس کے قہقہے میں شامل ہو گئیں۔ حالانکہ ہنسنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ندیا نے اکثر محسوس کیا تھا کہ ایکسٹرا لڑکیاں بات بے بات ہنستی تھیں۔ رونے والی باتوں پر بھی اکثر ہنسنے ہی لگتی تھیں اور ان کی ہنسی بے حد کھوکھلی ہوتی تھی' کراہ سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔

اسے یہ دیکھ کر ایک عجیب سا رنج اور شدید حیرت ہو رہی تھی۔ نائلہ کی خودکشی کی خبر کو کسی نے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی بلکہ گویا انہیں گپ شپ کے لیے کوئی چٹپٹا موضوع مل گیا تھا۔ کسی نے ذرا سی تشویش کا بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ نائلہ کی جان بچ گئی تھی۔ اگر وہ جان سے گزر جاتی' تبھی شاید اس واقعے کی کچھ اہمیت ہوتی۔ مگر ندیا کے ذہن سے گویا یہ خبر چپک کر رہ گئی تھی۔

عکس بندی کے دوران ندیا نے اس واقعے کو ذہن سے جھٹکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اسے بار بار نائلہ کا خیال آتا رہا۔ اس کا سانولا سلونا' شوخ وشنگ اور ہنس مکھ سا سراپا بار بار اس کی لوح خیال پر ابھرتا رہا۔

اس روز بھی عکس بندی زیادہ دیر تک نہیں ہو سکی۔ گو کہ سورج تو صبح سے ہی نہیں نکلا تھا لیکن سفید بادلوں کے عقب سے اس کی چمک نے ہی چاروں طرف بکھری ہوئی برف کو جگمگا رکھا تھا۔ تاہم جلد ہی اندھیرا چھانے لگا۔ سفید بادلوں کی جگہ سرمئی بادلوں نے لے لی۔ ایسے عالم میں روشنی کو منعکس کرنے والے نقرئی تختے بھی کوئی کام نہیں دے سکتے تھے' اس لئے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد یونٹ واپس آ گیا۔

اس کے بعد مسلسل تین دن کافی روشنی رہی اور ڈائریکٹر احسان اللہ نے گانوں کا تو کافی کام نمٹا لیا۔ تاہم گانوں کی عکس بندی مکمل ہوتے ہوتے ایک ہفتہ ہی گزر گیا۔ اس کے بعد ان لوکیشنز پر تین چار مختصر مناظر بھی تھے۔ ان کی عکس بندی چلتی رہی۔

اس روز سورج بڑی آب و تاب سے نکلا ہوا تھا جس روز ندیا کو اپنی زندگی اندھیرے کے سمندر میں اترتی محسوس ہوئی!

اس روز بھی وہ صبح صبح حسب عادت بستر میں سمٹی اخبار دیکھ رہی تھی کہ اسے

پہلے سے زیادہ شدید اور خوفناک جھٹکا لگا۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر خبر تھی کی فلمساز' ہدایت کار اور مصنف اعجاز حامد نے اداکارہ نائلہ سے شادی کر لی۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ جونہی اداکارہ نائلہ اسپتال سے گھر جانے کے قابل ہوئی اور پولیس نے رسمی تفتیش کے بعد اس کا پیچھا چھوڑا' اسی دن اعجاز نے اس سے شادی کر لی تھی۔ یہ شادی کافی حد تک ہنگامی طور پر ہوئی' تاہم نائلہ کے گھر خاصی رونق رہی۔ بارات بھی خاصی دھوم دھام سے آئی تھی اور کم سے کم وقت میں دونوں فریقوں نے کافی رنگا رنگ تیاریاں کر لی تھیں جن میں فلمی دنیا کے زندہ دل مردوں اور عورتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ نائلہ نیم صحت مندی کے عالم میں بھی دلہن بن کر اعجاز کے گھر چلی گئی تھی۔

نائلہ نے اخبار نویسوں کو بتایا تھا کہ وہ کم از کم ایک ماہ تک کسی فلم کی عکس بندی میں حصہ نہیں لے گی۔ خبر میں لکھا تھا کہ شادی کی تفصیلات قارئین دو دن بعد فلم ایڈیشن میں پڑھ سکیں گے لیکن ندیا تو اتنا کچھ ہی بڑی مشکل سے پڑھ سکی تھی۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی جا رہی تھیں۔ اگر فریدہ بھی اسی کمرے میں دوسرے بیڈ پر موجود نہ ہوتی تو شاید ندیا پھوٹ پھوٹ کر روتی اخبار میں شادی کی تصویر بھی چھپی تھی۔ ورنہ وہ یہی سمجھتی کہ اخبار والوں نے پھر بے پر کی اڑائی ہو گی۔ وہ یہی فرض کر کے دل کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتی کہ محض افواہوں کا سہارا لے کر بھی اخبار والے فلمی لوگوں کے بارے میں ایسی خبریں چھاپ دیتے تھے۔

وہ بہت دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ اس کے آنسو اندر ہی اندر اس کے دل کی زمین میں جذب ہو گئے اور اس کے اندر کی دنیا میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ وہ حیرت سے سوچ رہی تھی کہ لاہور سے اس کی چند دن کی عدم موجودگی میں ہی کیا یہ سب انقلابات آنے تھے؟ اتنے سے دنوں میں وہاں نہ جانے کیا کیا حادثے بیت گئے تھے... اور یہ شادی تو بالکل ایک معما ہی تھی۔ پہلے نائلہ کا خودکشی کی کوشش کرنا... اور اس کے دو تین روز بعد ہی اعجاز سے اس کی شادی... ! کیا وہ خودکشی بھی شادی ہی کے

سلسلے کی ایک کڑی تھی ؟ کیا نائلہ بہت پہلے سے اعجاز سے شادی کرنا چاہتی تھی اور کوئی اس راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا؟ کیا اس کی خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد وہ رکاوٹ راستے سے ہٹ گئی تھی ؟

ان میں سے کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ لاہور واپس جاکر ہی ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

فریدہ اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے کے لئے جانے لگی تو ندیا نے حتی الامکان ہموار لہجے میں اسے اعجاز کی شادی کے متعلق بتایا۔ اس نے خود اخبار لے کر بغور خبر پڑھی۔ اس کے چہرے پر جیسے اندر سے طمانیت جھلک آئی۔ شاید یہ طمانیت اپنا آشیاں بچ جانے اور بجلی کسی دوسری کے آشیاں پر گر جانے کی تھی۔

"معلوم نہیں وہاں کیا چکر چل رہا ہے۔" بالاخر فریدہ اخبار بستر پر پھینکتے ہوئے بولی۔ "پہلے نائلہ نے خودکشی کی کوشش کی' پھر اعجاز سے شادی کرلی۔ ان کی تو آپس میں کوئی 'کنٹی نیوٹی' بھی نظر نہیں آتی تھی۔"

"کنٹی نیوٹی" فلمی دنیا کی مخصوص اصلاح تھی۔ جب کسی مرد اور عورت کے درمیان رسم و راہ بڑھتی نظر آتی تھی' تو کہا جاتا تھا کہ ان کے درمیان "کنٹی نیوٹی" چل رہی ہے۔ کنٹی نیوٹی خواہ سات پردوں میں چلتی لیکن فلمی دنیا کے دوسرے لوگوں کو اس کا علم ہوتا تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ اس قسم کے اسکینڈل اکثر فلمی دنیا کے لوگوں ہی کے ذریعے اخبار والوں تک پہنچتے تھے۔ آپس کی کاروباری رقابتیں' منافقتیں اور چھوٹی چھوٹی شکایتیں عجیب رنگ دکھاتی تھیں۔ پیٹھ پیچھے بہت سے لوگ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹتے تھے' ٹانگ کھینچتے تھے لیکن ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ سجا کر ملتے تھے۔ ندیا کے خیال میں یہ صرف فلمی دنیا کا المیہ نہیں تھا۔ پورے معاشرے کا تانا بانا ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا۔

فریدہ کی بات کے جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔ خاموش بیٹھی سامنے والی دیوار کو گھورتی رہی اور جب فریدہ باتھ روم میں جا چکی تو اس نے کمبل میں منہ چھپا لیا اور

کمبل ہی کا ایک کونہ منہ میں ٹھونس کر اپنی چیخیں اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر تقدیر اس کے ساتھ ہی ایسا ظالمانہ مذاق کیوں کرتی تھی ؟ ابھی وہ خوابوں کے کسی تاج محل کی بنیاد ہی رکھتی تھی کہ کوئی ان دیکھا ہاتھ سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیتا تھا۔

غنیمت رہا کہ فریدہ خاصی دیر تک باتھ روم سے باہر نہیں آئی اور ندیا نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھال لیا۔ ناشتے کے بعد فریدہ کسی سے بات کرنے دوسرے کسی کمرے میں چلی گئی۔ ندیا نے جلدی سے فون پر آپریٹر سے کہا۔ "میں ڈائریکٹ ڈائلنگ پر لاہور بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے یہ نمبر ملا دیں ..." اس نے اعجاز حامد کے گھر کا نمبر دیا۔

"برف باری کی وجہ سے لائن میں گڑ بڑ ہے میڈم !" آپریٹر بولا۔ "بہرحال کوشش کرتا ہوں۔"

تقریباً" ایک گھنٹے بعد جبکہ وہ سب عکس بندی پر جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے اور فریدہ اتفاق سے دوبارہ کمرے سے باہر تھی' تب آپریٹر نے فون پر ندیا کو بتایا کہ نمبر مل گیا تھا۔ اس وقت وہ مایوس ہو کر کمرے سے نکلنے ہی لگی تھی۔ فریدہ باہر راہداری سے ہی کئی بار اسے بلا چکی تھی۔

آپریٹر نے لائن ملائی۔ دوسری طرف کوئی ملازم بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اعجاز حامد گھر پر نہیں تھا۔

"اور نائلہ بیگم ... ؟" ندیا نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

"صاحب دراصل انہی کو لے اسپتال گئے ہیں میڈم !" ملازم نے مودبانہ لہجے میں بتایا۔ "آج بیگم صاحبہ کا کوئی ٹیسٹ وغیرہ ہونا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی نا ... ابھی انہیں بہت احتیاط وغیرہ کرنی پڑتی ہے۔" پھر وہ قدرے رازدارانہ سے انداز میں بولا۔ "کوئی پیغام؟"

"بس میری طرف سے ان دونوں کو شادی کی مبارک باد دے دینا۔" ندیا نے

مضمحل لہجے میں کہا اور ریسیور رکھ کر باہر آ گئی۔

فریدہ سیڑھیوں کے قریب کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ندیا اپنے آپ کو گھسیٹتی اس کے ساتھ چل دی۔ نیچے بڑی وین میں سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ندیا چاہتی تو آج طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے عکس بندی ملتوی کرا سکتی تھی۔ آج اس کا کیمرے کے سامنے جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن یہ فرار شاید اس کے حق میں اور بھی برا ہوتا پھر تو شاید وہ اپنے آپ کو بکھرنے سے بالکل ہی نہ بچا پاتی ... اور پھر اب فرار کا فائدہ بھی کیا تھا؟

اپنی لاش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے' دل ریزہ ریزہ کو مٹھی میں دبائے' اس نے عکس بندی میں حصہ لیا۔ ہیرو کے ساتھ اس کا بڑا شوخی وطراری اور کچھ چھیڑ چھاڑ کا سین تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ڈائریکٹر کے خیال میں اس نے یہ سین بہت ہی اچھا عکس بند کرایا تھا۔ ری ٹیکس بھی بہت کم ہوئی تھیں۔

اس رات فریدہ کے خیال میں جب وہ لحاف میں منہ چھپائے سو رہی تھی تو درحقیقت وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیگ رہا تھا۔ کمرے میں گوکہ ہیٹر روشن تھا لیکن باہر کی یخ بستگی گویا اسکی روح میں اتر آئی تھی۔ آخر ایک دن عکس بندی ختم ہو گئی اور وہ لاہور واپس آ گئی۔ یہ وقت وقت کی بات تھی کہ اس عکس بندی کے لئے وہ بادل نخواستہ مری گئی تھی لیکن اب اس کا واپس آنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے گویا خود کو کھینچ کر واپس لائی تھی۔ ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ادھر سے ادھر ہی کسی اور دنیا کی طرف نکل جائے' مگر وہ کہیں بھی تو نہیں جا سکتی تھی۔ وہ اب اعجاز کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس سے بچ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ ابھی اعجاز کی فلم ادھوری تھی اور وہ اس کی فلم کی ہیروئن تھی۔

اس کی لاہور واپسی کے چار دن بعد اعجاز سے ملاقات ہو سکی۔ آتے ہی وہ بے پناہ مصروف ہو گئی تھی۔ کئی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اعجاز بھی شاید کہیں الجھا ہوا تھا۔ اس نے اگلی عکس بندی کے لیے تاریخیں لینے کے سے

میں بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ندیا رات کو تھکی ہاری پہنچی تھی تب بھی اس کا سونے کو دل نہ چاہتا۔ ڈیک پر المیہ نغموں کا کوئی کیسٹ لگائے' وہ کمرہ بند کر کے نیچی آواز میں سنتی رہتی اور کبھی کبھی بستر میں منہ چھپا کر رونے لگتی۔

اس روز وہ فریدہ کے ساتھ اسٹوڈیو کے اس برآمدے سے گزر رہی تھی جس کے ایک سرے پر اعجاز کا دفتر تھا۔ دفعتاً" سامنے سے اعجاز آتا نظر آ گیا۔ وہ اپنے دفتر ہی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور خاصا وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔

"ارے ندیا تم ...؟ مری سے آ گئی ہو اور تم نے اطلاع ہی نہیں دی۔" وہ بالکل نارمل لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں بس ہلکا سا دوستانہ شکوہ تھا۔

"میں نے سوچا شاید شادی کے ہنگامے سرد پڑنے پر آپ خود ہی ہمیں یاد فرمائیں۔" ندیا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ اس لمحے اس کی بڑی شدید خواہش تھی کہ وہ بھی اعجاز کی طرح نارمل نظر آئے اور اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنی اس کی کوشش میں کامیاب رہ سکے گی یا نہیں۔

"ارے ... شادی ... !" اس نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔ "شادی کے ہنگامے کیا ہونے تھے ... یہ شادی تو بجائے خود ایک ہنگامہ تھی ... بلکہ یوں کہو ہنگامہ تو شادی سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔"

پھر اسے جیسے کچھ خیال آیا۔ ذرا چونکتے ہوئے بولا۔ "یہاں کھڑے کھڑے تم نے یہ باتیں کیوں چھیڑ دیں۔ آؤ دفتر میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں کسی سیٹ پر پہنچنے کی جلدی تو نہیں ہے نا؟"

"سیٹ تو لگ چکا ہے .. لیکن خیر..." اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کوئی بات نہیں ... جس کا بھی سیٹ ہے' اسے تھوڑا سا انتظار کرنے دو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بڑی ہیروئن کے تھوڑے بہت نخرے تو ہونے چاہئیں۔ کبھی کبھی ہم بھی سیٹ

پر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔"

"صرف سیٹ پر ہی انتظار کرتے ہونا..!" ندیا نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے ہونٹوں سے جیسے کوئی سسکی' کوئی کراہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کاش حقیقی زندگی میں بھی تم نے میرا تھوڑا سا انتظار کیا ہوتا...!

وہ زبان سے یہ بات نہ کہہ سکی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' اس کے ساتھ چل دی۔ فریدہ بھی ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

دفتر میں پہنچ کر وہ بیٹھ چکے تو ندیا بولی۔ "آپ جلد باز آدمی لگتے تو نہیں ہیں لیکن شادی کے معاملے میں آپ نے بڑی پھرتی دکھائی۔" وہ اب بھی مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ارے ... بس ... سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔" وہ قدرے شرمیلے سے انداز میں ہنسا۔ "میرے بہت سے اچھے دوست اس شادی میں شرکت کرنے سے رہ گئے جن میں تم بھی شامل ہو۔"

صرف دوست ... ؟' ندیا نے خود استہزائی سے سوچا۔ تو میں تمہاری صرف دوست تھی ؟' وہ ایک بار پھر اندر ہی اندر رو دی لیکن وہ اس سے کوئی شکوہ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ اپنی انا کو بالائے طاق رکھ دیتی تب بھی اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ ان کے درمیان کون سا وعدہ ہوا تھا ؟ کس نے پیمان وفا باندھا تھا ؟ کس نے اقرار محبت کیا تھا ؟ کسی نے بھی تو نہیں۔

بس ایک خاموش نظر کا ناتا ہی تو تھا۔ ایسے ناتوں کا کیا ہے ؟ یہ تو خاموشی سے ہی ٹوٹ جاتے ہیں ... اور نظروں کا کیا ہے ؟ نظروں کی زبان پر کوئی زندگی کے فیصلے تو نہیں کرتا۔ کیا معلوم اس نے ندیا کی آنکھوں کے کھنڈروں میں اتر کر دیکھا بھی تھا! نہیں ؟ نظروں کے مفہوم کو کبھی سمجھنے کی کوشش کی بھی تھی یا نہیں ؟

ندیا نے اپنے زخم کی اذیت بھلانے کے لئے اپنے تجسس کو اپنی ڈھال بنا لیا اور خوشگوار لہجے میں بولی۔ "یہ شادی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ چکر کیا تھا؟"

"چکر کیا بتاؤں۔ مختلف لوگوں کے سامنے مختلف وضاحتیں کرتا پھر رہا ہوں۔ اصل کہانی صرف قریبی دوستوں کو سنائی ہے۔ سب سے مشکل کام پولیس والوں سے اس قصے کو بچانا تھا۔ پھر بھی انہیں بھنک پڑ ہی گئی ہے۔"

اس نے سگار سلگا کر گھومنے والی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور پر خیال انداز میں دھوئیں کے مرغولوں میں جھانکتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا۔

"ایک ملک کے بادشاہ سلامت ہمارے ملک کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ بادشاہ سلامت تو چھوٹے سے ملک کے بھی ہوں تو بڑی چیز ہوتے ہیں۔ وہ تو خاصے بڑے ملک کے بہت طاقتور قسم کے بادشاہ سلامت تھے۔ بین الاقوامی طور پر ان کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ ہماری حکومت ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بچھی جا رہی تھی۔ ان کے سامنے ایک خاص اور نجی قسم کی محفل میں رقص کرنے کے لئے نائلہ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی ..."

ایک لمحے کے توقف سے اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ نائلہ نے سرکاری طور پر ... حکمیہ انداز میں آئے ہوئے اس بلاوے پر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس نجی محفل میں رقص کے لیے آمادہ نہیں ہوئی۔ اس نے کہا ٹھیک ہے ... میں پبلک کے لئے ... سینما کی اسکرین کے لیے رقص عکس بند کراتی ہوں لیکن میں نجی محفلوں میں رقص نہیں کرتی۔ میں نے آج تک کسی کی نجی محفل میں رقص نہیں کیا۔ خواہ محفل کتنی ہی بڑی کیوں نہ رہی ہو اور وہاں کتنی ہی بڑی بڑی شخصیات کیوں نہ موجود رہی ہوں' اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ' اس محفل میں نہ جانے کیا کیا فرمائشیں کی جاتی تھیں ...

وہ سگار کا کش لینے کے لئے ایک لمحے کو خاموش ہوا تو ندیا اپنے تجسس کو نہ چھپا سکی اور بے تابی سے بولی۔ "پھر کیا ہوا؟"

"نائلہ نہیں مانی تو اسے زبردستی اس جگہ لے جانے کا حکم آ گیا۔ جب اسے گاڑی میں لے جایا جا رہا تھا تو اس نے راستے میں بہانے سے ایک میڈیکل اسٹور کے

سامنے گاڑی رکوائی۔ وہاں سے کبھی کبھار وہ ڈاکٹر کے نسخے کے مطابق خواب آور گولیاں خریدتی تھی۔ کبھی کبھار اسے ایک دو رات کے لئے ان کی ضرورت پیش آ جاتی تھی۔ لیکن اس روز اس نے جو شیشی خریدی' اسے راستے میں کھول لیا اور موقع پاکر اس کی ساری گولیاں نگل لیں۔"

"نتیجہ یہ کہ جو لوگ اس کا ہوش ربا رقص دیکھنے کے انتظار میں بیٹھے تھے' ان کے سامنے وہ اس عالم میں جاکر گری کہ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ نیلا پڑنے لگا تھا۔ تقریب کو بھول بھال کر ان لوگوں نے اسے نیم مردہ حالت میں اسپتال پہنچایا۔ اس خبر کو بڑی مستعدی سے دبانے کی کوشش کی گئی لیکن مجھ جیسے چند لوگوں کو بہرحال تفصیلات معلوم ہو ہی گئیں۔ میں مبہوت سا ہو گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس عورت میں اتنی انا' اتنی خودداری اور اپنی ذات کا احترام کرنے کا اتنا شدید جذبہ موجود ہوگا۔ وہ جان پر کھیل گئی مگر جھکی نہیں ..."

وہ سگار کا کش لینے کے لیے ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر دھواں اگل کر گہری سانس لے کر بولا۔ "بس ... اس کی یہ ادا مجھے مار گئی ۔ ہم جیسے دیوانے اور سرپھرے بس ایسی ہی کسی بات پر زندگی بھر کے فیصلے کر لیتے ہیں۔ میں اس کے پاس اسپتال پہنچا۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی مگر اس کا جسم ابھی نیلا تھا۔ اسی حالت میں' میں نے اسے شادی کی پیشکش کر دی۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ ارادے پگھلے ہوئے لوہے کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر انہیں فوری طور پر کسی سانچے میں نہ ڈھالا جائے تو یہ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور بے کار ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنا ارادہ اس کے سامنے بیان کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ اس کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس نے صرف ایک لمحے سوچا پھر کمزور سی آواز میں ہاں کر دی۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔" وہ بے معنی سے انداز میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔

ہاں ... اتنی سی کہاوت ہے مگر اس نے ایک بہت بڑی کہانی کا گلا گھونٹ دیا؟ ندیا نے سوچا۔

"وہ ایک ماہ مکمل آرام کرے گی۔ اس کے بعد صرف وہ فلمیں مکمل کرائے گی جو شروع ہو چکی ہیں۔ ان فلموں کے ایڈوانس واپس کر دے گی جو ابھی شروع نہیں ہوئیں۔ آئندہ وہ صرف میری فلموں میں کام کرے گی۔" اس نے گویا زندگی بھر کا پروگرام بتا دیا۔ اس کے لہجے میں خوشی تھی۔ کچھ پانے کی خوشی .. فتح کرنے کی خوشی ... !

ندیا اپنے لہجے میں شکست کی آہٹ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی: "بہرحال .. بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے فوری طور پر ایک جرات مندانہ فیصلہ کیا ... اور یہ فیصلہ ایک جرات مند عورت کے حق میں تھا۔ زیادہ سوچ بچار کرنے والے عموماً" خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔"

وہ فریدہ کے ساتھ باہر آ گئی اور ایک سیٹ پر جاکر عکس بندی میں مصروف ہو گئی۔ کوئی بھی نہ جان سکا کہ اس کے سینے میں شیشہ دل کس طرح بے آواز چھنا کے سے ٹوٹ گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے اس میں ایک تکلیف دہ تبدیلی یہ آئی کہ راتوں کو اسے نیند نہ آتی۔ وہ چھت پہ نظریں گاڑے' گھنٹوں چت لیٹی رہتی اور ان رت جگوں میں جانے کیوں اس کے بچپن کی پرچھائیاں بڑے تواتر سے اس کی آنکھوں میں لرزتی رہتیں۔ کبھی سفید چھت گویا سینما کی اسکرین بن جاتی اور اس پر بچپن کے بھولے بسرے مناظر کی دھندلی فلم چلنے لگتی۔

اپنے گاؤں کی گلیاں' اپنا گھر' اپنی ماں کی صورت' سب کچھ اسے بھول گیا تھا مگر ان کی پرچھائیں تو بہرحال ذہن پر ثبت تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس کی کوئی حقیقی ماں بھی تھی۔ نہ جانے ووہ کس حال میں ہوگی؟ یہ خیال آتا تو اس کا کلیجہ شق ہونے لگتا۔

شاید ماں کا خیال اس لئے شدت سے آنے لگا تھا کہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو بہت ہی زیادہ تنہا تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ تازہ تازہ ایک آرزو کا خون ہوا تھا اور دنیا میں کوئی بھی تو اپنا نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ رو لیتی اور وہ واقعی اس

کے دکھ کو سمجھ سکتا۔

اس کے خیالات کا محدود مرکز اب صرف ماں رہ گئی تھی۔ اس کی اپنی ماں ... حقیقی ماں ... نہ جانے کون سی غیبی طاقت اسے بتاتی کہ اس دنیا میں سب سے بڑی غمگسار صرف ماں ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس تو ماں کے نام پر صرف ایک بے نام سا ہیولا تھا۔ وہ اس ہیولے کو یاد کر کے روتی رہتی۔ نیند کے لیے وہ خواب آور گولیاں کھانے لگی تھی۔

ایک رات اسے گویا اپنے اپ پر اختیار نہ رہا۔ آدھی رات کو اٹھ کر وہ فریدہ کے کمرے میں پہنچی اور جھنجوڑ کر اسے جگانے کے بعد اس کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔

وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی اور بس یہی تکرار کئے جا رہی تھی۔ "مجھے میری ماں سے ملا دو .. تمہیں خدا کا واسطہ ... صرف ایک بار مجھے میری ماں سے ملا دو۔"

فریدہ ہکا بکا رہ گئی۔ جب اس کے حواس ٹھکانے آئے تو بولی: "مجھے لگتا ہے تمہارے دماغ میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ تم بار بار بھول جاتی ہو کہ میں تمہاری ماں ہوں۔"

"مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے میری ماں کوئی اور تھی ..." وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔ "تم مجھے صرف ایک بار اس سے ملا دو۔ میں اس کے پاس نہیں رہوں گی۔ میں تمہارے پاس ہی رہوں گی اور اسی طرح زندگی بھر تمہارا حکم مانتی رہوں گی۔ میرے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے جو صرف ماں سے مل کر بجھے گی۔ تم صرف ایک بار مجھے اس سے ملا دو۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گی۔ اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ..."

اس کی بہت دیر کی گریہ زاری سے شاید فریدہ کا دل پسیج گیا یا پھر شاید اس نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا: "اچھا ٹھیک ہے۔ فی الحال تم جا کر سو جاؤ۔ صبح اس موضوع پر بات کریں گے۔"

ندیا کچھ مطمئن ہو کر ایک نیا خواب آنکھوں میں بسائے واپس اپنے کمرے میں آ

گئی۔ اسے فوراً ہی نیند آ گئی۔

فریدہ کا خیال شاید یہی تھا کہ صبح تک ندیا کے سر سے یہ بھوت اتر جائے گا اور پھر مشینی سی زندگی کے معمولات میں الجھ کر وہ اس بات کو بالکل ہی بھول جائے گی مگر صبح اٹھتے ہی اس نے ندیا کو بڑے پر اشتیاق انداز میں اپنے انتظار میں بیٹھے پایا جیسے فریدہ بس ابھی اس کی انگلی پکڑے گی اور اسے ماں سے ملانے لے جائے گی۔

"لیکن ہمیں تو آج شوٹنگ پر جانا ہے۔" فریدہ نے اسے یاد دلایا۔

"بھاڑ میں گئیں شوٹنگز" ندیا پاؤں پٹخ کر بولی۔

"میں اب ماں سے ملے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"دیکھو... تم بے جا ضد کر کے ہمیں سختی پر مجبور نہ کرو۔" فریدہ کڑے لہجے میں بولی۔ انداز دھمکی کا سا تھا۔

"تم بھی مجھے بغاوت پر مجبور نہ کرو۔" آج ندیا کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔

"میرا مطالبہ بالکل بے ضرر سا ہے۔ آخر اسے پورا کرنے میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟ مجھ سے جیسی چاہو قسم لے لو۔ جیسی چاہو تحریر لکھوا لو۔ میں اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اسے ساتھ لے آؤں۔ وہ اس گھر کے کسی کونے کھدرے میں پڑی رہا کرے گی۔ کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ اپنی اصلیت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ کوئی مطالبہ نہیں کرے گی' کسی سے کچھ نہیں مانگے گی' کسی پر بوجھ نہیں بنے گی' یہ میرا وعدہ ہے' میں یہ سب کچھ لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ اس سے زیادہ تمہیں کیا ضمانت چاہئے ..."

فریدہ جیسی گھاگ اور جہاں دیدہ عورت ان تمام تسلیوں کے باوجود بھلا ایسا خطرہ مول لینے کے لیے آسانی سے کہاں تیار ہو سکتی تھی۔ ہنگامہ اور بحث و تکرار بڑھی تو شیر خان چاقو لے کر اس کی طرف بڑھا اور درندے کی طرح غرایا۔ "میں ابھی اس کی گردن کاٹ کر قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔"

مگر آج ندیا خوفزدہ نہیں ہوئی۔ گردن تانے اس کے سامنے کھڑی رہی اور بولی۔

"تم سونے کے انڈے دینے والی مرغی کی گردن کیسے کاٹ سکتے ہو؟ میرے بغیر یہ سب ٹھاٹ باٹ کیسے چلے گا؟ بینک بیلنس میں مزید اضافہ کیسے ہوگا؟"

فریدہ بیچ میں آ گئی اور پوری قوت سے شیر خان کو پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔ "جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ پروڈیوسروں کا کروڑوں روپیہ اس پر لگا ہوا ہے اور ہمارا لاکھوں روپیا ان کے پاس پھنسا ہوا ہے۔"

پھر وہ ندیا کی طرف گھوم کر بولی: "تمہیں کیونکر یقین ہے کہ ہم تمہیں تمہاری ماں تک لے جا سکتے ہیں؟"

"تمہیں وہ جگہ ضرور یاد ہوگی جہاں سے تم لوگ مجھے لائے تھے۔ مجھے یقین ہے میرا گاؤں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تم چاہو اور کوشش کرو تو ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ تم ارادہ تو کرو۔" ندیا کے لہجے میں التجا تھی۔

"اچھا دیکھو... ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔" فریدہ گویا ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی: "وہاں پاس پاس صرف دو ہی گاؤں تھے۔ ایک گاؤں سے اس وقت ہم آ رہے تھے۔ اس سے تمہارا تعلق نہیں ہو سکتا۔ تمہارا تعلق یقیناً دوسرے گاؤں سے تھا' جو اس چھوٹے سے جنگل کے پیچھے تھا۔ ہم وہاں جاکر تمہاری ماں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں..."

"میں ساتھ چلوں گی۔" ندیا نے فوراً" لقمہ دیا۔

"چلو... خیر... تم بھی ساتھ چلو۔" فریدہ تحمل سے بولی: "لیکن چند شرطیں کان کھول کر سن لو' ان کی خلاف ورزی کی صورت میں تمہیں بڑا سنگین نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔" ندیا اس کی پوری بات سنے بغیر ہی بچوں کی سی معصومیت اور اشتیاق سے بولی۔

"تم نے اس وقت جذبات کی روانی میں آکر بڑے آرام سے خود ہی ہر بات ماننے کا وعدہ کر لیا ہے لیکن میں چاہتی ہوں تم واقعی اچھی طرح ان باتوں پر غور کر کے

مجھے جواب دو۔" فریدہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی: "تم واقعی کسی سے ذکر تک نہیں کروں گی کہ تمہاری اصل ماں کون ہے۔ اگر تم اسے یہاں لے بھی آئیں تو کسی سے ملواؤ گی نہیں۔ تم اس کے کہنے پر نہیں چلو گی۔ اس پر خرچ کرنے کے لیے زیادہ بڑی رقم نہیں مانگو گی۔ جو صحافی یا اتفاقاً" تم سے ملنے آتے رہتے ہیں یا اتفاقاً" اسٹوڈیوز میں مل جاتے ہیں' ان سے تم ہرگز ذکر نہیں کرو گی کہ تمہاری اصل ماں مل گئی ہے۔ یہ شرطیں تمہیں منظور ہیں؟"

"دل و جان سے منظور ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔ ہم اپنی گاڑی میں چلیں گے۔" فریدہ نے فیصلہ سنایا۔

ایک گھنٹے بعد ندیا اپنے کمرے سے نکلی تو اس طرح بنی سنوری ہوئی تھی جیسے لڑکی شادی کے بعد پہلی مرتبہ سسرال سے میکے جانے لگی ہو۔ اس نے ڈائمنڈ کا سیٹ پہنا تھا۔ بنارسی ساڑھی منتخب کی تھی۔ سنہرے سینڈل پہنے تھے۔ بالوں کا خوبصورت جوڑا بنایا تھا اور بہت اہتمام سے میک اپ کیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک جگمگا رہی تھی۔ آج وہ تیس برس کی جدائی کے بعد ماں سے ملنے جا رہی تھی۔

آج وجاہت کو بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا' کیونکہ جس وقت ندیا' فریدہ کے ہاتھ لگی تھی' اس وقت وجاہت ہی اس کے ساتھ تھا۔ ایک عرصے سے وہ گھر میں عضو معطل کی طرح پڑا تھا' اسے کوئی بیماری لگ گئی تھی۔ جس کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی لیکن آج اس کی ضرورت آن پڑی تھی۔

شیر خان' اشرف علی اور وجاہت' تینوں ہی کے چہروں پر ناگواری تھی لیکن حکم بہرحال فریدہ کا چلتا تھا۔ وہ پانچوں مرسیڈیز میں بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ شیر خاں نے سنبھالی۔ فریدہ اس کے ساتھ بیٹھی باقی تینوں افراد پیچھے بیٹھے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

سرگودھا کی سمت' تقریباً" سو میل سفر کرنے کے بعد وہ' فریدہ اور وجاہت کی مشترکہ رہنمائی میں ایک کچے راستے پر مڑے۔ اس راستے پر کئی فرلانگ چلنے کے بعد

ایک اجاڑ اور ویران مقام پر ایک چھوٹی سی ریلوے کراسنگ نظر آئی جس پر کوئی پھاٹک وغیرہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی آدمی نظر آ رہا تھا۔

اس کراسنگ سے وہ ریلوے لائن کے ساتھ بائیں طرف مڑ گئے۔ راستہ کچا' اونچا نیچا اور دشوار گزار تھا مگر ایئرکنڈیشنڈ مرسڈیز تمام ناہمواریوں کا مقابلہ کرتی ہوئی حتی الامکان آرام دہ طریقے سے رواں دواں تھی۔ آخر ایک مقام پر پہنچ کر وجاہت نے شیر خان کو گاڑی روکنے کی ہدایت کی۔ سامنے جنگل سا پھیلا نظر آ رہا تھا۔

وجاہت اور فریدہ کچھ دیر تک بغور گردوپیش کا جائزہ لیتے رہے آخر وجاہت فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "یہ ہے وہ جگہ ... جہاں تم ہمیں ملی تھیں۔"

اس ویران اور لق و دق مقام پر چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے ندیا کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس کے اعصاب پر ہیجان سا طاری تھا۔ اس ویرانے کی دھندلی دھندلی سی تصویر اس کے لاشعور سے ابھر آئی تھی۔ ویرانہ آج بھی ویرانہ ہی تھا... اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ دور افتادہ جگہیں شاید برسوں میں بھی تبدیل نہیں ہوتی تھیں۔ ویسی کی ویسی ہی رہتی تھیں۔ اسے امید سی نظر آنے لگی کہ اس کا گاؤں بھی شاید ویسا کا ویسا ہی ہوگا اور وہ اس طرح وہاں جا پہنچے گی جیسے ایک بہت طویل خواب دیکھ کر اپنے اصل کی طرف لوٹ آئی ہو۔

وجاہت بولا۔ "اب ہم اس جنگل سے گزر کر دوسری طرف چلتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' گاؤں اسی طرف ہے۔"

گاڑی ایک بار پھر ہچکولے کھاتی اور ادھر ادھر لہراتی آگے بڑھنے لگی۔ اس سے زیادہ شدت سے ندیا کا دل ہچکولے کھا رہا تھا۔ جنگل کے پیچ و خم میں راستہ تلاش کرتی گاڑی آخرکار دوسری طرف جا نکلی اور ندیا کا دل اچھل کر گویا حلق میں آ پھنسا۔

سامنے ایک میدان' ایک جوہڑ اور اس کے عقب میں گاؤں کے کچے پکے بے ترتیب سے مکانات دیکھ کر اس کے ذہن میں دھندلی پرچھائیاں گویا یک لخت روشن اور واضح ہو گئیں۔ گلی کوچے' چہرے اور مکانوں کے در و دیوار سب کچھ اسے یاد آنے لگا

تھا۔ تیس برسوں میں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

کیا چھوٹے چھوٹے دیہات بیسیوں برسوں میں بھی جوں کے توں رہتے ہیں؟ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی مگر اس کی آواز اس کی اپنی ذات کے کھنڈر میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے وجود میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ جیسے ٹائم مشین میں بیٹھ کر تیس برس پیچھے آ گئی تھی۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ مسرت کی انتہا تھی' کوئی انجانا خوف تھا یا پھر اعصاب کی شکست و ریخت تھی کہ اس کا دل بے تحاشا رونے اور زور زور سے چیخیں مارنے کو چاہ رہا تھا۔ اس کے جسم پر نہایت خفیف اور غیر محسوس سا لرزہ طاری تھا۔

اب وہ ان کی رہنمائی کر سکتی تھی۔ گاؤں کی گلیاں گندی' ناہموار اور کچی مگر کشادہ تھیں۔ مرسڈیز ہچکولے کھاتی ان گلیوں سے گزرنے لگی اور گلیوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ ننگ دھڑنگ سے بچے گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے اور تاریک شیشوں سے اندر جھانک جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ دو تین بچے پیچھے فینڈر پر لٹکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ندیا کو یاد آیا کہ جب وہ چھوٹی تھی تو ایسے ہی بچوں کی کسی نہ کسی ٹولی میں شامل ہوتی تھی۔

آخر' گاڑی اس گلی میں آن پہنچی جسے ندیا کے خیال میں اس کی گلی ہونا چاہئے تھا لیکن یہاں اپنا مکان تلاش کرنا اسے مشکل محسوس ہوا کیونکہ دوسرے مکانات جو نشانیوں کا کام دے سکتے تھے' ان کی حالت کافی بدل چکی تھی۔ پھر ایک مکان پر ندیا کی نظر جم کر رہ گئی اور اس نے مضطربانہ انداز میں شیر خان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔

"ہاں ... ہاں ... یہی میرا مکان ہونا چاہئے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ گوکہ اب وہ مکان نہیں' محض ایک کھنڈر رہ گیا تھا لیکن ندیا نے اسے پہچان لیا تھا۔ درحقیقت اس کے دل نے اسے پہچان لیا تھا اور گواہی دی تھی کہ وہی اس کا مکان تھا۔

اس کی بیرونی دیوار گر چکی تھی۔ صحن میں کھڑا بیری کا درخت آج بھی موجود تھا مگر اس کے گرد خزاں رسیدہ سوکھے پتوں کے انبار تھے۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ

امتداد زمانہ کی تاب نہ لا کر گر چکا تھا اور غالباً بارشوں سے بغلی دیوار کا کچھ حصہ بھی گر گیا تھا۔ اس جگہ سے کچی چھت کا کچھ حصہ بھی نیچے کو لٹک گیا تھا۔ گھاس پھونس سا ادھر ادھر رہا تھا۔

لگتا تھا کہ اب کوئی اس مکان کا خیال رکھنے والا موجود نہیں تھا جو اس کے زخم زخم وجود پر مرہم رکھتا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی! چھوٹے سے مکان کے اس کھنڈر میں گویا کوئی بھیانک آسیب پناہ گزیں تھا۔ اسے دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔

یہی مکان کبھی اس کے لئے دنیا کی محفوظ ترین جگہ تھی۔ ایک قلعہ تھا' ایک خوبصورت محل تھا جہاں ماں تھی اور ماں کے خوبصورت بازوؤں کا حصار تھا۔ مگر ماں کہاں تھی ...؟

وہ تنویمی سے انداز میں گاڑی سے اتر آئی اور ایک ٹک اس اجڑے دیار کو دیکھنے لگی۔ یہ ایک دنیا تھی جو اجڑ گئی تھی۔ آس پاس کے مکانوں سے عورتیں نکل آئی تھیں اور دروازوں پر کھڑی حیرت سے اسے اور اس کی مرسیڈیز کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کے زیورات کے ہیروں کی جگمگاہٹ گویا اتنی دور سے بھی ان کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ چند مرد بھی کچھ دور ٹولی بنا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی گویا قریب آنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آخر ندیا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ شاید اس کی آنکھوں میں جھلملاتی التجا کو پڑھ کر ایک معمر شخص آگے آیا اور ہچکچاتے ہوئے بولا: "کیا تم کسی سے ملنے آئی ہو بیٹی؟"

"بابا! یہاں ایک عورت رہتی تھی۔ کھڈیوں پر کام کرتی تھی ..." وہ اپنے آپ سے شرمندہ تھی کہ اسے ماں کا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ چھوٹے بچوں کو بھلا ماؤں کو نام سے پکارنے کی ضرورت ہی کہاں پڑتی ہے؟ لیکن وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کبھی کبھار دوسرے لوگ جب اس کی ماں کو پکارتے تھے تو کس نام سے پکارتے تھے؟

پھر اسے گویا اپنی ماں کی سب سے اہم نشانی یاد آئی۔ "بابا! برسوں پہلے اس عورت کی بچی کھو گئی تھی۔ اس کی ایک ہی بچی تھی ... اس عورت کا مکان یہی ہے نا۔"

"ہاں بیٹی! اس کا نام سروری تھا۔" معمر شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور تب ندیا کو یاد آ گیا کہ کھڈیوں پر کام کے دوران دوسری عورتیں اس کی ماں کو "سروری" کہہ کر ہی بلاتی تھیں۔

وہ بے چین ہو کر بولی۔ "ہاں بابا! میں سروری ہی کی بات کر رہی ہوں۔ وہ کہاں ہے؟"

"بچی کے کھونے کے بعد وہ تو نیم پاگل ہو گئی تھی بیٹی!" بوڑھے نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "راتوں کو اٹھ اٹھ کر گلیوں میں بچی کو پکارتی پھرتی تھی۔ کام دام اس نے چھوڑ دیا تھا۔ لوگ ترس کھا کر کھانا پانی پہنچا دیا کرتے تھے۔ پھر اس کے جگر میں معلوم نہیں کیا ہو گیا۔ حکیم صاحب نے علاج کی بہت کوشش کی مگر پھر انہوں نے بتایا کہ وہ کینسر ہے اور اس کا علاج ان کے بس کی بات نہیں ..." بڑے میاں تھوک نگل کر خاموش ہو گئے۔ "پھر کیا ہوا بابا؟" ندیا کے ہونٹوں سے سرسراتی سی آواز نکلی۔

"حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ سروری کو کسی بڑے شہر کے بڑے اسپتال میں داخل کرانا چاہئے... لیکن کون کراتا بیٹی؟ وہ بستر پر پڑی تڑپتی رہا کرتی۔ اس کا جسم بھی گل رہا تھا۔ سچی بات ہے کہ لوگ اس کے قریب جاتے ہوئے بھی گھبرانے لگے تھے ... اور پھر بیٹی... یہاں سب غریب لوگ ہیں۔ سب کو اپنے اپنے کام ہوتے ہیں۔ روزی کمانے کی فکر ہوتی ہے..." بڑے میاں کا لہجہ معذرت خواہانہ سا ہو گیا۔ "کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ بے چاری سروری کے منہ میں پانی ڈالنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ اس نے آخری وقت بہت تکلیف میں گزارا۔ ایک طرح سے تو اچھا ہی ہوا کہ قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔"

"اس مکان میں اب کوئی نہیں رہتا؟" ندیا نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں پوچھا۔

بڑے میاں نے جو کچھ کہا تھا' وہ اس سے دھیان ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ورنہ شاید اس کا کلیجہ شق ہو جاتا۔

"یہ سروری کے مرحوم شوہر کا مکان تھا۔ کسی کا اس پر کوئی حق نہیں بنتا۔ سروری نے بھی اس کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی تھی۔ اس لئے اسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا تھا۔" بڑے میاں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "مکان کو آباد رکھنے کے لیے شاید کوئی اسے امانت سمجھ کر اس میں رہ لیتا مگر اس کا بھی کسی کو حوصلہ نہیں ہوا۔ لوگ اس میں رہتے ہوئے ڈرتے تھے۔"

"آپ مجھے سروری کی قبر دکھا سکتے ہیں؟" ندیا نے التجائیہ لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" بڑے میاں نے بخوشی کہا۔

پچھلی نشست پر جگہ پیدا کر کے انہیں بٹھا لیا گیا اور ان کی رہنمائی میں گاڑی قبرستان پہنچی۔ نہایت مختصر سا قبرستان تھا جس کے گرد کوئی چار دیواری وغیرہ نہیں تھی۔ جگہ جگہ درخت اور جھاڑیاں موجود تھیں۔ دو ایک جگہ آوارہ کتے بھی پھر رہے تھے۔

سبھی گاڑی سے اتر کر بڑے میاں کی رہنمائی میں آگے بڑھے۔ بے ترتیب قبروں میں سے بیشتر دھنسی ہوئی تھیں۔ بعض جگہ صرف گڑھے ہی نظر آ رہے تھے۔ جو قبریں سلامت تھیں وہ بھی بے نشان تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر بڑے میاں رک گئے اور پریشانی کے سے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔ "یہیں ہونی چاہئے تھی۔"

پھر وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں ایک اور سمت میں مڑ گئے۔ وہ پر یقین اور پراعتماد ہرگز نہیں تھے۔ چند منٹ ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد آخر وہ رک گئے اور شرمسار سے لہجے میں بولے: "میرا خیال ہے بارشوں میں قبر برابر ہو گئی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا... ویسے بھی چھ سات سال گزر چکے ہیں اس بات کو..." ندیا نہ جانے کس طرح اپنے آنسو روکے ہوئی تھی' سرگوشی کے سے انداز میں بولی: "آیئے.... واپس چلیں۔"

وہ جتنے اشتیاق سے گاؤں آئی تھی' اب اسی تیزی سے واپس بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کسی انجانی' ان دیکھی سمت میں نکل جانا چاہتی تھی ... دور ... اتنی دور... کہ افق کو چھو سکے اور گھٹاؤں کی چادر اوڑھ کر کسی گوشے میں پناہ گزیں ہو سکے۔

بڑے میاں کو گاڑی میں بٹھا کر انہوں نے واپس گلی کے موڑ پر اتارا تو وہ گویا ہمت کر کے بولے۔ "بیٹی! سمجھ میں نہیں آ سکا تم کون ہو...!"

"میں ایک بھٹکتی ہوئی روح ہوں چچا میاں! خدا حافظ۔" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں ہی کہا۔ اس کے حلق سے آواز بمشکل نکل رہی تھی۔ وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر آ کر بیٹھ گئی' پھر اس نے گاڑی کا دروازہ بند کر لیا۔ گاڑی میں موجود چاروں افراد بالکل خاموش تھے۔

جونہی گاڑی ویرانے میں پہنچی' ندیا گھٹنوں میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ شیر خان لاتعلقی سے گاڑی چلاتا رہا۔ فریدہ نے ندیا کو کچھ دیر رونے دیا۔ اس نے غالباً جب یہ محسوس کیا کہ ندیا کے دل کا غبار نکل چکا ہو گا تو پچھلی سیٹ کی طرف جھک کر اس نے ندیا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "صبر کرو ندیا! قدرت کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" ندیا نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "قدرت کے کام ... ہونہہ! یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے بدبخت عورت! میں زندگی بھر نہ تو تمہیں معاف کروں گی اور نہ اپنے آپ کو..."

اس نے ہچکی سی لی اور بات جاری رکھی۔ "میں وہ سیاہ رو بیٹی ہوں جو دنیا بھر کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوتی رہی اور اس کی ماں دو گھونٹ پانی کے لیے ترستی رہی۔ بیٹی شاندار کوٹھی میں مخملیں گدوں پر سوتی رہی اور ماں اس جھونپڑی نما مکان میں کسی جھلنگا سی چارپائی پر ایڑیاں رگڑتی رہی۔ بیٹی لاکھوں کے زیور پہنے گھومتی رہی اور ماں کو شاید کفن بھی چندہ سے نصیب ہوا ہو... بیٹی کی ایک چھینک پر اسپیشلسٹ گھر آتے رہے اور ماں کو کسی خیراتی اسپتال سے بھی دوا نصیب نہ ہو سکی۔ تف ہے میری زندگی

پر ... ! میں شاید اس ناسور کو دل میں لے کر زندگی نہ گزار سکوں۔ میرا دل تمہیں ہر لمحے بددعائیں دے گا فریدہ بیگم ! میں خدا سے دعا کروں گی کہ تمہیں بھی ایسی ہی موت نصیب ہو جیسی میری ماں کو نصیب ہوئی...“

اس نے آج تک اس لہجے میں فریدہ سے بات نہیں کی تھی مگر کسی نے اسے سرزنش نہیں کی۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ گاڑی کچے راستے پر دھول اڑاتی بڑھتی رہی۔ کافی دیر بعد بظاہر اس کی حالت سنبھل گئی اور وہ ٹشو پیپر سے چہرہ پونچھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

اب وہ بالکل خاموش تھی لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر کیا طوفان کروٹیں لے رہا تھا !



شام ڈھلے وہ گھر پہنچے تو ملازم کی زبانی پتا چلا کہ کئی ہدایات کاروں کے فون آئے تھے۔ وہ ندیا کے بارے میں فکر مند تھے کہ وہ کوئی پیغام چھوڑے بغیر اچانک کہاں چلی گئی تھی۔ ندیا نے گویا یہ بات سنی ہی نہیں۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے مقفل کر لیا اور رات کو کھانے کے وقت بھی نہیں کھولا۔

دوسری صبح اس نے فریدہ کے بے حد اصرار پر دوروازہ کھولا اور بصد مشکل ناشتے کی میز پر آئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیر خان اور احسان علی بھی ناشتے کی میز پر موجود تھے۔

ناشتے کے بعد فریدہ اپنے لہجے کو حتی الامکان ہمدرانہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اگر تمہارا آج بھی دل نہ چاہ رہا ہو تو میں اسٹوڈیو فون کر دیتی ہوں کہ تم شوٹنگ کے لئے نہیں آؤ گی۔“

”میں اب اسٹوڈیو جاؤں گی ہی نہیں۔ کم از کم تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“

ندیا نے فیصلہ کن لہجے میں اعلان کر دیا : ”مجھے اپنی اس زندگی پر سخت ندامت ہے جو میں نے تمہاری فرمانبرداری میں گزار دی۔ میں چاہتی ہوں اب تم مجھے آزاد کر دو۔“

”آزاد ... ؟“ فریدہ نے حیرت زدہ نظر آنے کی اداکاری کی۔ ”ہم نے کیا تمہیں غلام بنایا ہوا ہے ؟ غلام کیا تمہاری طرح ٹھاٹ سے رہتے ہیں ؟“

”میں قیمتی پرندہ ہوں نا ؟ اس لئے مجھے سونے کے پنجرے میں رکھا جا رہا ہے۔

بہرحال اب تمہیں میری گردن سے غلامی کا نادیدہ طوق اتارنا ہوگا۔" ندیا کی آواز بلند ہو گئی۔ آج وہ گویا کسی سے مرعوب یا خوفزدہ ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔

شیرخان میز کے دوسری طرف سے انتہائی ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "فریدہ بیگم! یہ عورت اب بہت ہی فساد مچانے لگی ہے۔ ہمیں اس کا کوئی پکا بندوبست کرنا ہوگا ورنہ روز روز یہی چخ چخ رہے گی۔ اس کی سمجھ میں ہماری بات نہیں آتی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" احسان علی نے خونخوار سی نظروں سے ندیا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں اب ہڈیاں چچوڑنے والے تم جیسے کتوں سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔" ندیا بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "تم خواہ مجھے مار کر اسی کوٹھی کے کسی حصے میں دفن کر دو' یا میرے ساتھ کوئی بھی اور ظلم کر لو' تمہیں بہرحال اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

وہ چاروں خونخوار نظروں سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہے تھے مگر ندیا نے اسی بے خوف لہجے میں بات جاری رکھی۔

"میرے ذہن پر بچپن سے تم لوگوں کا خوف نقش ہو گیا تھا' اس لئے میں کبھی بغاوت کا نہیں سوچ سکی۔ ویسے بھی تم لوگوں نے میری تربیت اس انداز سے کی تھی کہ میں سہاروں کے بغیر ایک قدم بھی چلنے کی عادی نہ رہوں۔"

ایک گہری سانس لے کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "لیکن اب میں نے ہر خوف سے پیچھا چھڑانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں اب کسی کے سہارے' کسی کی ہدایت کے بغیر چلنا چاہتی ہوں' خواہ مجھے قدم قدم پر ٹھوکریں لگیں۔ میں آزادی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں' خواہ مجھے آزادی کے چند لمحے ہی میسر آئیں۔ میں اپنے بل پر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی زندگی خود بسر کرنا چاہتی ہوں... اور موت کے سوا اب کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے سب کو چند لمحے کے لئے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ پھر شیرخان اور احسان علی اپنی کرسیوں پر یوں کسمسانے لگے جیسے کچھ کر گزرنے کو بے چین ہوں۔

آخر فریدہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مربیانہ لہجے میں بولی۔ "ہم آج رات اس مسئلے پر حتمی بات کریں گے۔ اس وقت تک تم اپنے کمرے میں رہو اور ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کرنے کی کوشش کرو۔ بے شک تمہارا غم شدید ہے لیکن اس غم میں الجھ کر تم صحیح طرح نہیں سوچ رہی ہو۔ ہم اتنے برے نہیں ہیں جتنا تم نے فرض کر لیا ہے۔ کم از کم تمہارے لیے تو ہم ذرا بھی برے نہیں ہیں۔"

"ہو نہہ... !" ندیا نے استہزائیہ سے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر صرف اتنا کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ المیہ گانوں کی ایک کیسٹ لگا کر وہ بستر پر اوندھی گر گئی اور آنکھیں بند کر کے کسی اور ہی دنیا میں کھو گئی۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اسے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کب دن گزرا اور کب رات آئی' گھر میں کس کی کیا مصروفیت رہی' کون آتا رہا' کون جاتا رہا۔ وہ ان سب باتوں سے بے نیاز' اپنے کمرے میں مقید رہی۔ رات کا کھانا اس کے کمرے میں ہی پہنچا دیا گیا۔ پھر رات گئے وہ سب لوگ اس کے کمرے میں آئے۔ شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہاں بیٹھ گیا۔

بات فریدہ نے شروع کی۔ "ہم تم سے لاتعلق ہونے کو تیار ہیں لیکن بہرحال ہم نے تمہاری پرورش' تربیت اور نگہداشت کی ہے۔ تمہاری زندگی بنائی ہے... بلکہ یوں کہو کہ تمہاری زندگی بنانے کے لئے ہم نے اپنی زندگیاں تج دی ہیں۔ آج تم جس مقام پر ہو' ہماری ہی وجہ سے ہو۔ اگر تم جانا ہی چاہتی ہو تو تمہیں اس ساری تگ ودو کی کچھ قیمت تو ادا کرنی پڑے گی۔"

"کیا لینا چاہتی ہو؟" ندیا نے فوراً" پوچھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"سب کچھ ..." فریدہ نے بلا تامل جواب دیا۔ "تمہیں سب کچھ یہیں چھوڑ کر خالی ہاتھ جانا ہو گا۔"

سب کی نظریں ندیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ سب اس کے جواب کے منتظر تھے۔

ندیا نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا۔ روپیہ پیسہ کبھی اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں رہا تھا۔ شاید اس لئے اسے اس کی طاقت و اہمیت کا اندازہ نہیں تھا یا پھر شاید فطری طور پر ہی اس میں مال و متاع کا لالچ نہیں تھا۔

نہایت مطمئن انداز میں سر ہلا کر اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔ میں جانے کی تیاری کروں؟؟"

"اس طرح نہیں ... یہ اتنا سیدھا سادہ کام نہیں ہے۔ تمہیں کچھ کاغذات پر سائن کرنے ہوں گے۔" فریدہ بولی۔

پھر اس نے ایک فائل ندیا کے سامنے رکھ دی۔ قلم ندیا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس نے خود ہی فائل کھولی۔ سب سے اوپر عدالتی کاغذ پر ایک وکیل کے ذریعے تیار کیا گیا ایک اقرار نامہ تھا جس پر ندیا اور فریدہ دونوں ہی کی طرف سے دو دو گواہوں کے دستخط بھی موجود تھے۔ صرف ندیا کے دستخط کی جگہ خالی تھی۔

اقرار نامہ ندیا کی طرف سے تھا کہ وہ بغیر کسی جبر اور دباؤ کے اپنی منہ بولی ماں اور سرپرست فریدہ بیگم سے علیحدہ ہو رہی ہے اور اس کا کوئی لین دین، دعویٰ یا مالی تقاضا، فریدہ اور اس کے متعلقین کی طرف باقی نہیں ہے۔

ندیا نے صرف سرسری نظر سے اقرار نامہ دیکھ کر اس پر دستخط کر دیئے۔ اس نے اس کی لمبی چوڑی تفصیلات پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ جس کوٹھی میں وہ رہ رہے تھے، وہ ویسے بھی فریدہ نے اپنے نام سے خریدی تھی اور اسے بتایا تھا کہ ٹیکس کا کوئی چکر تھا جس کی وجہ سے کوٹھی اس کے نام سے نہیں خریدی جا رہی تھی۔

کسی اور علاقے میں اس سے کچھ چھوٹی اور ذرا کمتر درجے کی کوٹھی بھی فریدہ

نے خریدی تھی۔ وہ ندیا کے نام پر تھی لیکن اس کے سلسلے میں بھی اب فریدہ کے نام پاور آف اٹارنی کے کاغذات فائل میں موجود تھے۔

ندیا نے ان پر بھی دستخط کر دیئے۔ چیک بک میں تمام سادہ چیکوں پر بھی اس نے دستخط کر دیئے۔ فائل میں دو ٹرانسفر لیٹر بھی تھے جن کے مطابق وہ دونوں اچھی اور مہنگی گاڑیاں نہ جانے کن دو افراد کے ہاتھ فروخت کر رہی تھی۔

"تم چاہو تو چھوٹی گاڑی لے جا سکتی ہو۔" فریدہ نے گویا اس پر ترس کھایا۔

چھوٹی گاڑی بہت ہی چھوٹی تھی۔ بچوں کی گاڑی معلوم ہوتی تھی اور سیکنڈ ہینڈ تھی۔ وہ زیادہ تر استاد مکرم یا نوکروں کے استعمال میں رہتی تھی اور باہر کے کام کاج کے لئے مخصوص سمجھی جاتی تھی۔ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد ندیا نے دونوں ٹرانسفر لیٹر بھی سائن کر دیئے۔

"زیورات بھی میرے حوالے کر دو۔" فریدہ نے ملائمت سے کہا۔ "البتہ سونے کی یہ جو چھ چھ چوڑیاں تمہارے ہاتھ میں ہیں، یہ تم لے جا سکتی ہو۔" وہ گویا کمال فراخدالی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"نہیں ... میں یہ بھی نہیں لے جاؤں گی۔" ندیا نے چوڑیاں اتار کر نفرت سے فریدہ کے منہ پر دے ماریں۔ فریدہ کو یقیناً چوٹ لگی ہو گی مگر اس نے ذرا بھی برا نہیں مانا۔ شاید سونا چیز ہی ایسی تھی، اس سے لگنے والی چوٹ بھی راحت تھی!

ندیا اب بالکل تہی دست تھی لیکن جتنا ہلکا پھلکا وہ اس وقت خود کو محسوس کر رہی تھی، اتنا اس نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ گویا اس کا دوسرا جنم تھا۔ کوٹھیاں، کاریں، بینک بیلنس، سونا، ہیرے، موتی اگر اس کے پیروں کی زنجیریں تھیں تو وہ ان سے نجات پانے میں بھلا کیونکر تاخیر کر سکتی تھی؟

"آج کے بعد تم ہمیں اور ہم تمہیں بالکل بھول جائیں گے..." فریدہ پر سکون لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"اگر تم نے کبھی کوئی شوشہ چھوڑنے کی کوشش کی تو ان کاغذات کی مدد سے ہم

قانونی طور پر تو بچ ہی جائیں گے۔" اس نے فائل ہاتھ میں بلند کی۔ "لیکن اس قسم کی کسی کارروائی پر ہم تمہیں معاف نہیں کریں گے۔"

"میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔" ندیا بھی ہموار لہجے میں بولی۔ "کیونکہ میں زندگی میں دوبارہ تم میں سے کسی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ اور تمہارے حق میں بھی بہتر یہی ہوگا کہ آئندہ تم ایسی جگہوں پر جانے سے پرہیز کرو جہاں میرا تم سے سامنا ہونے کا امکان ہو۔ کوئی بھروسہ نہیں کہ مجھے کسی قسم کا دورہ پڑ جائے اور میں تمہارے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کر بیٹھوں۔"

"دورے تو تمہیں بہت عرصے سے پڑنے لگے ہیں۔" فریدہ طنزیہ لہجے میں بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس رات ندیا کو حیرت انگریز طور پر سکون کی نیند آئی گویا اس نے کچھ کھویا نہ ہو بلکہ بہت کچھ پالیا ہو۔ دوسری صبح اس نے ناشتے کے بعد اپنے خاص خاص کپڑوں کا ایک بڑا سا سوٹ کیس چھوٹی سی کھٹارا گاڑی میں رکھوایا اور اس گھر کے درودیوار پر الوداعی نظرڈالے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر باہر آ گئی۔

سب نے اسے خداحافظ کہا لیکن وہ جواب میں کچھ نہ بولی۔ گیٹ اسکے عقب میں بند ہوگیا تو اس نے کوٹھی کے کونے پر ہی گاڑی روک لی اور کھڑکی سے سر نکال کر دو تین گہری گہری سانسیں لیں۔ اسے یقین تھا کہ جیل سے نکلنے والے قیدی کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہوگی جو اس وقت اس کی تھی۔

جب اس نے گاڑی مزید آگے بڑھائی تو یک لخت ہی وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔ وہ کہاں جائے ... ؟ یہ سوال اس کے سامنے پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ اسے ہر جگہ فریدہ کا ہاتھ تھام کر جانے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اب وہ تنہا چلنا ہی بھول گئی تھی۔

اس کی حالت پر کٹے پرندے کی سی تھی۔ فضا [illegible] اس کے سامنے تھی مگر اڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے سامنے بے یقینی کا ایک تاریک سمندر تھا۔ لیکن پھر اس سمندر میں اسے ایک چھوٹا سا جزیرہ دکھائی دیا۔ یہ جزیرہ اسٹوڈیو تھا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسٹوڈیو چلی گئی۔ اسے اور کوئی راستہ صحیح طور پر معلوم ہی نہیں تھا یا پھر شاید اس کے لئے سارے ہی راستے اسٹوڈیو کی طرف جاتے تھے۔!

وہ اسٹوڈیو پہنچی تو اس کی حالت شاخ سے ٹوٹے ہوئے ایک پتے کی سی تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس قیامت سے گزر کر آ رہی تھی۔ اس عالم میں ایک لائٹ مین نے اسے بتایا کہ فلاں سیٹ پر اس کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ جہاں اس کی شوٹنگ شیڈول کے مطابق بہت ضروری تھی۔

اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھی۔ لیکن وہ سیٹ پر جا پہنچی اور اسکرپٹ دیکھ کر مکالمے یاد کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ کو کام میں الجھا کر سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس کی کیفیت کچھ اور تھی مگر اسے اداکاری اس کیفیت کے بالکل برعکس کرنا تھی' تاہم' یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بارہا ایسا ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے محسوسات پر بے حسی کا نقاب چڑھا کر ہدایت کار کی مرضی کے مطابق تاثرات دینے لگی۔

اپنے مناظر مکمل کرا کے وہ سب سے الگ تھلگ ایک نیم تاریک گوشے میں پرانے اور بوسیدہ سے صوفے پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ایک انجانے سے خوف نے ایک بار پھر اسے آن گھیرا تھا۔ دفعتا" ایک سانولا سا' میانہ قامت نوجوان اس کے قریب آیا اور ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بڑی ملائمت سے بولا۔ "آج آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں میڈم! اگر آپ برا نہ محسوس کریں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں' بات کیا ہے؟"

ندیا پہلے تو اسے پہچان ہی نہ پائی۔ اس کی ذہنی حالت اس وقت کچھ ٹھیک نہیں تھی لیکن پھر اسے یاد آگیا کہ وہ ایک دوسرے اسٹوڈیو کا میک اپ مین تھا جو زیادہ تر چھوٹے اداکاروں کا میک اپ کرتا تھا لیکن بعض اوقات مجبوری میں اسے بڑے اداکاروں کا میک اپ کرنے کے لئے یہاں بھیج دیا جاتا تھا۔

ندیا نے محسوس کیا تھا کہ جب بھی اسے اس میک اپ مین سے میک اپ کرانے کا اتفاق ہوتا تو وہ اس سے بڑی عقیدت' محبت اور احترام سے پیش آتا۔ وہ گویا اس کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ ندیا کو یوں لگتا جیسے فلمی دنیا سے باہر کے ان گنت لوگوں کی طرح وہ بھی اس کا ایک خاموش پرستار تھا۔

ندیا نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں پوچھا۔ "مجھ سے شادی کرو گے؟"

میک اپ مین جس کا نام ندیا کی یادداشت کے مطابق جاوید تھا' یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے اسے شبہ ہو کہ ندیا کا دماغ چل گیا تھا یا پھر وہ اس سے کوئی بہت ہی ظالمانہ سا مذاق کرنا چاہ رہی تھی۔

"یہ ... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟" وہ ہکلایا۔

"میں کسی فلم کا ڈائی لاگ نہیں بول رہی ہوں۔ میرے سوال کا جواب "ہاں" یا "نہ" میں دو۔" ندیا غیر متزلزل لہجے میں بولی۔

اس کے اندر کی کیفیت کو اس وقت کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی تو اب بھی چل رہی تھیں لیکن ایک نکتہ گویا سوچوں کا محور و مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ رہ رہ کر اسے یہی خیال آئے جا رہا تھا کہ جب بھی اس نے بہت سوچ سمجھ کر' سو دو زیاں کا حساب کر کے جیون ساتھی کا انتخاب کرنے کی کوشش کی تھی' ہمیشہ بازی ہی الٹ گئی تھی اسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔ جب بھی اس نے بہت احتیاط سے' سہم سہم کر اپنے لئے کوئی راستہ منتخب کرنا چاہا تھا اور ڈرتے ڈرتے اس پر قدم رکھا تھا' وہ لڑکھڑا گئی تھی یا اوندھے منہ گری تھی۔

اب اسے آنکھیں بند کر کے ایک چھلانگ لگانی چاہئے تھی۔ دیکھنا چاہئے تھا کہ قسمت کے سمندر کی تہ میں اس کے لئے کوئی موتی موجود تھا یا خالی سیپ ؟ یہ فیصلہ یکدم ہی کچھ اس طرح اس کی لوح ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا کہ اس نے بے ساختہ جاوید سے شادی کے بارے میں سوال کر دیا تھا۔ اسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی دکھائی

نہیں دے رہا تھا۔ اسے ایک ہاتھ کی ضرورت تھی جسے تھام کر وہ زندگی کے راستے پر چل سکتی۔ ورنہ اس کے سامنے گویا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

"مم ... میں ایک معمولی سا آدمی ہوں میڈم !" جاوید ہکلایا۔

"اس وقت میں بھی ایک معمولی سی عورت ہوں۔" ندیا سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "اس وقت میرے پاس اپنے نام کے سوا کچھ نہیں۔"

جاوید نے شاید اس کے الفاظ پر دھیان نہیں دیا۔ وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سر جھکا کر بولا۔ "اگر آپ سنجیدہ ہیں تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی میڈم !"

.... اور پھر اس کی شادی ہو گئی !

فلمی دنیا کی سپر اسٹار کی شادی اس طرح ہوئی کہ نہ تو شہنائیاں بجیں' نہ مہندی لگی اور نہ ہی گیت گائے گئے۔ اسٹوڈیو کے چند آدمی اکٹھے ہوئے جنہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی شادی کرنے لگی تھی' جس نے سنا' دم بخود رہ گیا۔ کئی افراد نے دبی دبی زبان میں اسے سمجھایا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہی تھی۔ مگر ندیا نے انہیں جھڑک دیا۔ نکاح خواں کو بلوایا گیا اور نکاح کے بعد مٹھائی تقسیم ہو گئی جو کسی فلم کی مہورت کے لیے آئی ہوئی تھی۔

پہلی رات جاوید اسے گھر نہیں لے گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے گھر والے بڑے تنگ نظر تھے اور وہ اتنی جلدی اتنی بڑی حقیقت کو قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ رفتہ رفتہ انہیں ہموار کرے گا۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ ندیا بالاخر اپنی کوٹھی کا ہی رخ کرے گی۔ لیکن جب ندیا نے اسے بتایا کہ وہ اپنی کتاب زندگی کے اس باب کو ہمیشہ کے لئے بند کر آئی تھی' تو وہ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ بات بہت مبہم تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ندیا نے گویا اسے تسلی دی۔ "رفتہ رفتہ سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

وہ رات انہوں نے جاوید کے ایک دوست کے گھر گزاری۔ دوسرے روز ندیا کو

ایک فلم کے معاوضے کی قسط ملی تو وہ ایک اچھے ہوٹل میں منتقل ہو گئی۔ پھر مزید رقم آئی تو انہوں نے ایک معقول علاقے میں چند ہزار ایڈوانس دے کر ایک کوٹھی کا چھوٹا سا حصہ کرائے پر لے لیا۔

اس کوٹھی میں منتقل ہوتے وقت جاوید کچھ چپ چپ سا تھا۔ ندیا نے گویا اس کے محسوسات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ''اسٹیٹس کی فکر تمہیں نہیں' مجھے ہونی چاہئے۔ اور مجھے فی الحال یہ فکر نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں' تم بھی مطمئن رہو۔ میں بہت جلد اپنی جنت دوبارہ تعمیر کر لوں گی۔ مانا کہ مجھے اب فلمیں کم مل رہی ہیں لیکن نئے سرے سے ایک چھوٹی سی جنت تعمیر کرنے کے لئے یہ بھی کافی ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

جس طرح عموماً" شوہر' بیویوں کو تسلیاں دیتے ہیں اس طرح ندیا' جاوید کو تسلیاں دے رہی تھی!

انہوں نے اپنی شادی کو راز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن چند دن بعد ندیا کو محسوس ہوا کہ اسٹوڈیو میں رونما ہونے والا کوئی بھی واقعہ اخبار نویسوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی شادی کی خبر بھی یکے بعد دیگرے سبھی اخباروں اور فلمی رسالوں میں چھپ گئی۔

وہ صحافی جو پہلے اپنی رپورٹوں اور کالموں میں قیاس آرائیاں کرتے رہتے تھے کہ وہ فلاں پروڈیوسر سے شادی کرے گی یا فلاں کارخانے دار سے ... وہ اس بے جوڑ اور قطعی غیر متوقع شادی پر انگشت بدنداں رہ گئے اور کاغذ' قلم' ٹیپ ریکارڈ وغیرہ سنبھال کر اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ انہیں امید تھی کہ اس واقعے کی تہ میں ضرور کوئی اسکینڈل پوشیدہ تھا۔ اندر ہی اندر یقیناً بہت پہلے سے کوئی رومانس پرورش پا رہا تھا۔ جس کی انہیں خبر نہیں ہو سکی تھی۔

ان سب کے سوالوں کا ندیا کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ''مجھے سہارے کی ضرورت تھی' اس لیے میں نے شادی کر لی۔''

''ہیروئنیں تو عام طور پر زمینداروں' کارخانے داروں یا کروڑ پتی تاجروں سے

شادیاں کرتی ہیں مگر آپ نے ... ؟'' صحافی اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیتے۔ وہ اس کے شوہر کے لئے معمولی میک اپ مین کے الفاظ استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے۔

''میں بیوی بن کر رہنا چاہتی تھی ... کھلونا بن کر نہیں۔'' وہ جواب دیتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے از خود صحافیوں کو اس حد تک جواب دینا آ گیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو وہ فریدہ کی موجودگی کے بغیر اپنے آپ کو صحافیوں کا سامنا کرنے کے قابل ہی نہیں سمجھتی تھی۔

آخرکار اس موضوع سے اخبار نویسوں کا دل بھر گیا اور انہوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

ایک روز ندیا کو اسٹوڈیو سے ذرا جلدی فرصت مل گئی اور وہ سرِشام ہی گھر لوٹ آئی۔ جاوید ابھی نہیں آیا تھا۔ جاوید کی اور اس کی فلمی مصروفیات مختلف تھیں۔ اکثر وہ الگ الگ آتے جاتے تھے۔ ابھی تک انہیں کوئی ملازم یا ملازمہ بھی میسر نہیں آئی تھی۔

ندیا خود ہی بڑے چاؤ سے رات کے لئے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ اس وقت چھوٹی سی ٹیرس پر کرسی ڈالے بیٹھی تھی اور اناڑی پن سے آہستہ آہستہ پیاز کاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور وہ وقفے وقفے سے آستین سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

اچانک ایک عورت سیڑھیوں کے راستے اوپر آ گئی۔ ایک لمحے کے لئے تو ندیا خوفزدہ سی ہو گئی۔ عورت عجیب سی نظروں سے اسے اور گھر کے درودیوار کو دیکھ رہی تھی۔ وہ فربہی مائل ایک گوری چٹی مگر سپاٹ سی عورت تھی۔ کس کر چٹیا باندھنے کی وجہ سے اس کے بال سر سے چپکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہو گی۔

''کون ہو تم؟'' آخر ندیا سنبھل کر بولی۔

عورت اس کے سوال کو ان سنا کرتے ہوئے سر ہلا کر استہزائیہ سے لہجے میں

بولی۔ ”تو یہ ہے مشہور فلم اسٹار ندیا کا گھر... ! بڑی مشکلوں سے ڈھونڈتی ڈھانڈتی اور پوچھتی پاچھتی پہنچی ہوں۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم کسی بہت عالیشان کوٹھی میں رہتی ہوگی اور معلوم نہیں تمہارے نوکر چاکر مجھے اندر بھی جانے دیں گے یا نہیں۔“

”لیکن تم کیوں مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی ہو؟ کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟“ ندیا کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

”جاوید بہت دن سے گھر نہیں آیا۔ شادی کی خبر تو میں نے بہت دن پہلے اخبار میں پڑھ لی تھی۔ میں نے سوچا' چلو اسے کچھ دن مشہور ہیروئن کے ساتھ عیش و عشرت سے گزار لینے دو۔ آخرکار خود ہی واپس آ جائے گا۔“ اس کے لہجے کی کاٹ ندیا کا دل مجروح کر رہی تھی۔

”مگر تم ہو کون۔“ وہ ”تقریباً“ چلا اٹھی۔

”جاوید کی بیوی۔ اس کے دو بچوں کی ماں۔“ عورت نے الفاظ یوں ادا کئے گویا ندیا کے منہ پر تھوکنا چاہا ہو لیکن پھر اپنی نفرت کو صرف لفظوں میں سمونے پر اکتفا کیا ہو۔ ندیا اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

”لیکن اس نے تو.... مجھے نہیں بتایا تھا... کہ وہ شادی شدہ ہے۔“ ندیا کے منہ سے آواز سرگوشی کی سی صورت میں نکلی۔

”یہ تم ایکٹرسوں ہی کا حوصلہ ہوتا ہے کہ ان مردوں سے بھی شادی کر لیتی ہو جن کے خاندان وغیرہ کے بارے میں تمہیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔“ عورت زہریلے لہجے میں بولی۔

”میں چاہتی تو واویلا مچا سکتی تھی۔ بہت کچھ کر سکتی تھی' کیونکہ جاوید نے یہ شادی مجھ سے اجازت لیے بغیر۔ حتیٰ کہ مجھے اطلاع تک دیئے بغیر کی ہے... لیکن میں خاموش رہی کیونکہ میں عزت دار عورت ہوں۔ میں بچوں کی زندگی خراب کرنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی تھی کہ تم نے اچھا نہیں کیا...“

اسے شاید صرف اتنا ہی کہنا تھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ تیزی سے مڑی اور

سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ ندیا اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی۔

”میں عزت دار عورت ہوں!“ اسے عورت کے الفاظ یاد آئے۔ گویا اس کی نظر میں ندیا کی کوئی عزت نہیں تھی۔

اس کا دل چاہا کہ پیاز کاٹنے والی چھری اپنے سینے میں اتار لے۔ بہ مشکل اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ خود کو سمجھایا کہ اب اگر وہ اپنی ذمے داری پر زندگی کے میدان میں اتر ہی آئی تھی تو اسے زندگی کی جنگ حوصلے سے لڑنی تھی۔ پسپا نہیں ہونا تھا۔ رسوائیاں مول نہیں لینی تھیں۔ اپنے فیصلے اگر اب وہ خود کرنے لگی تھی تو ان کے صحیح یا غلط ہونے کے نتائج بھی اسے خود ہی بھگتنا تھے۔ اگر اس سے غلطی ہو ہی گئی تھی تو اس کا چرچا نہیں ہونے دینا تھا ورنہ شاید اس سے پے در پے غلطیاں ہی سرزد ہوتی جائیں۔ اسے اپنی غلطی کو نبھانا تھا۔ عزت اسی میں تھی۔

وہ کسی نہ کسی طرح اس گھاؤ کی اذیت کو پی گئی۔ رات کو جاوید گھر آیا تو اس نے ایک سلیقہ شعار گرہستن عورت کی طرح کھانا پیش کیا۔ کھانے کے بعد چائے نوشی کے دوران وہ سرسری لہجے میں بولی۔

”آج تمہاری بیوی آئی تھی۔“

جاوید کے ہاتھ میں کپ ایک لمحے کے لیے کھنکھنایا مگر وہ بھی عمدگی سے اس دھچکے کو برداشت کر گیا۔ ہموار لہجے میں بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں یہ بات تمہیں نہیں بتا سکا... موقع ہی نہیں ملا... سب کچھ اس طرح اچانک ہو گیا... حالات ہی کچھ عجیب تھے... خیر... کیا کہہ رہی تھی وہ؟“

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ شاید اس کا اتنا زیادہ قصور نہیں تھا' قصور تو میرا اپنا تھا' ندیا نے سوچا اور افسردہ لہجے میں بولی۔ ”تقریباً“ وہی کچھ جو کوئی پہلی بیوی' کسی دوسری بیوی سے کہہ سکتی ہے۔“

جاوید نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نپے تلے سے لہجے میں بولا۔ ”مایوسیوں کی بات مت کرو۔ مایوسیاں تو مجھے بھی شاید کئی انداز کی ہوئی ہوں۔“

ندیا کی دھڑکن رکنے سی لگی۔ جاوید اتنا معصوم یا سیدھا نہیں تھا جتنا اسے پہلے دن نظر آیا تھا۔ وہ خاموش رہی وہ اپنے فیصلے پر قائم تھی۔ اسے اپنی غلطی کو نبھانا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ ندیا نے از سر نو اپنی دنیا کی تعمیر شروع کی لیکن جدوجہد کے میدان میں وہ اب بھی اکیلی تھی۔ جاوید نے کام چھوڑ دیا تھا۔ بقول اس کے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ اتنی بڑی ہیروئن کا شوہر معمولی تنخواہ پر گھٹیا سے میک اپ روم میں چھوٹے چھوٹے اداکاروں اور اداکاراؤں کے بال تراشے .... چہرے سنوارے۔

کچھ عرصے وہ کرائے کے مکان میں رہے۔ کچھ روپیہ جمع ہوا تو ندیا نے ایک خاصی بڑی مگر نامکمل کوٹھی خرید لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جوں جوں رقم آتی جائے گی' وہ اسے اپنی خواہشوں اور اپنی امنگوں کے مطابق مکمل کرائے گی۔

رفتہ رفتہ کار اور زندگی کی دوسری آسائشیں بھی آ گئیں۔ جاوید عمدہ لباس پہننے لگا اور اپنی الگ کار میں گھومنے لگا مگر اس نے کوئی کام شروع نہیں کیا۔ ان کے ہاں ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ ندیا کے پاس فلمیں اب گو کہ بہت کم رہتی تھیں پھر بھی اتنی مصروفیت ضرور رہتی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

بعض اوقات اسے یوں لگتا جیسے اس کا بچہ کچھ زیادہ ہی تیزی سے بڑا ہو رہا تھا۔ وہ عام بچوں سے کچھ زیادہ ہی ذہین' حساس اور الگ تھلگ سا بھی تھا.... پانچ سال کی عمر میں اس کا یہ حال تھا کہ اگر کبھی ندیا اسے اپنے ساتھ اپنی ہی کسی فلم کے افتتاحی شو میں لے جاتی تو وہ پردے پر ندیا کو کسی اداکار کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے دیکھ کر روٹھے روٹھے سے لہجے میں کہتا۔ "ممی! آپ ایسا نہ کیا کریں مجھے برا لگتا ہے۔"

ایسے وقت مستقبل کے تصور سے ندیا کا دل لرز اٹھتا۔ وہ وحشت کے عالم میں سوچا کرتی کہ آج تو وہ بچہ چھوٹا ہے' کل کو بڑا ہوگا اور لوگ اسے ایکٹرس کا بیٹا کہیں گے تو وہ کیا سوچے گا؟ اس کے ذہن میں الٹے سیدھے خیالات تو نہیں آئیں گے؟

وہ سنجیدگی سے فلمی دنیا کو چھوڑنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ باہمی مشورے کے بعد اس نے جاوید کو کاروبار کے لیے روپیہ دینا شروع کیا۔ اسے خود تو ذرا بھی

کاروباری سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ وہ مسلسل روپیہ دیتی رہی اور جاوید اسے دلاسے دیتا رہا کہ جلد ہی کاروبار جم جائے گا لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔ وہ اپنی تقریباً" کل پونجی اس نادیدہ کاروبار میں جھونک بیٹھی۔

بعد میں کچھ لوگوں نے اسے بتایا کہ ان موٹی موٹی رقموں سے تو وہ اپنی پہلی بیوی کے مطالبے پورے کر رہا تھا۔ ادھر اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کچھ چھوٹی موٹی فلمی اداکارائیں بھی اس کے گرد منڈلانے لگی تھیں۔ کچھ روپیہ ان پر بھی خرچ ہوتا تھا۔

ایک روز اس نے سختی سے جاوید سے حساب کتاب کی بات کی تو وہ رکھائی سے بولا۔

"ٹھیک ہے ... کچھ رقم پہلی بیوی پر بھی خرچ ہوئی ہے بہرحال مجھے اس کا منہ بھی بند کرنا ہے ... اور پھر اس کا بھی مجھ پر کچھ حق بنتا ہے۔"

"تو تم اس کے حقوق میرے پیسے سے پورے کرو گے؟" ندیا ششدر رہ گئی۔

"اوہ ... " جاوید گویا ایک شدید صدمہ برداشت کرتے ہوئے بولا: "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے اور میرے پیسے الگ ہیں۔ بہرحال آج کے بعد سے میں ان تمام رقموں کو قرضہ سمجھوں گا اور جیسے ہی میرا کاروبار سیٹ ہوا' واپس کر دوں گا۔"

"اور وہ لڑکیوں کا معاملہ ... ؟" ندیا نے ہمت کر کے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ کبھی مجھے اس قسم کے گھٹیا الزامات کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔" وہ انتہائی ناگواری سے بولا۔ "تم دن رات اسٹوڈیوز میں مردوں کے ساتھ رہتی ہو۔ میں نے کبھی تم سے کچھ پوچھا؟ آخر میں بھی اسی دنیا کا کیڑا ہوں۔ کیا میں انڈسٹری کے ماحول کو نہیں جانتا؟ کیا میں تمہارے ماضی سے بالکل بے خبر ہوں؟"

تب ندیا کے سینے میں چھنا کے سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ شاید یہ اس کا دل تھا۔ اسے چپ سی لگ گئی۔ اس کی برسوں کی خود سوزی بیکار گئی تھی۔



ندیا کا ہاتھ تنگ رہنے لگا تھا۔ ادھر جاوید کا اب گویا اس سے دل بھر چکا تھا۔ اس

کہ ہر بات سے اکتاہٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی ہیروئن کا شوہر کہلانے کا شوق پورا ہو چکا تھا .... اور اب وہ بڑی ہیروئن رہی بھی کہاں تھی ؟ اب تو اسے کیرکٹر رول ملنے لگے تھے اور وہ انہیں قبول کرنے پر مجبور تھی۔

ایک دن ندیا ہفتے بھر کی آؤٹ ڈور شوٹنگ سے تھکی ہاری واپس آئی تو اسے ملازموں سے پتا چلا کہ جاوید صاحب لندن چلے گئے ہیں اور اب وہ وہیں رہیں گے۔ اس روز پہلی بار اس کے سینے میں درد اٹھا تھا!

ڈھائی تین ماہ بعد لندن سے جاوید کا خط آیا تو اس کے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے وہاں ایک اچھی نوکری مل گئی تھی اور اب وہ سنجیدگی سے اپنی زندگی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ حالات مناسب ہوتے ہی وہ اس سے ملنے آئے گا اور اگر ہو سکا تو وہ دونوں لندن میں ہی رہنے لگیں گے۔

جاوید کے جانے کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ ندیا سے اتنی رقمیں لینے کے باوجود اپنے پیچھے قرض خواہوں کی ایک قطار چھوڑ گیا تھا۔ ان میں سے کچھ کو ندیا نے نمٹانے کی کوشش کی اور کچھ کی دھمکیاں سنتی رہی۔ آمدنی اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ شادی اور بڑھتی ہوئی عمر نے دھیرے دھیرے یوں اس کی مارکیٹ ویلیو ختم کی تھی کہ اسے احساس تک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے اور مستقبل کو بچانے کی کوئی تدبیر ہی نہیں کر سکی تھی۔ اس نے اچانک ہی گویا اپنے آپ کو دلدل میں پایا تھا۔

فلمساز اور ہدایت کار وغیرہ اب اس سے وعدے زیادہ کرتے تھے اور معاہدے کم۔ نئی لڑکیاں فلمی دنیا پر چھا چکی تھیں۔ اس کے ساتھ کی بیشتر اداکارائیں شوبزنس میں محض اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ بعض کے حالات اس سے بھی زیادہ خراب تھے۔ ندیا کو کیرکٹر رول بھی ملنے بند ہو گئے تھے کیونکہ اس کی پبلک ریلیشنگ اچھی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح بڑی سرد مہر، کم گو اور اپنی ہی دنیا میں مگن رہنے والی عورت تھی۔ وہ دفتر دفتر نہیں پھر سکتی تھی۔

فلمی دنیا کے طور طریقے اب بدلتے جا رہے تھے۔ گو کہ پہلے بھی وہاں سارے

کے سارے خاندانی اور شرفا قسم کے لوگ نہیں تھے۔ پھر بھی اس دنیا کے اپنے کچھ ضابطے‘ چھوٹے بڑے کا احترام اور کچھ وضع داریاں تھیں لیکن اب نو دولتیوں اور مشکوک دھندوں والوں نے بھی کالا دھن کھپانے کے لئے فلم نگری کا رخ کر لیا تھا۔ ان کے انداز ہی نرالے تھے۔ کمزور پڑتی ہوئی اور ابھرتی ہوئی‘ دونوں ہی طرح کی اداکاراؤں کے خریدار بہت تھے..... لیکن فلموں کے لئے نہیں۔!

ندیا فلمی دنیا سے کٹتی جا رہی تھی پہلے لوگ اس کا نام سن کر چونکتے تھے۔ اب اس کا نام سن کر لوگوں کے چہرے سپاٹ رہتے تھے۔ اب کسی پرستار کا کوئی بھولا بھٹکا خط ہی اس کے نام آتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وقت واقعی اتنی تیز رفتاری سے بھی گزر سکتا تھا۔

آمدنی ختم ہو چکی تھی مگر اخراجات جوں کے توں تھے۔ ذریعہ آمدن نہ ہو تو قارون کے خزانے بھی ختم ہو سکتے ہیں۔ ندیا کے گھر میں تو خزانے ختم کرنے کا خاطر خواہ بندوبست بھی موجود تھا۔ نوکروں کی فوج اب بھی موجود تھی۔ ندیا جس کو بھی نکالنے کا سوچتی وہی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا اور ندیا کا اسے سختی سے جواب دینے کا حوصلہ ہی نہ پڑتا۔

گھر اس کی ضرورت سے بڑا تھا۔ اخراجات پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ زندگی کو منظم انداز میں گزارنے کا اسے پہلے بھی سلیقہ نہیں تھا اور اب تو وسائل ہی ختم ہوتے جا رہے تھے جن کی تنظیم کی جاتی۔ ادھر انکم ٹیکس والوں نے نہ جانے کون کون سے گڑے مردے اکھاڑ لئے تھے۔ لاکھوں روپیہ اس کے ذمے نکال دیا تھا۔ انہوں نے ازسر نو تخمینے لگائے تھے اور ان کے حساب سے ندیا کے پاس بہت روپیہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ اس زمانے کے بھی حسابات کھنگال رہے تھے جب وہ فریدہ کے ساتھ رہتی تھی۔

ندیا کا وکیل کہتا "آخر آپ اس زمانے کے حسابوں سے گھبراتی کیوں ہیں ؟"

"میں اپنی زندگی کا وہ باب بند کر چکی ہوں وکیل صاحب !" وہ کمزور سی آواز میں کہتی "میں نے وہ دروازہ کھولا تو نہ جانے کیسی کیسی خوفناک بلائیں مجھ پر جھپٹ پڑیں

گی۔ شاید آپ بھی سمجھتے ہیں کہ میں نے بلیک منی کہیں چھپا رکھی ہے ؟"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنستی۔ "میرے پاس تو اصل ٹیکس ادا کرنے کے لیے بھی رقم نہیں۔ انڈسٹری میں میرا لاکھوں روپیہ مارا بھی گیا ہے۔ محکمہ تو میرے ان کلیمز کو بھی درست تسلیم نہیں کر رہا۔ ان کو یقین ہی نہیں آتا کہ اداکاروں کے پیسے بھی مارے جاتے ہیں۔"

وکیل مشورہ دیتا۔ "آپ خود کسی سے ملیں ملائیں۔ آپ کا نام اب بھی بہرحال بڑی ویلیو رکھتا ہے۔ شاید لوگ کچھ لحاظ کریں ... اور کچھ نہیں تو شاید لاکھوں کے اس ٹیکس کی قسطیں ہی ہو جائیں۔

"میں قسطیں بھی کہاں سے دوں گی ؟" وہ ٹوٹتی سی آواز میں کہتی۔

اس کے علاوہ اب اس کا کسی کے پاس جانے کو' رحم کی بھیک مانگنے کو' دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ زندگی بھر بہ زبان خموشی' ہر ایک سے کچھ نہ کچھ مانگتی ہی آئی تھی۔ اسے اپنے آپ پر ترس آتا۔ بھکارن کہیں کی !

انکم ٹیکس کے علاوہ دوسرے کئی ٹیکس اور بل اپنی جگہ تھے۔ ادھر جاوید کے قرض خواہوں کے تقاضے بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک نے تو عدالتی کارروائی بھی شروع کر دی تھی۔ بچے کو اس نے مری کانونٹ میں داخل کرایا تھا اور اس کے بہتر مستقبل کی آس پر جی رہی تھی۔ نہ جانے کس طرح وہ اس کے اخراجات پورے کر رہی تھی مگر بچے کا طرز عمل بھی کچھ ایسا تھا کہ وہ چھٹیوں میں بھی گھر آنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے ایک بار اس نے انگریزی میں خط میں لکھا۔

"ممی ! میں چھٹیوں میں گھر نہیں آؤں گا۔ میرا آپ سے ملنے کو بھی دل چاہتا ہے لیکن کبھی کبھی میرا گھر آنے کو بالکل دل نہیں چاہتا۔ بلکہ جب سب بچے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں تو مجھے یہاں اکیلے رہنا اچھا لگتا ہے حالانکہ ہوسٹل والے مجھے جانے کے لیے کہتے ہیں اور میس بھی بند ہو جاتا ہے لیکن میں ایک چوکیدار کے گھر اس کی بیوی اور بچوں کے ساتھ کھانا کھا لیتا ہوں۔ شاید میرا یہاں اکیلے میں اس لے دل لگتا

ہے کہ اس وقت مجھے یہاں عجیب عجیب باتیں کہنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

ممی ! یہاں بہت بڑے بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں اور وہ ایکٹرسوں کے بارے میں خراب خراب باتیں کرتے ہیں۔ شاید یہ باتیں انہیں ان کے ماں باپ بتاتے ہیں۔ ممی ! کیا ایکٹرسیں واقعی اچھی عورتیں نہیں ہوتیں ...؟"

ندیا کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ بچے کو واپس بلا کر کسی عام سے اسکول میں داخل کرا دے لیکن پھر وہ سوچتی کہ بچے تو وہاں بھی ہوں گے۔ اور بچوں کا کیا ہے وہ تو کسی بھی لمحے' کسی کو بھی' کوئی بھی بات کہہ سکتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ دوسرے پر کیا گزرے گی۔

ندیا کے چاروں طرف اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد ایک بار پھر وہ اس مقام پر کھڑی تھی جہاں سے کوئی بھی راستہ کسی بھی سمت نہیں جاتا تھا حتیٰ کہ واپسی کی راہ بھی مسدود تھی۔ ایکٹنگ کے سوا اسے کچھ آتا ہی نہیں تھا کہ کوئی اور کام شروع کر کے بیٹھ جاتی جیسا کئی زوال پزیر اداکاراؤں نے کیا تھا۔ کسی نے بوتیک کھول لیا تھا اور کسی نے بیوٹی پارلر' کوئی کچھ اور کام کر رہی تھی۔ لیکن کام بھی تو پیسوں سے ہی شروع ہوتے تھے۔ یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔

کبھی کبھی وہ نوکروں پر برس پڑتی : "تم سب یہاں کیوں پڑے اینڈتے رہتے ہو ؟ کہیں اور کیوں نہیں جا مرتے ؟ یہاں کون سا اب اتنا کام رہ گیا ہے۔"

ملازم اور ملازمائیں یک زبان ہو کر کہتیں۔

"بی بی جی ! ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ ہم مرتے دم تک آپ کا ساتھ دیں گے۔ جو بات آپ کے گھر میں ہے' وہ کسی اور کے گھر میں کہاں ؟"

یہ حقیقت تھی۔ ندیا کے گھر میں انہیں کسی بھی بات پر کوئی پوچھنے والا نہیں تھا لیکن جب ان کی تنخواہوں میں بے قاعدگی بڑھتی گئی .... بقایا جات ملنے کی امیدیں معدوم ہوتی گئیں اور دسترخوان پر پکوانوں کی تعداد کم ہوتی گئی تو ایک ایک کر کے وہ

رخصت ہونے لگے۔

آخر میں صرف ڈرائیور رہ گیا۔ وہ بے چارہ واقعی اپنی بساط کے مطابق آخری حد تک اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا مگر پھر ہوا یہ کہ ندیا سے ایک جگہ گاڑی کا حادثہ ہو گیا۔ گاڑی کو خاصا نقصان پہنچا اور ندیا کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ پندرہ بیس ہزار روپے اس پر لگاتی۔ انشورنس کمپنی نے اس کا کلیم نہ مانا کیونکہ حادثہ اس کی غلطی اور غائب دماغی کی وجہ سے ہوا تھا۔

آخر ایک ڈیڑھ ماہ فارغ بیٹھ کر ڈرائیور بھی چلا گیا البتہ اس نے اتنا ضرور کیا کہ جاتے جاتے معذرت کر گیا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور اب اس کے لئے گزارہ ناممکن ہو گیا ہے۔ ندیا اس کی شکر گزار تھی کہ کم از کم وہ اطلاع دے کر تو گیا تھا ورنہ باقی ملازم تو چپ چاپ ہی ایک ایک کر کے غائب ہو گئے تھے۔

جاوید کے قلمی وعدے وعید جاری تھے لیکن اس نے پلٹنے کا نام نہیں لیا تھا۔

ندیا کے سینے میں اب اکثر و بیشتر ہی درد اٹھنے لگا تھا۔ اس درد کی وجہ سے ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ سب کی تشخیص اور ممکنہ وجوہ ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ندیا کو معلوم تھا کہ یہ درد کیسا تھا؟ بیماری کیا تھی ... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ طب کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا کیونکہ طب سے اس بیماری کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔

درحقیقت یہ تنہائی کا درد تھا جو شاید ازل سے اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ یہ وہ درد تھا جس کا علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔ اب اگر کوئی اس کی تنہائی دور کرنے کی خاطر اس کے پاس آکر بیٹھ بھی جاتا تب بھی وہ تنہا ہی رہتی تھی۔ اس تنہائی کی جڑیں اس کی ذات میں نہ جانے کتنی گہری چلی گئی تھیں۔

آج بھی وہ سینہ تھامے' پسینے میں ڈوبا جسم لئے' بستر پر پڑی تھی اور درد ذرا تھما تھا تو گزرے دنوں کی یہ کٹی پھٹی سی فلم اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی تھی۔

یہ گھر جو کبھی مجلس آرائی کا مرکز تھا' جہاں کئی یادگار ضیافتیں ہوئی تھیں'

جہاں لوگوں کے قہقہوں کے درمیان کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی' جہاں صبح شام صحافی چکر لگاتے تھے' وہاں آج کوئی نہیں تھا جو اسے پانی ہی پلا دیتا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ ہی رکھ دیتا۔ وہ سب غرض کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ ڈور ٹوٹی تو سب ایک ایک کر کے اڑ گئے۔

زمانے کے اس سارے تغیر سے اذیت ناک ایک اور درد تھا۔ انکم ٹیکس والوں نے اس کی کوٹھی کی نیلامی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اخباروں میں اشتہار بھی آ چکا تھا اور کئی دن پہلے اس کی کوٹھی کے صدر دروازے پر پوسٹر بھی چسپاں کر دیا گیا تھا کہ فلاں تاریخ کو کوٹھی کی نیلامی عمل میں آئے گی۔

اس کے پاس سر چھپانے کا صرف یہ ایک ٹھکانا ہی رہ گیا تھا۔ یہ ٹھکانا' یہ آشیانہ بھی ہاتھ سے جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے بچے کے لئے ورثے میں وہ صرف یہ کوٹھی ہی چھوڑ جائے تو شاید وہ کبھی اسے اچھے لفظوں میں یاد کر لیا کرے۔ اس نے صرف اسی ایک خواب پر قناعت کر لی تھی مگر اب یہ خواب بھی چکنا چور ہو رہا تھا۔

وہ کبھی کبھی کوٹھی کی چہار دیواری کی اوٹ میں لان پر بیٹھی ہوتی تو لوگ اس کے گیٹ پر چسپاں پوسٹر کو بہ آواز بلند پڑھتے ہوئے گزرتے ۔ کوئی ہنستا' کوئی تبصرہ کرتا' کوئی تمسخر اڑاتا۔ وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اندر اپنے بستر پر آ گرتی۔ اب کوٹھی کی نیلامی میں صرف دو دن باقی تھے۔

اس کی حالت ذرا سنبھلی تو وہ بیڈ روم سے نکل آئی اور دیواروں کا سہارا لیتی' لان کی طرف چل دی۔ راہداری کی دائیں طرف بڑا سا نامکمل ہال تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسے اصل ڈرائنگ روم بنائے گی۔ اس میں بیضوی صوفے' ایرانی قالین اور برما ٹیک کا فرنیچر ڈالے گی۔ دروازوں' کھڑکیوں پر جاپانی ویلوٹ کے پردے لٹکائے گی۔ دیواروں پر پلستر ہی نہیں ہو سکا تھا۔ بیچ میں اور کام نکلتے رہے تھے جو زیادہ ضروری لگتے تھے اور یہ کام کم اہم محسوس ہونے کی وجہ سے ملتوی ہوتے چلے آئے تھے اور آخر کار رہ ہی گئے تھے۔

سامنے اجڑا اجڑا سا لان تھا۔ مالی کے جانے کے بعد پانی نہ ملنے سے گھاس زرد ہو چلی تھی۔ لان کے وسط میں ایک نامکمل حوض تھا۔ ندیا کا ارادہ تھا کہ اس میں فوارہ اور اس کے گرد رنگ برنگے گلوب لگوائے گی۔ ان کے لیے پول تو لگ گئے تھے مگر گلوب نہیں لگ سکے تھے۔ فوارے کے لئے بھی صرف پلمبنگ ہو گئی تھی' موٹر نہیں لگ سکی تھی۔ رات کی رانی کے وہ پودے جو اس نے بڑی چاہت سے منگوائے تھے' بیمار غم کی طرح سوکھ چلے تھے۔ ہر کام ادھورا تھا۔ اس کی اپنی زندگی کی طرح ....!

تاہم' اس حالت میں کوٹھی خاصی قیمتی تھی مگر ندیا کو معلوم تھا کہ نیلامی میں وہ اونے پونے داموں جائے گی۔ نیلامی میں اس طرح کی چیزوں کو ہتھیانے کے لئے بڑی سازشیں ہوتی تھیں۔ ندیا کا اندازہ تھا کہ نیلامی سے جو کچھ ملے گا' وہ بھی شاید انکم ٹیکس والوں کے پاس ہی رہ جائے۔

لان کی ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے زخمی زخمی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ رینگ آئی۔ انسان آخر اتنی بھاگ دوڑ' اتنی تگ و دو کیوں کرتا ہے؟ وہ سوچ رہی تھی۔ سب کچھ تو آخر دنیا ہی کے حوالے کر کے جانا پڑتا ہے۔ طریقہ خواہ کچھ بھی ہو۔

اس کے کندھے کسی غیر مرئی بوجھ سے جھکے ہوئے تھے اور خدوخال پر صدیوں کی تھکن طاری تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس اندر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دفعتاً اس کی نظر ایک خمدار پول میں لٹکے ہوئے پنجرے پر پڑی۔ اس پنجرے میں اس کا پالتو طوطا بیٹھا تھا اور اداس سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ طوطا اس نے دو سال قبل خریدا تھا اور فارغ وقت میں بڑی محنت سے اسے بولنا سکھایا تھا۔ جب سے نوکر گئے تھے' وہ اسے اپنے ہاتھ سے دانہ دنکا روٹی کا ٹکڑا وغیرہ دیتی تھی۔ کبھی دل ٹکا ہوتا اور پریشانیوں کے احساس سے ذرا فرار ملتا تو وہ اسے چوری بھی بنا دیتی۔ روایات کے مطابق چوری اور میاں مٹھو کا چولی دامن کا ساتھ معلوم ہوتا تھا۔

پہلے یہ طوطا اکثر چہکتا رہتا تھا اور گھر کی ویرانی کی اذیت کم کئے رکھتا تھا مگر ندیا دیکھ رہی تھی کہ کئی دن سے وہ بھی چپ چپ تھا۔ ندیا جب بھی لان میں آکر بیٹھتی تو وہ یونہی پنجرے میں خاموش اور مضمحل سا بیٹھا' اداس اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔

آج سینے کے درد نے گویا ندیا کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ طوطے کو یوں مضمحل بیٹھے دیکھ کر وہ لرز گئی۔ وہ یقیناً" آزادی چاہتا تھا۔ ندیا خشک گھاس پر دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب پہنچی۔

"میاں مٹھو!" اس نے سرگوشی کی۔ "میں نے جن کے پیروں میں اپنائیت کی زنجیریں باندھ کر اس گھر میں رکھنا چاہا' جب وہی نہ رہے تو تمہارا کیا قصور ہے' جو پنجرے میں قید رہو... جاؤ... تم بھی جاؤ... خدا حافظ...." یہ کہہ کر اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسوؤں کو ضبط کرتی واپس اندر کی طرف دوڑ پڑی اس کوشش میں وہ گرتے گرتے بچی۔

بیڈ روم میں آکر اس نے تین خواب آور گولیاں کھائیں لیکن بستر پر لیٹ کر سونے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے آپ کو جگائے رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ مشق اس کے معمولات میں کچھ عرصے پہلے ہی شامل ہوئی تھی۔ ایک واقعہ اس کا محترک بنا تھا ورنہ پہلے وہ خواب آور گولیاں صرف سونے ہی کی غرض سے کھاتی تھی۔

ہوا یہ کہ ایک روز وہ سرشام دو گولیاں کھا کر سونے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ چند منٹ بعد کال بیل بج اٹھی۔ وہ نیند سے بوجھل آنکھیں بہ مشکل کھول کر سر جھٹکتی گیٹ پر پہنچی تو ایک اجنبی نوجوان کھڑا نظر آیا۔ نوجوان نے اپنی عینک کے عقب سے گہری نظر سے اس کا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے ایک غیر معروف سے اخبار کی کاپی اس کی خدمت میں پیش کی اور خاصے مودبانہ لہجے میں بتایا کہ وہ اس اخبار کا نمائندہ ہے اور اس کا انٹرویو کرنے آیا ہے۔

وہ اسے اندر لے آئی۔ اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر اسے پلائی۔ ادھر ادھر کی

باتوں کے بعد جب نوجوان نے کاپی قلم سنبھالا تو ندیا نے صاف اور سیدھے لہجے میں نہایت سادگی سے کہا۔ "میرے پاس اب کہنے کے لیے کوئی نئی بات نہیں رہی۔ آپ کو انٹرویو لینا ہے تو کسی اور ایکٹریس کے پاس چلے جائیں۔ خدا حافظ۔" وہ اٹھ کر بیڈ روم میں آ گئی۔

چند دن بعد اس نوجوان نے ڈاک سے اسے اپنا اخبار بھیجا جس میں اس کا انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ وہ انٹرویو جو اس نے دیا ہی نہیں تھا اور اس کی سرخی تھی۔ "اداکارہ ندیا نے پریشانیوں سے گھبرا کر نشے کی آغوش میں پناہ حاصل کر لی۔"

اس نے صرف سرخی پڑھ کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اسے ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ اب شاید اس میں غم' خوشی' غصہ' نفرت یا محبت ... کچھ بھی محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ بس اس نے ایک لمحے کے لئے یہ ضرور سوچا تھا کہ لوگ کتنے سطحی ہوتے ہیں' ظاہری باتوں سے کس طرح اپنی مرضی کے مطابق نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔

اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے وہ تھکے تھکے انداز میں مسکرا دی۔ اسی دن درحقیقت لفظ نشہ پہلی بار اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا اور اسی دن پہلی بار اس نے ایک تجربہ کیا تھا۔ اس نے دو خواب آور گولیاں کھائیں مگر سونے کے بجائے جاگتی رہی۔ اس کا سر عجیب سرور آمیز سے انداز میں گھومتا رہا۔ وہ گویا آسمان اور زمین کے درمیان کہیں معلق تھی۔ وہ جاگ رہی تھی مگر اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ اس عالم میں تفکرات کے سانپ اس کے ذہن کو نہیں ڈس سکتے تھے۔

یہ کیفیت اسے بہت اچھی لگی اور وہ روز ہی اس تجربے کو دوہرانے لگی۔ دن میں وہ اسی کیفیت میں جاگتی اور رات کو مزید گولیاں کھاکر سو جاتی۔ ان دنوں اگر کوئی اسے ملتا تو یہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ منشیات کی عادی تھی۔

دوسرے روز وہ سو کر اٹھی تو طبیعت میں کسلمندی کچھ کم تھی۔ کھڑکی سے صبح کی خوشگوار دھوپ جھانک رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں آئی اپنے لئے کافی کی ایک پیالی

تیار کر کے لان کی طرف چل دی۔ لان قدرے نشیب میں تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لینے لگی۔ اس کے ہاتھ میں خفیف سی لرزش تھی۔ سوچوں نے اسے گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔

وہ اپنے خیالوں میں گم تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا: "بی بی جی! میاں مٹھو کو چوری دو.... میاں مٹھو بھوکا ہے.... آپ کا میاں مٹھو بھوکا ہے ... آپ کا میاں مٹھو..."

کافی کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سیڑھی پر جا گری اور ٹوٹ گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھا' جدھر پنجرہ لٹکا ہوا تھا۔ پنجرے کا دروازہ بدستور کھلا تھا مگر میاں مٹھو اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر بھی اڑا نہیں تھا۔

ندیا اٹھی اور گرتی پڑتی پنجرے تک پہنچی۔ اس نے پنجرے کو سینے سے چمٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کون نادان لوگ تھے جنھوں نے طوطا چشم کی اصطلاح ایجاد کی تھی۔ طوطے نے تو اس برے وقت میں اس سے آنکھیں نہیں پھیری تھیں۔ آنکھیں پھیرنا یا آنکھیں ماتھے پر رکھنا تو انسان کا شیوہ تھا۔ اس اعتبار سے "انسان چشم" کی اصطلاح مشہور ہونی چاہئے تھی۔ بے چارے طوطے کو کیوں بدنام کیا جا رہا تھا۔

اس کے آنسو طوطے کے پروں پر گرے تو وہ بے چینی سے پھڑپھڑاتے ہوئے اپنی کرخت آواز میں تیزی سے بولنے لگا: "آپ کیوں رو رہی ہیں بی بی جی؟ آپ کیوں رو رہی ہیں بی بی جی....؟"

اس نے طوطے کو پنجرے سے نکالا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگی۔ وہ طوطے کو سینے سے لگائے بیڈ روم میں واپس آ گئی۔ اس کے سینے میں ایک بار پھر درد اٹھنے لگا تھا۔ شدت کرب سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ بیڈ پر دوہری ہو گئی۔ تکلیف اتنی بڑھی کہ دانتوں تلے دبے ہوئے ہونٹ سے خون رسنے لگا اور اس کا جسم پسینے میں نہا گیا۔

فون اس کے قریب ہی تھا۔ ایک بار اس نے ہاتھ بڑھایا کہ کسی طرح ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرلے اور اسے بلالے مگر پھر اس کا لرزتا اور رینگتا ہوا ہاتھ راستے ہی میں رک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار پھر اسے وہی نصیحتیں سننا پڑیں گی جو ڈاکٹر پچھلے ایک سال سے کر رہا تھا اور جن سے ندیا کو اب خوف آنے لگا تھا۔ اس کا ہاتھ راستے ہی میں رک جانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اسے یاد آگیا تھا اس کا فون عدم ادائیگی پر کٹ چکا تھا۔

وہ تکلیف کو ضبط کرتے ہوئے اپنے آپ کو ماضی کی یادوں میں الجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ طوطا اس کے بیڈ کے سرہانے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ ندیا کی آنکھوں کے سامنے دھیرے دھیرے اس کی پوری زندگی کی فلم چلنے لگی ....!



نیلامی کے لیے آنے والا بیلف چار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ کچھ متوقع خریدار بھی تھے۔ ایک ڈھول والا بھی ہمراہ تھا۔ وہ گاڑیوں سے اترے۔ نہایت اہتمام سے ایک چھوٹی سی میز اور کرسی کوٹھی کے گیٹ کے عین سامنے رکھی گئی۔ میز پر چند فائلیں رکھی گئیں۔ ڈھول والے نے کچھ دیر ڈھول پیٹا۔ راہ چلتے بہت سے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اچھا خاصا مجمع ہو جانے پر آخر نیلامی شروع ہوئی۔

پونے سات لاکھ پر نیلامی ختم ہو گئی۔ کچھ دیر تک دوسری کاغذی کارروائی ہوتی رہی۔ پھر ایک آفیسر نے گویا مجمع کو سنانے کے لئے کہا۔ "خریدار کی خواہش ہے کہ اسے ایک ہفتے بعد کوٹھی خالی ملے۔ بیلف کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ندیا بیگم سے اقرار نامے پر دستخط لے لئے جائیں کہ وہ ایک ہفتے بعد کوٹھی خالی کر دیں گی۔"

ایک شخص نے دیر تک کال بیل بجائی اور جب کوئی باہر نہ آیا تو بیلف اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹا گیٹ کھلا ہی تھا۔ صرف گیٹ ہی نہیں، کوٹھی کے تمام دروازے چوپٹ کھلے تھے گویا مکین کو کوئی اندیشہ یا فکر نہ ہو کہ کوئی اس کا کچھ اٹھا کر لے جائے گا۔

بیلف کے چاروں افراد کے ساتھ کئی دوسرے متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگ بھی اندر آ گئے تھے۔ مختلف کمروں میں جھانکتے ہوئے وہ آخر کار ندیا بیگم کی تلاش میں خواب گاہ تک جا پہنچے۔ خواب گاہ کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ اور ندیا بیگم سینے تک کمبل لئے آرام سے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔

ایک شخص نے کھنکار کر بہ آواز بلند کہا۔ "ندیا بیگم! اٹھئے ... کاغذات پر دستخط کر دیجئے۔"

کئی بار پکارنے کے باوجود جب ندیا بیگم نے جنبش نہ کی تو ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے ہلا ہلا کر دیکھا اور خوفزدہ سی آواز میں اعلان کیا۔ "یہ خاتون تو مر چکی ہیں۔"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے گہرا سکوت چھا گیا۔ پھر ان کی نظر قریبی میز پر رکھی ہوئی ایک نئی شیشی پر پڑی۔ وہ خواب آور گولیوں کی شیشی تھی اور بالکل خالی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ندیا بیگم کے سرہانے بیڈ کے تختے پر ایک طوطا بیٹھا تھا جو اتنے لوگوں کو کمرے میں آتے دیکھ کر اڑ کر دروازے پر آن بیٹھا تھا۔

جب اس شخص نے اعلان کیا: "یہ خاتون تو مرچکی ہیں ..." تو طوطے کے حلق سے بے معنی سی آوازیں نکلیں جیسے کوئی آہ و زاری کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن صحیح طرح آوازیں نکالنے پر قادر نہ ہو۔ پھر انہی آوازوں کے درمیان وہ کرخت مگر صاف آواز میں بولا۔ "خدا حافظ بی بی جی ...! خدا حافظ بی بی جی ...!"

چند لمحے وہ انہی الفاظ کی گردان کرتا رہا پھر بڑے المناک سے انداز میں ٹیں ٹیں کرتا بیکراں فضاؤں میں اڑ گیا۔

لوگ دم بخود کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا!

☆☆☆